DUE DATE

Cl. No. ________________ *Acc. No.* 124012

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

~~Zerox A~~	~~28 / 13.7.97~~		

48-

جنوری 1963

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

امیرِ جامعہ ڈاکٹر عبدالمجید خواجہ مرحوم



جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۴	بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ مرحوم

عبداللطیف اعظمی

امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب کے انتقال کی منحوس خبر ۲ دسمبر کو موصول ہوئی، اسی وقت جامعہ کے تمام ادارے بند ہوگئے اور ہر طرف رنج وغم کی فضا چھاگئی۔

خواجہ صاحب کا جامعہ سے تعلق روز اول سے رہا ہے، مشکل اوقات میں اس کو ہمیشہ اور ہر طرح کا سہارا دیا اور خون دل سے اس کی آبیاری کی۔ اگرچہ جامعہ کے بانیوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا، مگر ان کی عنایات بانیوں سے کم نہیں ہیں۔ مرحوم دوسرے شیخ الجامعہ تھے، جن کا مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ۲۹ اپریل ۱۹۲۱ء کو انتخاب ہوا اور پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ کو سیاست کی ڈگر سے ہٹا کر تعلیم کی شاہراہ پر ڈالا۔ ان کے دور میں نازک سے نازک وقت آیا، مگر ہراساں اور مایوس ہوکر اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور اس وقت تک جامعہ کو کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے دوساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب جامعہ نہیں آگئے۔ ۵ مارچ ۱۹۲۶ء کو ڈاکٹر ذاکر صاحب شیخ الجامعہ منتخب ہوئے، تو خواجہ صاحب کو جامعہ کی طرف سے اطمینان ہوگیا کہ اب جامعہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے، جو اس کو کبھی بند ہونے نہیں دیں گے۔ خواجہ صاحب اکثر فخر اور غرور کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میں جامعہ کو ایسے جاں نثار خدمت گذاروں کے ہاتھوں میں دے کر الگ ہوا، جو جامعہ کو بہتر طور پر چلا سکتے تھے اور جو تعلیم کی خدمت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے۔ زمانے نے ثابت کردیا کہ خواجہ صاحب کا خیال کس قدر صحیح تھا۔

خواجہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کی مجھے عزت نصیب ہوئی ہے کچھ عرصہ ہوا جامعہ کے خلاف کچھ خود غرض پسندوں نے مختلف اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ یہ لوگ خواجہ صاحب سے ملتے ان کو

خط لکھتے اور طرح طرح کی باتیں پہنچاتے۔ خواجہ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ جامعہ سے کوئی شخص ہر ہفتہ ان کے یہاں جایا کرے، تاکہ وہ جامعہ کے صحیح حالات سے واقف ہو سکیں اور جامعہ کے متعلق ان کو جو خطوط موصول ہوتے ہیں، ان کے جوابات لکھوا سکیں۔ یہ خدمت میرے سپرد ہوئی، ایک عرصے تک میں ان کی خدمت میں پابندی سے جاتا رہا۔ ان مواقع پر مجھے ان کی خلوت و جلوت سے آگاہی ہوئی، ان کے رجحانات کو سمجھنے اور ان کے خیالات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں جامعہ سے بے انتہا محبت اور خلوص ہے۔ وہ مولانا محمد علی مرحوم سے اس لئے خفا تھے کہ وہ جامعہ کی انفرادیت کو مانتے نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ حالات سازگار ہوں تو مسلم یونیورسٹی میں اسے مدغم کر دیا جائے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ جامعہ اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور مسائل میں فرق کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اخبارات کو ایک بیان دیا، جس میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مذہبیت پر سختی سے نکتہ چینی کی۔ ایک صاحب نے اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں جامعہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھ سے جو خط لکھوایا تھا، اس میں جامعہ کی پوری حمایت اور مدافعت کی تھی، میں سنتا آیا تھا کہ وہ اپنی رایوں میں انتہائی بے لاگ اور بیباک ہیں۔ ان ملاقاتوں میں اکثر اس کے مشاہدے کا موقع ملا۔ باوجود اس کے کہ وہ کٹر نیشنلسٹ اور پکے کانگریسی تھے، مگر میں نے دیکھا ہے کہ کانگریسی رہنماؤں کی موجودگی میں کانگریس کے کاموں اور حکومت کی پالیسی پر سختی سے نکتہ چینی کرتے، اسی طرح وہ مذہبی افکار کے سخت حامی تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ "ایمان کے مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ تھے" مگر جماعت اسلامی کے ہمدردوں اور حامیوں کے سامنے بعض ایسے عقائد اور مذہبی رسوم پر جنھیں بہت سے لوگ اسلامی سمجھتے ہیں سخت اعتراض کرتے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ ان کی قومی خدمات کی صحیح قدر نہیں کی گئی، مگر پھر بھی قومی کاموں میں ہر قسم کی خدمت کے لئے پیش پیش ہوتے۔

خواجہ صاحب ان چند لوگوں میں ہیں جو لڑ بھڑ کر جامعہ کو علی گڑھ سے دلی لائے۔ وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ دلی لے جانے کی کیسے کیسے اور کس کس طرح لوگوں نے مخالفت کی، میں نے کن کن مشکلات میں اور کس کس طرح جامعہ کا تمام اسباب دلی پہنچایا اور وہاں کی بے سروسامانی میں ایک ایک چیز کی کس کس

یقین سے حفاظت کی۔ دلی آنے کے بعد صحیح معنی میں جامعہ کا تعلیمی دور شروع ہوا اور حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ صاحب کی مشترکہ کوششوں سے جامعہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اس پہلی حیثیت کو بڑے دلکش انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"..... مجھے یاد ہے جب علی گڑھ میں، کبھی تصدق مرحوم کے گھر میں، کبھی خواجہ کی کوٹھی میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے یہ تینوں بانی اور معمار جمع ہوتے تھے۔ محمد علی کا مجاہدانہ جوش صد کرتا تھا کہ نہیں جامعہ کو تو قومی تحریک کے لئے رضاکاروں کے تیار کرنے کا ایک مرکز بنایا جائے اور اجمل خاں اور انصاری کہتے تھے کہ تعلیم کے قدیم سرکاری مسلک سے یہ انحراف جس نے جامعہ کی صورت اختیار کی ہے مستقل اور پائدار ہونا چاہیے۔ کیا کیا مباحثے اور فریقین کے استدلال کی کیا کیا کشمکش ان ہفتوں اور مہینوں میں جاری رہی۔ بالآخر مسلم نوجوانوں کی ایک نئی نسل کا یہ سانچہ تیار ہوا اور پہلے ہی دن سے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب نے اس کشتی کے پتوار اپنے ہاتھوں میں لئے۔ کاغذ کی یہ کشتی ـــــ ارادوں اور تمناؤں کی یہ ناؤ جو اس زمانے کے طوفانی سمندر میں ڈالی گئی ـــــ رفتہ رفتہ لکڑی اور لوہے کی کشتی بن گئی، اس کے ٹوٹے ہوئے پتواروں اور بادبانوں کے بجائے رفتہ رفتہ نئے بادبان اور نئے پتوار اس ناؤ کو میسر آئے اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی کشاکش سے نکل کر بالآخر نوجوان ملاحوں کا قافلہ ایک ایسے بندرگاہ تک پہنچ گیا، جہاں سے اب ہر سال مسلمانوں کی ایک نئی نسل علم و عمل کا پیام لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل رہی ہے۔"

خواجہ صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں دلچسپی لی، مگر ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد ۲۳ مئی ۳۶ء کو وہ امیر جامعہ منتخب ہوئے تو جامعہ کے معاملات سے بڑی حد تک بے تعلق رہے، انھوں نے یہاں کے کام کرنے والوں پر تمام تر بھروسہ کیا اور صرف خاص خاص اور اہم مواقع پر اپنے مشوروں سے نوازتے اور ضرورت ہوتی تو اپنی بے لوث خدمات پیش فرما دیتے مگر آخری دور میں انھیں بہت اصرار تھا کہ ان کی ضعیفی اور صحت کی خرابی کے پیش نظر انھیں امیر جامعہ کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے۔ ۱۹۵۳ء میں جب ان کی مدت کار ختم ہوئی تو انھوں نے معتمد انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کو لکھ کر بھیجا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو امیر جامعہ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو شیخ الجامعہ منتخب کر لیا

جاتے۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ جا چکے تھے۔ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اصرار کر کے انھیں امیر جامعہ رہنے پر راضی کر لیا، چنانچہ وہ حسب سابق امیر جامعہ منتخب ہوئے اور پروفیسر مجیب صاحب شیخ الجامعہ۔ نومبر ۶۰ء میں جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا، تو خواجہ صاحب نے جلسہ خاص میں اعلان فرمایا کہ انھوں نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، اب کسی اور کو امیر جامعہ منتخب کر لینا چاہیئے۔ مگر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور جامعہ کے دوسرے بزرگوں نے ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ جامعہ کو جلد ہی یونیورسٹی کا درجہ ملنے والا ہے۔ انھیں بڑی خوشی ہوگی، اگر خواجہ صاحب کی سرپرستی میں جامعہ کو یہ اعزاز حاصل ہو۔ اگرچہ ان کا اصرار باقی رہا، مگر خدا کو منظور تھا کہ ان ہی کے دور میں جامعہ کو یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہو اور جامعہ سے ۱۹۲۱ء میں ان کا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ آخر دم تک باقی رہا۔

ابھی تک میں نے خواجہ صاحب کی زندگی کا صرف ایک رخ پیش کیا ہے جس کا تعلق جامعہ سے ہے، مگر قومی اور علمی خدمات بھی ان کی کچھ کم نہیں ہیں۔ جامعہ میں مرحوم کی یاد میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کی قومی خدمات کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا تھا۔ موصوف نے خواجہ صاحب کی خدمات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "خواجہ صاحب پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ تھے، پنڈت جی کی طرح خواجہ صاحب بھی ایسے باپ کے بیٹے تھے، جنھوں نے بڑی دولت چھوڑی تھی۔ خواجہ صاحب نے اپنی یہ دولت آزادی پر نچھاور کر دی، مسلم لیگ کا اس زمانے میں مسلمانوں پر جادو چل گیا تھا، خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو سمجھتے تھے کہ اس سے ملک کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا اور ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہوگی، اس لئے وہ تقسیم کی مخالفت کرتے تھے، خواجہ صاحب نے مسلم مجلس قائم کی مسلمانوں کے بہت سے لیڈر مسلم لیگ کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر احتیاط کے ساتھ، لیکن خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو احتیاط کو جانتے ہی نہیں، بے دھڑک اور بے لاگ کہتے تھے، ان کی تنقید وں میں جوش بعد غصہ نہیں

ہوتا تھا، مگر بے لاگ ہوتی تھیں۔" آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ خواجہ صاحب کی خدمات میں جو زندہ رہیں گی، ان میں جامعہ ملیہ ہے، جو ان کے خلوص اور ایثار کی ایک جیتی جاگتی زندہ مثال ہے۔"

خواجہ صاحب کے انتقال پر اخبارات میں جو تعزیتی اداریے لکھے گئے ہیں، ان میں مرحوم کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے اور ان کی زندگی کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اس لئے ذیل میں ان کے اہم حصے پیش کئے جاتے ہیں:۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان کے حالات زندگی کے متعلق لکھتے ہیں "علی گڑھ سے اخلاص ترکے میں پایا تھا، ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتدا تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ برابر کے سہیم و شریک تھے۔ علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے، کیمبرج کو بی اے کیا، لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے، واپسی پر بیرسٹی پہلے پٹنہ میں شروع کی، پھر علی گڑھ میں اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں۔ آخر میں سالہا سال سے پھر علی گڑھ آگئے ہیں اور سارا وقت قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ اخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے، قومی اور ملی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہماک صحت سخت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔" روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) نے لکھا ہے کہ "خواجہ صاحب بہت پکے مسلمان تھے اور اتنے ہی پکے قوم پرور بھی تھے۔ وہ اس زمانے کی بہت سی اصلاحوں اور آزادیوں کے خلاف تھے اور پرانی روایات اور اقدار کے زبردست حامی تھے۔ مذہبی پابندیوں کی وہ قدر کرتے تھے اور نئی نسل کو اسی راہ پر تربیت دینا چاہتے تھے۔" ہفتہ وار ندائے ملت (لکھنؤ) اپنی ۱۵ دسمبر کی اشاعت میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتا ہے "...... تحریک خلافت کے علاوہ جنگ بلقان وطرابلس میں ترکوں کی حمایت کی تحریک اور آزادی کی جملہ تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے، جیل بھی گئے اور دوسری قربانیوں کے میدان میں بھی آگے آگے رہے، خلافت کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، ایک زمانے میں تو کانگریس کے سکریٹری بھی رہے ہیں۔ آپ کی کوٹھی سمیع منزل ہمیشہ سیاسی اور علمی و ادبی جلسوں کا مرکز رہی ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۷ برس تھی۔"

آزادی کی قیمت

پروفیسر محمد مجیب

انسان کی ان تمام صفات کو دیکھا جائے جن کے یکجا ہونے سے اس کی طبیعت اور شخصیت بنتی ہے تو اس کا مقام صرف اس دنیا میں نہیں ہے بلکہ پاتال سے لے کر عرش تک پھیلا ہوا ہے، مگر انسان اپنے میدان کو محدود نہ کرے، خون کی گرمی کو زندگی کی گرمی نہ مان لے تو اس کی اپنی طبیعت بجلی بن کر سب کچھ جلا کر خاک کر دے گی۔ اسی وجہ سے اس کے حیوانی عنصر کو اس کے روحانی عنصر کا، اس کے جذبات کی تڑپ کو اخلاق کا، اس کے عمل کو عام انسانی افادیت کا پابند کیا گیا ہے، اس کی زندگی قاعدے قانون اور رسم و رواج کے مطابق بسر ہوتی ہے اور اسے اپنی جانچ کرتے رہنے اور صحیح راستے پر چلنے کی ہدایت کی جاتی رہی ہے۔ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانے میں انسانی جماعتیں اپنی تنظیم کرتی رہی ہیں، اس تنظیم کی بنیاد انھوں نے ایسے اصولوں اور ایسی قدروں پر رکھی ہے جو انھیں سب سے اعلیٰ معلوم ہوئیں اور انھوں نے آزادی کا ایک مطلب یہ لیا ہے کہ مخالف جماعتوں سے اپنی جماعت کو محفوظ رکھیں اور دوسرا مطلب یہ لیا ہے کہ جماعت کے افراد کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور بے جا دباؤ ڈالنے سے روکیں۔ گویا اب انسان کی انسانیت کا پیمانہ آزادی کا وہ تصور ہے، جس کی بدولت جماعتیں اپنے وجود کو قائم رکھتی ہیں اور افراد اپنے اختیارات اور فرائض طے کرتے ہیں۔

آزادی کی خواہش انسان کی طبیعت میں ہے، مگر اس خواہش کے علاوہ وہ اور بہت سی باتوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اسے کھانے پہننے کو چاہیئے، روزگار چاہیئے، آل اولاد چاہیئے کہ اس کا نام باقی رہے، اس کا اطمینان چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی بغیر صدموں اور حادثوں

سے گذار سکے گا۔ یہ مزدورتیں افراد اور سماج کے اندر آزادی کے دشمن پیدا کرتی رہتی ہیں۔ قدیم مصریوں نے یہ سمجھ کر کہ ان کی فلاح و بہبود کا مدار فرعون پر ہے، بادشاہ پرستی اختیار کی، قدیم یونانیوں کو یقین تھا کہ غلام رکھنا ضروری ہے تاکہ آزاد شہری حکومت کے کاموں کے لئے پورا وقت دے سکیں، قدیم رومیوں میں، جب تک کہ ان کی حکومت جمہوری تھی، بڑے جاں باز شہری پیدا ہوتے رہے مگر دولت اور ملک کی ہوس نے ان میں شہنشاہی قائم کر دی۔ ایشیائی ملکوں میں فساد سے بچنے کی خواہش نے بادشاہوں کی طاقت کو بہت بڑھا دیا۔ جدید زمانے میں یورپی ملکوں نے بیجا قوم پرستی کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھایا اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھا دیا کہ اگر ان کی قوم دوسروں سے لڑ کر انھیں نیچا دکھا سکی تو اس کی اپنی آزادی اور آبرو قائم نہ رہ سکے گی۔ برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ ریاستیں آزاد جمہوری حکومتوں کی نمایاں مثالیں ہیں، لیکن ان کی صنعتی اور معاشی تنظیم پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں سماج کے ایک طبقے کے مفاد کی خاطر جمہور کی حق تلفی کی جاتی ہے۔ روس میں ۱۹۱۷ء میں ایک انقلابی حکومت قائم ہوئی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہے اور ایسی ہی قومی انقلابی حکومت بڑی جدوجہد اور خوں ریزی کے بعد ۱۹۴۹ء میں چین میں قائم ہوئی۔ دونوں ملکوں میں دراصل کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ہے، جس کا اپنا فلسفۂ حیات اور اپنے معاشی اور سیاسی منصوبے ہیں۔ ان سے مزدوروں اور کسانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے، اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ روس اور چین میں افراد کی آزادی حکومت کے اختیار میں غائب ہو گئی ہے۔

تاریخ میں اس کی اتنی مثالیں ملتی ہیں کہ بادشاہوں اور قوموں نے محض اپنی طاقت کے بل پر دوسرے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور ان کی آبادی کو اپنا محکوم بنا لیا کہ اب سیاسی خود مختاری ایک بنیادی قدر بن گئی ہے اور جب کبھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ قوم کی آزادی کو برقرار رکھا جائے یا افراد کی آزادی کو، تو ہمیشہ قوم کی آزادی اور خود مختاری کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ اصولاً صحیح ہے، اس لئے کہ افراد کے حقوق کا مدار اس نظام پر یعنی اس قوم اور قومی حکومت پر ہوتا ہے جو انھیں

دستور اور قانون کے ذریعے یہ حقوق دیتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ قومی آزادی پر مال اور جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں اور ہر اچھی مثال دوسروں کی ہمت کو بڑھاتی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ قومیں اپنی آزادی کو محفوظ اور اپنی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے صرف اپنی فوجی طاقت پر بھروسا کرنے لگیں، فوج کی تعداد بڑھانے اور نئے نئے جنگی آلات تیار کرنے کی فکر میں لگ گئیں اور سائنس کی ترقی کی بدولت ایٹم بم بنے جو پل بھر میں بیسیوں شہر برباد اور لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ اب جنگ نہ ہو تب بھی جنگ کا خوف طاری رہتا ہے اور ایسی حالت میں سب سے طاقت ور قوموں کی آزادی بھی گرفتاری کی شکل ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس فضا میں جو کسی اعتبار سے بھی امن اور عافیت کے لئے سازگار نہ تھی آزاد ہندوستان نے بڑی اخلاقی ہمت سے کام لے کر ایک نئی راہ اختیار کی، اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے، اپنی جنگی طاقت پر نہیں بلکہ اس امن پسندی پر بھروسا کیا جو مہذب انسانوں میں ہونا چاہیئے اور ہوتی بھی ہے اور دوسری طرف شہریوں کی آزادی کا ضامن صرف دستور اور قانون اور عدالت کو نہیں بنایا بلکہ خود شہریوں کو، آزاد ہندوستان کا ایک نصب العین یہ رہا ہے کہ بین اقوامی معاملات میں خیر خواہی کے جذبے کو ابھارے اور اگر اختلافات پیدا ہوں تو انھیں غیر جانب دار قوموں کی مدد سے گفتگو کے ذریعے دور کرے اور دوسرا نصب العین یہ رہا ہے کہ رفتہ رفتہ ملک کے عوام کو ملک کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار بنائے، حکومت کا کام حکم دینا نہ ہے بلکہ مشورہ دینا افراد کی رہنمائی کرنا، یہاں تک کہ وہ جنتا کی مرضی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے۔ ہمارے زمانے میں آزادی کا اس سے اعلیٰ اور اس سے زیادہ ہمہ گیر تصور پیش نہیں کیا گیا ہے اور اس سے عمل میں لایا جا سکا تو یہ انسانی تاریخ کا ایک انقلاب انگیز سیاسی اور انتظامی کارنامہ ہوگا۔

اب ہمیں سوچنا چاہیئے کہ اگر دوسرے ملکوں کے شہریوں نے قومی آزادی کے ایسے تصور کے لئے جو در اصل محدود تھا بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں تو ہمیں آزادی کے اپنے اعلیٰ تصور

کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ دوسروں نے اس تصور کی بہت قدر کی ہے۔ امریکہ کی متحدہ ریاستوں، برطانیہ، کومن ویلتھ کے ملکوں، جرمنی، روس اور مشرقی اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں نے ہمارے پنج سالہ منصوبوں کو کامیاب کرنے میں مختلف طریقوں سے مدد پہنچائی ہے اگرچہ ہم برابر یہ کہتے رہے کہ ہم امن پسندی کا طریقہ نہیں چھوڑیں گے اور جمہوری یا کمیونسٹ ملکوں کے ساتھ اس طرح نہ مل جائیں گے کہ کوئی ہمیں اپنا مخالف سمجھنے لگے۔ ہم نے ایک سوشلسٹ ویلفیر اسٹیٹ کے نقشے کو سامنے رکھ کر بغیر جبر سے کام لئے صنعتی اور کاروباری نظام میں بڑی بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور سرمایہ دار اور مزدور کا جھگڑا اٹھائے بغیر دونوں کو ترقی کے کاموں میں شریک کیا ہے اور اس طرح جمہوری اور کمیونسٹ فلسفے کی خوبیوں کو لے کر انہیں ہم آہنگ کیا ہے۔ جو لوگ آزاد مقابلہ کے حامی ہیں، وہ ہمارے طریقے کو پسند نہیں کرتے مگر اسے اپنے لئے خطرہ بھی نہیں مانتے۔ چین جو اچانک ہمارا مخالف بن گیا ہے اور ہمارے ساتھ لڑائی چھیڑ دی، اس کا ظاہری سبب تو یہ ہے کہ وہ نیفا اور لداخ کے بعض حصوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اس کا اصل مقصد ہمارے صنعتی اور سیاسی منصوبوں اور امن پسندی کے ذریعہ تمام ترقی یافتہ ملکوں سے امداد حاصل کرنے کے عظیم الشان تجربے کو ناکامیاب کرنا چاہتا ہو۔ ہم نے صرف ایک ایسے تجربے میں کئی منزلیں طے نہیں کرلی ہیں جو یہ ثابت کرتا ہے کہ معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے ظلم اور جبر کا جو طریقہ چین میں اختیار کیا گیا ہے وہ غلط ہے، بلکہ ہم نے رفتہ رفتہ اپنی کمیونسٹ پارٹی کی اکثریت کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ جبر اور تشدد کو چھوڑ کر اپنی مخصوص پالیسی پر عمل کرنے کے لئے دستور اور قانون کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کو اختیار کرے۔ اس میں چین کی بڑی شکست ہے، جس کا بدلہ وہ لینا چاہتا ہوگا۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اب ہماری جد وجہد کے دو میدان ہیں، ایک تو وہ جس میں سنگینوں اور توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے مقابلہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ کہ جس

میں انسان کی تمام صلاحیتیں جانچی جاتی ہیں، ایک میدان میں فائدے اور نقصان کا حساب بہت جلد لگایا جا سکتا ہے، دوسرے میں فائدے اور نقصان دونوں کی اتنی مختلف صورتیں ہیں کہ حساب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو حق کی خدمت کرنا چاہتا ہو اسے فائدے نقصان کے پھیر سے نکل جانا چاہیئے۔ ہم اس پھیر سے نکل سکے تو ہمارا اٹھنا بیٹھنا، جاگنا اور سونا، ہماری محنت اور ہماری آرزوئیں سب ایک ہی قدر سے وابستہ ہو جائیں گی، ہماری صلاحیتیں ہماری مشعل ہوں گی، ہمارا ضمیر ہماری رہنمائی کرے گا اور ہم آزادی کی اس منزل پر پہنچ جائیں گے جو انسان کا اصل مقام ہے۔

(یہ تقریر ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی)

عہدِ قاچار میں فارسی شاعری کا احیاء

جناب آفتاب اختر

احیاء سے ہماری مراد کسی خاص طرز کو جسے ترک کر دیا گیا ہو دوبارہ اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت اُسی وقت پیش آتی ہے جب کوئی مخصوص رنگ ختم ہوگیا ہو یا ختم ہونے کی طرف تیزی سے مائل ہو۔ احیا ایسی ہی کسی زوال شدہ حالت میں ممکن ہے۔

قاچاری عہد میں احیاء کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اور طرزِ قدیم کے ختم ہوجانے کے کیا وجوہ تھے۔ اس کے صحیح اسباب کی دریافت کے لئے ایران میں فارسی شاعری کی ابتدا اور قاچاری عہد تک اس کے ارتقاء کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

ایران میں اسلام کے فروغ کے بعد سامانی عہد میں شاعری کا چرچا ہوا۔ شبلی کا خیال ہے کہ ایران میں فارسی شاعری کے باقاعدہ آغاز کا سہرا رودکی کے سر بندھتا ہے جو عہد سامانی کا مستند شاعر تھا۔ اسی زمانہ میں دقیقی نے اپنی شاعری کے ذریعے رزمیہ کی ابتدا کی تھی اور ایک ہزار اشعار فردوسی کے شاہنامہ کے لئے شمع راہ کے طور پر چھوڑ گیا تھا۔ اس عہد کے ادب کی خصوصیات میں صفائی، سلاست اور انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس دور میں شاعری کے مضامین اسلاف کے کارناموں دلی جذبات کے اظہار اور مناظر قدرت کی عکاسی پر مشتمل ہوتے تھے۔ رودکی نے منظر کشی اور طرزِ ادا کی سلاست کو پُرکاری اور صناعی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ دقیقی نے اپنی شاعری کے ذریعے جوش بیان بے ساختگی اور برجستگی سے ایرانی شعراءُ کو روشناس کرادیا تھا اور بڑی حد تک شاعری کی زبان غیر ملکی الفاظ سے اتنی پاک ہوگئی تھی کہ اُس پر موجودہ دور کی شاعری کا شبہ ہوتا ہے۔ ان زمانے کے قصیدے تصنع بناوٹ اور غلو سے

پاک تھے۔ شعراء کی تخیل میں الجھاؤ کم اور خیالات میں ندرت وصفائی زیادہ تھی۔ شاعری میں استعمال کی جانے والی تشبیہات صاف سادہ سہل اور نیچرل تھیں۔ جب ہم اس دور کی شاعری پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شعراء نے اس قدر ترقی کرلی تھی کہ اس دور کی شاعری یورپ کی جدید زبانوں کی شاعری کی صف میں رکھی جاسکتی ہے۔

عہد غزنویہ میں قصیدے نے بہت ترقی کی تھی اور اس دور میں عنصری جیسے باکمال شعراء سے تعارف حاصل ہوتا ہے جس کی شاعری میں اعلیٰ مضامین صحیح جذبات اور پرزور مدح موجود ہے۔ عنصری اور منوچہری کے قصاید میں واقعہ نگاری اور قدرتی مناظر کی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں انھوں نے صنایع وبدایع کا استعمال بہت احتیاط سے کیا ہے۔ فرخی نے محمود کی وفات پر مرثیہ لکھ کر مرثیہ نگاری کی طرز میں جدید اضافہ کیا تھا۔ اس دور میں زبان کی ترقی کی طرف بھی توجہ کی گئی تھی۔ اس دور کی شاعری میں خیالات کی صفائی سادگی طرز ادا میں برجستگی اور اعتماد پایا جاتا ہے خیالات کی ندرت اور بلند پردازی بھی اس دور کی نمایاں خصوصیت ہے۔ فردوسی نے اپنی شاعری کے سادہ طرز سے صنف شاعری میں نیا رنگ۔ نیا جوش اور نیا ولولہ بھی بھر دیا تھا۔

سلجوقیوں کے زمانہ میں تصنع مبالغہ پیچ در پیچ خیالات مشکل اور بلند آہنگ الفاظ کا استعمال بعید از قیاس استعارات کی کثرت متاع شاعری ہوکر رہ گئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی شاعری نے ڈیڑھ سو سال کی اس قلیل مدت میں نیچر کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ شاعری میں جذبات کی سادگی اور طرز ادا کی بے ساختگی اور برجستگی تصنع اور آورد میں تبدیل ہوگئی تھی۔ آخر دور سلجوقیہ میں صوفیانہ شاعری کا بے حد عروج ہوا۔ حکیم سنائی نے اس صنف میں بہت اضافہ کیا۔ قصاید کو اگرچہ کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی کیوں کہ خوشامد اور مبالغہ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ قصیدے نہ تو ہیئت کے لحاظ سے تبدیل ہوئے اور نہ تخیل و مواد کے لحاظ سے۔ لیکن اس زمانہ میں فارسی شاعری کے مروجہ سبک (طرز) میں تبدیلی شروع ہوگئی۔ عربی کے مغلق الفاظ عربی ترکیبیں اور علمی و مذہبی اصطلاحیں نظم میں آہستہ آہستہ جگہ پانے لگیں اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور شعراء انوری و خاقانی تک

پہنچتے پہنچتے اس کے آثار و اثرات کافی نمایاں ہو گئے۔ اس دور کے بعض شعرا نے مشکل گوئی قافیہ پیمائی اور باریک بینی شروع کر دی اور پڑھنے والے کو حیران و ششدر کرنے کے لئے اپنی شاعری میں معمّے اور دقیق علمی مسائل شامل کرنے لگے۔

اس کے بعد مغل اور تیموری دور میں جو عام تباہی اور قتل و غارت گری ہوئی۔ انسانیت کو تہہ و بالا کرنے کے جو کھیل کھیلے گئے۔ انھوں نے شمالی ایران اور خاص کر خراسان کے علمی و ادبی آثار کو فنا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں پر قنوطیت کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ ان کے شجاعانہ جذبات فنا ہو گئے اور رزمیہ شاعری کی موت واقع ہو گئی۔ ہر طرف تصوف ہی تصوف نظر آنے لگا۔ عشق مجازی عشق حقیقی بن گیا۔ قصیدہ گوئی برائے نام رہ گئی۔ علمی و فنی اصطلاحات کی کثرت لفظی بازیگری اور مبالغہ کا دور دورہ ہو گیا۔ اس دور میں فارسی سبک بگڑنا شروع ہوا اور خاص کر مشکل ترکیبوں ادق استعاروں اور عربی جملوں کی بھرمار شروع ہو گئی۔ استعاروں اور تشبیہوں میں ابہام چھوٹی چھوٹی باتوں میں مبالغہ پیدا ہو گیا۔ شاعر ممدوح یا معشوق کی حد سے زیادہ تعریف کرنے لگے۔ بے جا خوشامد اور چاپلوسی نے ان کی خودداری اور صلاحیتوں کو سلب کر لیا۔

مغل دور کے اس غیر فطری سبک کی صفوی عہد میں کافی ترقی ہوئی۔ عجیب و غریب ترکیبیں، غیر مانوس الفاظ مسلسل صنعتیں، نکتہ گوئی، مضمون آفرینی پیچیدہ اور باریک معانی پیدا کرنے کا عام رواج شروع ہو گیا۔ اس عہد میں حکمراں طبقے کا مذہبی عروج صوفیوں پر زوال لے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دور کی شاعری انتہائی پستی میں جا پڑی تھی اور اس کا انحطاط عہد قاچار سے قبل ہی اپنی تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اس حقیقت کا تقریباً سبھی نے اعتراف کیا ہے۔ مجمع الفصحا کے مصنّف رضا قلی خاں ہدایت نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے مرزا محمد عبدالوہاب قزوینی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شبہ فارسی شاعری دور صفویہ میں انتہائی پستی میں جا گری تھی۔ ڈاکٹر آیتے نے بھی اپنی کتاب "فارسی شاعری" میں اس کا

اظہار کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے بھی شعر و سخن کے اس زوال پر افسوس کیا ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے آخر میں ایرانی ادبیات نے پھر ایک کروٹ لی۔ مغلیہ اور تیموری دور کے پُر تکلف طرز پر زوال آنے لگا خاص طور سے صفوی دور کی مضمون آفرینی، نکتہ سنجی، جملہ بندی کے رواج کے بعد قدما کے اسلوب سے رجوع کرنے کی نئی تحریک ایران میں شروع ہوئی۔ اس کا بڑا مرکز اصفہان تھا۔ شعراء نے دور کی منوچہری، فرخی، عنصری، فردوسی جیسے متقدمین کا اتباع شروع کر دیا۔ پیچیدہ مضامین کی تکرار اور پُر تکلف عبارتیں لکھنے کا رواج آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ شاعر سیدھی سادی سلیس زبان لکھنے لگے۔ دور از کار تشبیہیں استعارے اور مضامین نظم سے خارج کئے گئے۔ ڈراما کی طرز سخن اور ان کے مضامین کا احیاء شروع ہوا۔ شاعری کے خد و خال تبدیل ہو گئے۔ اس کے دو سبب تھے ایک مغربی تہذیب و تمدن کا ایرانی شعراء پر اثر دوسرے استبدادی (قاچاری) حکومت سے اہل ایران کی بیزاری ان جذبات و خیالات نے ان پر براہِ راست اثر کیا اور جذبۂ حریت کی بیداری شروع ہو گئی۔ دراصل قاچاری عہد کشمکش کا دور ہے جس میں انقلاب کے جراثیم تیزی سے نشو و نما پا رہے تھے۔ اور شعراء کے دلوں میں مغربی اثرات کے ماتحت تصنع اور لفظی صناعی اور معاملہ بندی سے نفرت بڑھ رہی تھی۔ اس دور کے شعراء دورِ متوسطین کے شعراء کی پھیلائی ہوئی مشکل پسندی اور دقت پسندی جیسی بیماری سے محفوظ رہتے ہوئے دورِ متقدمین کی روش پر اس لئے چلتے ہیں کہ یہی وہ طرز ہے جس کو اپنا کر بڑی سادگی سے اثر انگیز انداز میں دلی جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

قاچاری دور کے شعراء کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ اس لئے وہ طرز قدیم پر کچھ عصری خوبیوں کے اضافہ کے ساتھ چلنے لگے۔ اس احیاء کی کوشش نے ان پر اس درجہ غلبہ کر لیا کہ لوگ ان کو دورِ قدیم کا نقال سمجھنے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نقال نہیں تھے، بلکہ انھوں نے اس میں بہت سے اہم اضافے بھی کئے تھے۔ جنھیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دورِ احیاء کے اولین علم برداروں میں سید محمد شعلہ اور میر سید علی مشتاق کا شمار ہوتا ہے۔ یہ بہترین غزل گو تھے اور شاعری کا فطری اور سچا ذوق تھا۔ ان کے بعد اس طرح کی طرز کو زندہ کرنے والوں

کی صف میں نشاط اصفہانی، قاآنی، عاشق اصفہانی، سید محمد ہاتف، عمر اصفہانی، صبا کاشانی، وصال شیرازی، یغمائے جندقی، سپہر کاشانی اور طاہرہ قرۃ العین کا شمار ہوتا ہے جن کی شاعری کو محض نقالی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی شاعری عصری تحریکات کا پرتو بھی لیے ہوئے تھی اور واردات قلبی کی آئینہ دار بھی تھی۔ یہ لوگ جو دیکھتے یا جو دل پر گزرتی اس کی فطری تصویر کشی کرتے تھے۔ تصنع لفاظی۔ الجھاؤ اور آورد کا نام نہ تھا۔ جذبات احساس فطری تھے۔ "تخیل کی ان دیکھی دنیا میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح کبھی بھٹکتے نہیں تھے۔ سیاسی ماحول اور ملکی اثرات کی وجہ سے ان کی شاعری میں وطنیت قومیت ایثار اور آزادی کے جذبات کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کے کلام میں جوش روانی برجستگی سلاست زور سادگی صفائی فصاحت شیرینی شوخی درد اور سوز بھی ملتا ہے۔"

بلاشبہ اس دور کے دامن میں عہد قدیم کی تمام خوبیاں موجود تھیں جو اس دور کے شعراء کو راس آئیں اور اس طرح قدیم دور کے سادہ اور صاف سبک کا احیاء ہو سکا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دور مشروطہ کی شاعری کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور انھوں نے ان کے سبک کو زیادہ نکھار کر پیش کرنے کی کوشش کی جس میں وہ زیادہ کامیاب تو نہ ہو سکے لیکن ان کی شاعری ان کے سماج اور اس میں پائی جانے والی کش مکش کی آئینہ دار ضرور بن گئی۔ سیاسی شعور بے انتہا بیدار ہو گیا لیکن شاعری میں شیرینی پہلے جیسی نہ آ سکی۔ البتہ جوش ولولے اور امنگ نے ان کی شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کر دیا۔ مٹھاس کی جگہ گھن گرج پیدا ہو گئی جس نے قاچاریوں کے ظلم و استبداد اور روسیوں اور انگریزوں کے مظالم کے خلاف رجز کا کام دیا۔

"ڈاکٹر بجنوری کے چند خطوط"

جناب نادم سیتاپوری

خطوط نجی ہوں چاہے ادبی! اپنے مذاق اور شعور کے مطابق بہرحال کچھ نہ کچھ جاذبیت رکھتے ہی ہیں۔ لیکن "مشاہیر" کی تحریرات اور مکاتیب اکثر خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ شہرت یا ناموری خواہ کسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتی ہو فطرتاً انسان کی اجنبیت کو اس طرح دور کر دیا کرتی ہے جیسے یہ شخصیت یا کردار نامانوس نہ ہونے کی وجہ سے اپنا ہی ہے۔

غالب تو اردو خطوط نگاری کے ایک نئے اسلوب و انداز کے بانی ہی تسلیم کئے گئے ہیں لیکن ان کے معاصرین اور بعد کے شعراء اور ادیبوں میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی سامنے آچکی ہے جن کے خطوط ادبی حیثیت سے کافی مقبول ہوئے۔ سرسید، شبلی۔ مہدی الافادی۔ حالی، اکبر الہ آبادی۔ امیر مینائی۔ اقبال، غرضیکہ مشاہیر میں شاید ہی کوئی بچا ہو جس کے خطوط نے اردو زبان و ادب میں کسی نہ کسی نہج سے اضافہ نہ کیا ہو، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا نام بھی اس فہرست میں آجاتا لیکن ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ ابھی تک شاید چھپا نہیں۔ اور اگر چھپ چکا ہے تو اتنا کمیاب ہے کہ میں حاصل نہ کر سکا۔ متفرق خطوط ضرور نظر سے گذرے ہیں لیکن ان میں بھی اکثر ذاتی اور نجی! جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے ان کے ادبی خطوط کچھ زیادہ ہوں گے بھی نہیں۔ ان کی ادبی زندگی کی عمر ہی اتنی کم تھی کہ اگر ان کی بلند پایہ تخلیق "محاسن کلام غالب" قبول عام حاصل نہ کر لیتی تو ڈاکٹر بجنوری بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح گمنام رہ جاتے۔

ڈاکٹر بجنوری اپنے پاکیزہ ادبی مذاق اور سنجیدہ شعور انسان تھے کہ اگر انھیں زندگی موقع دیتی تو شاید "غالبیات" کے بہت سے گوشے تشنۂ تکمیل نہ رہ جاتے۔ خوش نصیبی یہ تھی کہ انھیں

زمانۂ قیام بھوپال میں چند ایسے "رفیق کار" بھی مل گئے تھے جو ہر ہر قدم پر ان کے ایک اچھے شریک سفر رہے! "دیوان غالب" کے "نسخہ حمیدیہ" کی اشاعت کے ساتھ مفتی انوارالحق مرحوم کا نام تو "حیات جاودانی" پا گیا لیکن شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کام میں ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ساتھ ان کے ایک ساتھی اور بھی تھے جن کے بلند ادبی شعور میں ڈاکٹر بجنوری مرحوم سے کچھ کم پختگی نہیں تھی۔

ڈاکٹر وارثی مرحوم رہنے والے تو "امروہہ" ضلع مرادآباد کے تھے لیکن بسلسلہ ملازمت بھوپال میں رہ بس گئے تھے! انگریزی ادب و لٹریچر سے انھیں بھی اتنا ہی شغف تھا جتنا خود ڈاکٹر بجنوری مرحوم کو تھا! مرحوم مہدی الافادی کی طرح ان کی لائبریری انگریزی اور اردو کی نئی مطبوعات سے مزین رہتی۔ ڈاکٹر بجنوری نے جب "نسخہ حمیدیہ" کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا تو ڈاکٹر وارثی مرحوم بھی ان کے شریک کار تھے —— اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں دوست آگے پیچھے راہی ملک عدم ہوئے!

ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے یہ خطوط غیر مطبوعہ نہیں ہیں لیکن انھیں چھپے ہوئے تقریباً نصف صدی ضرور گذر چکی ہے اور اس طویل مدت میں انھوں نے ایک ایسی اہمیت حاصل کر لی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ خطوط پہلی اور آخری بار اب سے چالیس سال ادھر "عباس حسین قاری دہلوی" کے ماہنامہ "تمدن" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ قاری صاحب اپنے دور کے مشہور صحافیوں میں تھے۔ مولانا محمد علی کے "ہمدرد" اور سید جالب کے ساتھ "ہمدم" کے ادارۂ تحریر میں بھی شامل رہ چکے تھے۔ "تمدن" کئی برس تک لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ پھر قاری صاحب کے ساتھ دہلی چلا گیا اور غالباً سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۱ء تک شائع ہوتا رہا!

ڈاکٹر بجنوری کے چھ خطوط جون ۱۹۱۹ء کے ماہنامہ "تمدن" (جلد ۸ شمارہ ۱۲) میں شائع کئے گئے ہیں اور ان خطوط پر قاری صاحب مرحوم کا ایک ادارتی نوٹ بھی ہے۔

"آج ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہم میں نہیں ہیں مگر اس قابل فرد قوم کی یاد آج نہیں برسوں تک ہمارے دل میں موجود رہے گی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن جیسی قابلیت کے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں اس لئے ایسے حضرات کے افکار جمیلہ کو جس قدر بھی عزت کے ساتھ محفوظ رکھا جائے وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ زندہ قومیں اسلاف کی یادگار کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ اگر ہمیں اپنی قوم کو عروج کے راستے پر لگانا ہے تو ہمارا یہی فرض ہے کہ ہم اپنے قابل لوگوں کے ایک ایک حرف کو قدر و منزلت کے ساتھ محفوظ رکھیں۔

ذیل میں ہم ڈاکٹر مرحوم کے خطوط کا اقتباس اپنے کرم فرما سے حاصل کرکے درج کرتے ہیں جو مرحوم نے مختلف اوقات میں انھیں لکھے تھے۔ اگر یہ خطوط محض سادے خطوط ہی ہوتے تو بھی کچھ کم قابل قدر نہیں تھے۔ مگر اس میں اہل ذوق کے لئے بہت کچھ سامان درد پنہاں ہے انشاء اللہ آئندہ بھی خطوط کی دوسری قسط شائع کریں گے جو ان خطوط سے زیادہ دلچسپ ہیں آخر میں ہم اپنے "کرم فرما" کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے چشمۂ فیض سے پبلک کو مستفید کر دینے کی اجازت دی جو محض ان کے لئے جاری ہوا تھا"

اس ادارتی نوٹ میں قاری صاحب نے نہ جانے کیوں ان خطوط کے مکتوب الیہ اور "اپنے کرم فرما" کا نام ظاہر کرنے سے گریز کیا ـــــــ حالانکہ سب سے آخری خط (بلا تاریخ) جو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے "برائٹین" سے لکھا تھا اس میں تحریر ہے۔

"میں نے آپ کی اجازت لئے بغیر اس امر کی جرأت بھی کی ہے کہ دیباچہ میں آپ کا شکریہ بدیں الفاظ (ادا) کیا ہے کہ جن احباب نے ہمیشہ اس کام میں میری ہمت افزائی کی ہے اس میں آصف علی صاحب کا بھی حصہ ہے....."

ان سطور سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان خطوط کے مکتوب الیہ بلا شبہ دہلی کی مشہور شخصیت "آصف علی بیرسٹر مرحوم" ہی تھے اور یہ تمام خطوط انھیں کے نام لکھے گئے ہیں جو اس زمانے میں یورپ ہی میں قیام فرما تھے اور ڈاکٹر بجنوری مرحوم سے ان کے اچھے خاصے تعلقات تھے۔

ڈاکٹر بجنوری کے پیش نظر خطوط کی ادبی اور شخصیاتی افادیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان خطوط کے "اسلوب بیان" میں ویسی زندگی نہیں پائی جاتی جو غالب کے ایک "عمیق مطالعہ کار" کے یہاں ہونا چاہیئے۔ ان خطوط میں نہ محض برجستگی روانی اور سلاست زبان کا فقدان ہے بلکہ ان خطوط میں ڈاکٹر بجنوری کے انداز بیان کی وہ "حسن کاری" بھی نہیں ہے جو ان کے یہاں اکثر نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان خطوط کی تاریخی اہمیت اور افادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ خطوط بہر قیمت اردو ادب کی تاریخ کے وہ زریں اوراق ہیں جنھیں محفوظ رہنا ہی چاہیئے۔

(۱)

۲۰ مارچ ۱۲ء

رفیق شفیق وحبیب صدیق!

تسلیم۔ صد تسلیم۔ گذارش ہے۔

شب سیاہ کی زلف کمر رسیدہ ہو چکی ہے مگر قریب کے ایک مکان سے آواز نغمہ آ رہی ہے اور آج غیر معمولی طور پر خواب کا بھی طبیعت پر غلبہ نہیں! اس لئے چند سطریں اور لکھتا ہوں۔

آپ کی تصویر پہنچی ـــــ قدیم مصر بھی افق تواریخ پر ایک عجیب وغریب نقش ہے جس کو وقت بھی محو نہیں کر سکا۔ آپ کے اس فقرہ سے کہ

احرام تاہنوز ایک راز ومعمہ ہیں

میرے دل میں سحریات۔ نجوم۔ کیمیا وغیرہ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انسان میں فوق الفطرت طاقت تھی جو بوجہ تحمل نہ ہوسکنے کے اس سے واپس لے لی گئی۔

صحرائے اعظم میں ضرور کوئی شہر دبا ہے بلکہ شاید آباد ہے۔ بہشت شداد وہیں ہے آواز نغمہ خاموش ہو گئی۔ تحریر بالا اس سرود کے اثر میں لکھی گئی اس لئے لائق معافی ہے۔ آپ نے بارہا مطالعہ فرمایا ہوگا کہ "ابوالہول" ایک معمہ ہر کس وناکس کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ اس معمہ کا جواب "انسان" تھا ـــ آپ کی تصویر گویا اس معمہ کا مرقع ہے۔

ابوالہول بھی موجود ہے جو سراپا استفہام ہے اور آپ بھی! مصر، یونان، روما یہ سب میخانے میں جہاں ساقی زمانہ آتش بہ جام کر چکا ہے ـــــ جدید یورپ بھی ایک میخانہ ہے جس کے ساغر الوان شراب سے پر ہیں۔ اس کے جام بہت سی قوموں کے خون سے لبریز ہیں۔ ساقی زمانہ وہی ہے! اور اہل بزم کے رقص و خندہ پر خود خندہ کناں ہے۔ یہ لوگ آخری دور سے کام آشنا ہو رہے ہیں۔ اب دیکھئے کہ دوسرا میخانہ کہاں قائم ہوتا ہے؟

آپ اپنے مشاغل اور حالات سے بھی اطلاع دیجئے۔

میں بخیریت ہوں

گو وقت اور فاصلہ درمیان میں حائل ہو گیا ہے۔ دوریٔ ابدان انشاء اللہ تعلقات دل و جان کو کم نہ ہونے دے گی۔ ہمیشہ آپ کی اور آپ کے متعلقین کی صحت او رعافیت کے لئے دعا گو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ بحصول عریضہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں گے۔ جویان عافیت۔

بندہ۔ عبدالرحمٰن

(۲)

۱۱ر اگست ۱۳ء

میونش (میونک)

محب و مولائے من۔

باوجود میری تقصیر کوتاہ نویسی کے آپ از راہِ دوستی برابر یاد فرماتے رہے۔ آپ کی وہ عنایت اور میری یہ نالائقی! معافی تک مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس زمانے میں پریشان بھی رہا اور بیمار بھی۔ بہرحال اب تندرست ہوں۔

آپ کے ارسال کردہ مضمون "اعدا" کو حسب ارشاد واپس کرتا ہوں۔ ماشاء اللہ خوب ہی ہے خصوصاً آغاز اور انجام بہت پر زور ہے! "فطرت اشک" اور "نقیب مسرت" اپنے اپنے انداز میں وقار اور ادا میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ چونکہ کم لیاقتی کے باعث انگریزی کلام کی ماہیت کے پلنے سے باوجود کوشش

بے بہرہ رہ جاتا ہوں۔ اُردو کلام کا اور زیادہ تشنہ ہوں اگر کوئی چیز ارقام فرمائی ہو تو روانہ فرمایئے نثر ہو یا نظم! "فرہاد" کو پورا کیوں نہیں فرما لیتے۔ افسوس کہ جن کو تخیل نصیب ہے ان کو صبر نہیں! اور جنھیں ضبط ہے وہ مرغِ خیال کے شہپر کی آواز تک نہیں سن پاتے! اس کی پرواز دیکھنا تو کیا؟

آج دو ہفتہ سے اس شہر میں ہوں سہروردی صاحب بھی ہمراہ ہیں یہاں چند یوم اور قیام ہے پھر لندن کا قصد ہے۔ آپ تو اس مقام کو دیکھ ہی چکے ہوں گے۔ یہاں کے نگار خانے حقیقت میں تعریف سے بالا ہیں: "لوئی ثانی" (LUDWIG II) کی دیوانگی نے اس شہر کو ایک فردوسِ نظر بنا دیا۔ دیوانہ ہونا بھی ایک دادِ الٰہی ہے۔

آپ اغلب اس وقت "اسوتج" (سوئیزرلینڈ) میں ہوں گے۔ کب تک ان اطراف میں رہنے کا قصد ہے۔ کیسا افسوس ہے کہ جب آپ نے "فرائی برگ" تشریف لانے کا قصد فرمایا تو بختِ نارسا نے مجھے وہاں سے یہاں پہنچایا۔

والا نامہ جات تحریر فرماتے رہیئے۔ آپ کی خطاپوشی اور عذرپذیری سے اسی کا متوقع ہوں از حد شوقِ ملاقات ہے۔ احوالِ تازہ سے مطلع کیجیے ـــ امید ہے کہ مزاجِ گرامی بہمہ وجوہ بہ سلامتی ہوگا۔ سہروردی صاحب سلام کہتے ہیں۔

عبدالرحمٰن

(۳)

آکسفورڈ

یکم جنوری ۱۴ء

تسلیم۔ سال تو طلوع ہوئے دیر نہیں۔ آپ کی خدمت میں عریضہ کے ذریعہ حاضر ہو کر اس کو آغاز کرتا ہوں اور شگونِ نیک لیتا ہوں۔

امید ہے کہ آپ کے لئے نیا برس گذشتہ امیدوں کی کامرانی ہمراہ لایا ہوگا اور اپنے تحائف پیش کرنے میں بجائے تاخیر کے عجلت کو کام میں لائے گا۔

علاوہ بریں نئی آہنگیں اور نئے ارادے نہ صرف قلب میں پیدا ہی ہوں گے بلکہ عالم خیال سے روئے کار پر ظاہر ہوں گے۔ میں شروع ہی میں آشیرباد عرض کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ اختتام سال پر آپ میری بابت کہہ سکیں۔

اک برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

زیادہ۔ والسلام

عبدالرحمٰن

(۴)

"فرائی رش"

۸ر فروری ۱۴ء

جیسیم۔ تسلیم۔ یہاں پہنچ گیا۔ دل نہیں لگتا۔ "شاہد" اور آپ دونوں سے ایک ساتھ جدائی سخت گراں ہے۔ خدا جانے کیوں اس زمانے کے ہاتھوں اس سرزمین میں رو گرداں ہوں ورنہ!   وقت آنست کہ پرسی خبرم از بغداد

یہاں کوئی امر قابل گوش گذار نہیں! سردی لندن سے بیشتر ہے۔ برف ہر طرف چھا رہا ہے۔ قدرت کی اس کیفیت کو دیکھ کر دل اور بھی تنگ ہوا جاتا ہے۔

اپنی کیفیات سے بالتفصیل اطلاع دیتے رہیئے۔ "چترا" کے ترجمہ کی بہ کوشش ضرور ختم کر دیجیے ذرا سی دلیری اور آزادگی سے لاجواب چیز ہو جائے گی۔ بہ تاکید التماس ہے کہ کوتاہی نہ کیجیے گا جب "ققنس" مکمل ہو جائے تو ضرور روانہ کیجیے گا اور جو کچھ طبع آزمائی ہو اس سے مطلع اور مسرور کرتے رہیے گا۔

لندن کے کیا تازہ حالات ہیں۔؟ "سید صاحب" کی خیریت لکھئے اور سلام بلکہ کورنش میری طرف سے عرض فرما دیجیے۔ "مسز نائیڈو صاحبہ" کی کیفیت صحت سے بھی باخبر رکھئے گا۔ آپ کے اس دن یہ کہنے سے کہ مرض کے عود کر آنے کا احتمال ہے تعلق خاطر ہے۔

اس مرتبہ دو بار پیرس کے راستے سے "فرائی برش" آیا۔ پیرس کا دیکھنا میری قسمت ہی میں نہیں۔ بغیر قیام کئے ہوئے ویسا ہی ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کو روانہ ہو گیا۔

"شاہد" کا خط آکسفورڈ سے ملا بخیریت ہیں۔ اپنی جملہ کیفیات سے باخبر رکھئے۔ حیدرآباد سے کوئی مفصل خبر دریافت ہوئی؟

میری تو اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب اپنے اشعار کو دیکھتا ہوں تو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ شعر بھی کہہ سکتا تھا! روح شاعری کسی صدمہ قلبی کے باعث جان بحق تسلیم ہو چکی ہے۔ خدا ہی ہے جو اب شعر کہہ سکوں!

میں ہمیشہ سکون کا طالب تھا روز بروز سکون حاصل ہوتا جاتا ہے! اگر اسی کو "سکون" کہتے ہیں تو ایک روز سکون دائمی حاصل ہو جائے گا۔ اس سے تو پہلا درد دائم ہی مغتنم تھا۔ کہ اب۔ نہ نالۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

اور کوئی امر لائق گوش گزار نہیں جو عرض کروں۔

ہمیشہ جویان عافیت ہوں — زیادہ سلام شوق

عبدالرحمٰن

(۵)

مراد آباد

مورخہ ۱۴ر فروری ۱۵ء

آداب عرض کرتا ہوں!

آپ کے دو قطعہ محبت نامجات واصل ہوئے۔ اور دونوں میں کلام سحر بیان بھی میرے سر آنکھوں پر نازل ہوا۔

سینۂ ارض پہ رہنے کا فنا نام سہی — غالب مردہ تو زندہ ہے دل عالم میں
تربت کہنہ کے مٹ جانے میں بھی معنی ہیں — خاک مرحوم مل جائے گی عالم میں

سبحان اللہ ـــــ مرحبا!

اس سے بڑھ کر لوحِ غالب کی کیا؟ کسی کی کسی نے کم لکھی ہوگی۔ مضمون کی بلند پائیگی اس پر آپ کی زبان! قیامت پیدا کر دی ہے بحر بھی موزوں تو ملنا ناممکن ہے۔

خاکِ مرحوم ملی جا کے گلِ عالم میں

آپ ہی کا حصّہ ہے۔

دوسرے صحیفہ ہمایوں میں ـــــ

فردوس میں گناہ کی جب قدر ہی نہیں کیا جایئے وہاں کہ جہاں آبرو نہ ہو

یہ مضمون آپنے طرفہ پیدا کیا۔ آپ کے سوا کسی کے بس کا نہ تھا۔ مقطع ماشاء اللہ استادانہ رنگ میں ہے۔

آپ کے عالی نامے تو ایک ضیافت روحانی ہوتے ہیں۔ مگر میری کوتاہ قلمی بلکہ کوتاہ نصیبی کہ جواب عرض کرنے میں ہمیشہ تاخیر ہی کرتا ہوں اور مزید تکرارِ کتابت کے حظ سے محروم رہتا ہوں۔ تقصیر کرنا میری عادت ہو گئی ہے آپ عفو کو اپنا شیوہ بنایئے۔ جب یہ تضاد موافقت پائے تو سلسلہ استوار ہو۔

میرے مضمون کی بابتہ آپ نے اتنی تعریف کی کہ گونہ ندامت سی ہوئی۔

کاتب نے واقعی بہت ظلم کیا ـــــ مگر کاتب اور کیا کریں؟ اگر یہ نہ کریں!

آپ کی قدردانی کا بہت ممنون ہوں۔

کچھ آپ نے اس طرح سے دی دادِ سخن شک مجھ کو بھی اپنی بے کمالی میں ہوا
مگر ایک لمحے کے لئے ـــــ

جلد مرادآباد آیئے ـــــ اور پہلے سے اطلاع دیجیئے۔

ہمائے اوجِ سعادت مدام ما افتد اگر ترا گذرے بر مقامِ ما افتد

آداب ـــــ عبدالرحمٰن

(۶)

محب من - آداب - کل پہلی مرتبہ کی طرح پھر آستانہ پر حاضر ہوا تھا مگر معلوم ہوا کہ آپ نقل مکانی کر رہے ہیں - ملاقات نہ ہوئی محروم واپس ہوا -

اپنی کتاب کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ہمراہ لایا تھا وہ مکان کی صاحبزادی کو آپ کو دینے کے لئے دے آیا - گر قبول افتد....

جرمنی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت صرف اس وجہ سے کی کہ میرا یقین ہے کہ جو کچھ بھی مجھ سے عمل میں آئے اس سے آپ کو بوجہ مجھ ناکارہ سے انس رکھنے کے انس ہے۔

میں نے آپ کی اجازت لئے بغیر اس امر کی جرأت بھی کی ہے کہ دیباچہ میں آپ کا شکریہ بدیں الفاظ (ادا) کیا ہے کہ جن احباب نے ہمیشہ اس کام میں میری ہمت افزائی کی ہے۔ اس میں آصف علی صاحبؒ کا بھی حصہ ہے ـــــ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے "شاہدؔ" کا اور آپ کا نام اپنے سے کسی نہ کسی بہانہ منسوب کرنے سے ایک قلبی اور دلی خوشی ہوتی ہے -

کتاب پر ہدیہ کے چند الفاظ پنسل سے یوں لکھے کہ قلم اور روشنائی اس وقت آپ کے مکان پر نہ مل سکی -

میں بخیریت ہوں اور جلد آپ سے آکر پھر ملوں گا -

ابوالحسن صاحب کی کامیابی سے ازحد خوش ہوا ہوں - خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے -

آپ سے ملاقات کو ازحد جی چاہتا ہے - باقی عندالملاقات عرض کروں گا -

زیادہ والسلام

عبدالرحمٰن

کتاب ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے - دو تین روز میں شائع ہو جائے گی - عبدالرحمٰن

ساون کی رات

جناب سلام مچھلی شہری

اللہ اللہ اس قدر توبہ شکن ساون کی رات
بن گیا ہے میکدہ چرخِ کہن ساون کی رات
تیرے گھر برسے گی صہبائے جمن ساون کی رات
کہہ رہا ہے مجھ سے یہ اک برہمن ساون کی رات
کاش ہوتے ہم بھی اک مئے خوارِ صہبائے حیات
سوچتا ہوگا یقیناً اہرمن ساون کی رات
ایک شعلہ، ایک بجلی، ایک طوفان کے لئے
منتظر ہے جیسے اک نازک بدن ساون کی رات

چھا گئی جمنا کے تٹ پر کرشن کی بنسی کی لَے
گوپیوں سے بھر گئے ہیں برجے بن ساون کی رات

سج رہی ہیں اپسرائیں بادلوں کی اوٹ میں
"اِندر نگری" بن گیا سارا گگن ساون کی رات

مَوج میں ہیں تیر برسانے کی، جیسے کام دیو
چل رہی ہے پریم میں ڈُوبی پَوَن ساون کی رات

میں نے بس اِتنا کہا تھا، کِتنی سُندر ہے یہ رُت
بھر گئے ہیں مُدّ سے خود اُن کے نَین ساون کی رات

میں نہ کہتا تھا کہ اک شہزادۂ تخیئل ہوں
کھِل گیا ہے میرے گھر آخر چمن ساون کی رات

حکم دو، میں زندۂ جاوید کر دوں حُسن کو
بن گیا ہُوں ایک معبودِ سخن، ساون کی رات

—— ہائے وہ "نلیا"، وہ "پَلٹا باغ" پچھلی شہر کے
یاد آتا ہے سلام! اپنا وطن ساون کی رات

(دہلی، ۲۵/۷/۶۲ء)

رزمِ حق و باطل

محترمہ صالحہ عابد حسین

خالقِ کائنات نے یوں تو ہزاروں قسم کی مخلوق پیدا کی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سب سے محبوب مخلوق حضرتِ انسان ہیں جن کو اس نے بہت سی حسین و اعلیٰ خوبیوں سے نوازا ہے۔ اُسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا گیا۔ عقل وخرد کی دولتِ بے بہا سے مزین، عمل اور ارادے کی قوت سے آراستہ اور عشق کی نعمت سے سرفراز رکھا گیا۔ گو یا سارے جہان کی رعنائیاں اس میں یک جا کر دیں۔

لیکن بہت سی اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ اس میں ادنیٰ اور گھٹیا صنعتیں بھی رکھی گئیں یعنی اُسے بڑی حد تک، دوسری مخلوقات کے برعکس، ممتاز بنایا۔ وہ چاہے تو اتنا بلند و برتر بن سکتا ہے کہ فرشتے رشک کریں اور خالق فخر۔ نہ چاہے تو اتنا گر سکتا ہے کہ انسانیت شرم سے سرنگوں ہو جائے اور شیطان پناہ مانگ اُٹھے۔ وہ دنیا کو رشکِ اِرم بھی بنا سکتا ہے اور جہنم سے بدتر بھی۔ دوستی اور محبت کے پھول بھی کھلا سکتا ہے اور نفرت و دشمنی کے شعلے بھی بھڑکا سکتا ہے۔ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو (جس حد تک بھی کام میں لا سکے) بروئے کار لائے تو سچ مچ اشرف المخلوق ہے ورنہ ننگ انسانیت اور ارذالمخلوق بن جاتا ہے۔

اور اسی اشرف المخلوق کی سب سے بڑی صفت محبت کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو حقیقت میں اُسے دوسرے جانوروں سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے۔ یوں کسی نہ کسی حد تک محبت کا جذبہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے مگر عشق کا جیسا بلند، بھرپور، وسیع،

جذبہ انسان میں ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ یہی بوجھ تھا جس کو اٹھانے سے کائنات کی ہر مخلوق نے پناہ مانگی مگر انسان نے ہنسی خوشی اس بار کو اٹھا لیا ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی وہ ترا ناتواں اٹھا لایا

اور اس بے بہا سرمایہ کا خزینہ انسان کا دل بنا ۔ اس کی وسعت کا یہ عالم ہے جتنا چاہے لٹاؤ اس میں کمی نہیں آتی بلکہ بڑھتا ہی جاتا ہے ۔ بال بچے، عزیز دوست، ہم وطن، ہم قوم، بلکہ ساری نوع انسانی اس سے فیض یاب ہو سکتی ہے ۔ ہاں اس خزانے کو لٹایا نہ جائے بلکہ کنجوس کی دولت کی طرح صرف اپنی ذات کے لئے وقف کر دیا جائے، تب دھیرے دھیرے یہ کم ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک دن آدمی دیکھتا ہے کہ اس کا دل اپنی سب سے بڑی دولت سے محروم ہو چکا ہے ۔ اور اس کے بعد انسان کی حیثیت ایک بے جان جسم، ایک بے روح ڈھانچہ کی سی رہ جاتی ہے ۔

محبت کی بھی بہت سی قسمیں، بہت سے مدارج ہیں ۔ مگر ان میں سب سے اعلیٰ، سب سے ارفع محبت ہے وطن کی محبت ؎

حُبِّ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر خارِ وطن از سنبلِ ریحاں خوشتر

وطن کی محبت! کتنا بلند، پاک، شدید جذبہ ہے اس کو پوری طرح جب ہی محسوس کیا جا سکتا ہے جب کوئی ایسا وقت آن پڑے جب وطنِ عزیز کی آزادی و عزت خطرے میں پڑ جائے تب ہی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وطن کی محبت وہ ہے جس پر دنیا کی اور ساری محبتوں کو قربان کر دیا جاتا ہے۔

ہم ہندوستانی تقریباً دو سو سال تک بدیسی حکومت کے پنجے میں گرفتار رہنے کے سبب پہلے سے آزادی کی قدر و قیمت سے واقف اور وطن کی محبت میں سرشار رہے ہیں ۔ ہم نے ماضی میں بڑے بڑے دُکھ جھیلے، قربانیاں دی ہیں ۔ ہم نے دیس کو آزاد کرانے کی خاطر طرح طرح سے جنگیں لڑیں ۔ ہتھیاروں سے بھی اور بے ہتھیاروں کی اہنسا کی لڑائی بھی ۔ یہاں تک کہ ہمارے شہیدوں کا خون رنگ لایا، ہمارے عوام کی جد و جہد کامیاب ہوئی، ہمارے رہنماؤں کی کوششیں سپھل ہوئیں اور ہم نے اپنے دیس کو دنیا کی سب سے بڑی، طاقت ور سامراج کی

غلامی سے آزاد کر لیا اور ہمارے عزم واستقلال، ہمارے اٹل ارادے اور دکھ اٹھانے اور قربانیاں کرنے کی بے مثال صلاحیت کا لوہا ساری دنیا نے مانا اور اُسے سراہا۔

کچھ دولتیں اور نعمتیں ورثے میں مل جاتی ہیں، کچھ اپنے قوتِ بازو کے بل پر حاصل ہوتی ہیں جو چیز مصیبتیں جھیل کر، قربانیاں دے کر، اپنی کوششوں کے بل پر حاصل ہو اس کی قدر، عزت، اس کی حفاظت کی لگن انسان کے دل میں اس چیز سے بہت زیادہ ہوتی ہے جو بیٹھے بٹھائے ورثے میں مل جائے۔ اس لئے ہمیں بھی اپنی آزادی اتنی پیاری ہے۔ ہماری آزادی کی کہانی کوئی قصہ پارینہ نہیں۔ ابھی کل ہی کی بات تو ہے جو ہم نے جانوں پر کھیل کر اس گوہر گراں مایہ کو واپس لیا ہے۔ ہم جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں اور اپنے دیس کی انقلابی تاریخ بنتے دیکھی اور اس کے کردار ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آزادی دو بنیادی انسانی حق ہے جو ہر ایک کو ملنا چاہیئے۔ اس لئے ہمیں اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کی آزادی پیاری ہے۔ ہم سب محکوم ملکوں کے مددگار، حامی اور دوست رہے ہیں۔ ہم اپنے پڑوسیوں سے دوستی اور محبت کے رشتے استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم امنِ عالم کے پرستار ہیں اور ساری دنیا کے ایک برادری ہونے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے سبھی دور دیس کے ملکوں سے بھی بھائی چارہ اور دوستی قائم کی۔ یہاں تک کہ وہ ملک جس کی سامراجیت کا صدیوں شکار رہے تھے اس سے بھی ہم نے دشمنی نہیں باندھی بلکہ برابری اور مساوات کی سطح پر اس سے دوستی قائم کی۔ ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ دنیا کے سب ہی لوگ بھائی بھائی ہیں۔ سب کو جینے اور سکون و آزادی سے زندگی بسر کرنے کا یکساں حق ہے اور سب کو آزادی اور امن کے سائے میں، پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیئے۔

خود ہمیں اپنے دیس میں بہت کچھ کرنا تھا اور ہے۔ ہمیں اپنے دیس کی غلامی کی پیدا شدہ لعنتوں سے پاک کرنے کی جد وجہد کرنی تھی۔ ہم پس ماندہ تھے۔ غریب، جاہل ہم میں نا اتفاقی، بے عملی اور بے حسی پیدا ہو گئی تھی۔ ہمیں ان سب بلاؤں سے اپنے دیس

کو پھٹکارا دلا کر اسے ایک خوش حال، ترقی یافتہ، ملک بنانا تھا۔ ہمیں اپنے دیس کے باسیوں میں پھر سے خوش حالی، ایکتا، یک جہتی پیدا کرنی تھی، علم کی روشنی گھر گھر پھیلانی اور عمل کی لگن ہر ہر من میں لگانی تھی۔ اور ہم دل و جان سے اس مقدس کام میں لگ گئے۔ ہمارا عقیدہ تھا اور ہے کہ ہم غیر جانب دار رہ کر، بغیر گٹھ بندیوں میں شامل ہوئے، سب کے دوست اور خیر خواہ رہ سکتے ہیں اور اپنے دیس میں ایک غیر مذہبی اور سچی جمہوریت قائم کر سکتے ہیں جو ہر ہر فرد کے لئے بھی اور پورے دیس کے لئے بھی فائدہ مند ہو۔ ہم امنِ عالم کے پرستار، جنگ کے دشمن انسانیت کے خادم بن کر خود اپنے ملک کو ترقی یافتہ، مہذب ممالک کی صف میں ایک ممتاز درجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اس بڑے اور کٹھن کام میں اگرچہ رکاوٹیں بھی پڑیں، روڑے بھی اٹکلائے گئے، مخالفتوں کی آندھیوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا، دوسرے دیسوں کے رشک اور بدگمانی کا شکار بھی ہوئے، خود اپنے دیس کی پھوٹ اور جھگڑے فسادوں نے ہمارے لئے سخت مشکلیں پیدا کیں — مگر ہمارے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ ہم اپنے کام میں لگے رہے۔ اور سمجھتے رہے کہ ایک دن آئے گا جب ہمارے یہ سب بڑے بڑے منصوبے پورے ہوں گے۔ ہم اندرونی مشکلوں پر فتح حاصل کر لیں گے۔ اور بیرونی مخالفتوں کو ڈھا کر دیں گے۔ اس لئے کہ اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ہم یہ سمجھتے رہے کہ جب ہم خود سب کے دوست ہیں تو دوسرے دیس کیوں ہمارے دشمن ہوں گے؟

لیکن دنیا میں نیکی بدی، حق و باطل، دوستی و دشمنی، خیر سگالی اور حسد کا مقابلہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اکثر افراد یا قومیں دوسروں کی محض اس لئے دشمن بن جاتی ہیں کہ فریقِ ثانی اچھا کیوں ہے؟ یہی اشرف المخلوق جب ہوس، لالچ، غرور، حسد اور خود غرضی کے امراض میں مبتلا ہو جائے تو افراد کی حیثیت سے چند گھرانوں کی زندگی عذاب بنا دیتا ہے اور قوم کی حیثیت سے اس کی شیطانی کارفرمائیاں پورے پورے ملکوں کی عافیت اور سکون کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ بلکہ اب تو پوری دنیا کا امن و سلامتی کے لئے خطرہ بن جاتا ہے اور آج اس ازلی حقیقت

کی تصدیق چین کے اس جارحانہ حملہ نے کر دی جو اس نے اچانک ہندوستان پر کر دیا۔ چین! ہمارا پڑوسی!! پنچ شیل کا حامی!! ہمارا بھائی بننے والا — آج اس شعر کی صداقت کا یقین دلا رہا ہے ؎

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

اس نے سارے معاہدوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ بھائی چارے کے رشتوں کو توڑ ڈالا، شرافت انسان شناسی اور دوستی کے پرخچے اڑا دیئے اور ہندوستان جیسے امنِ عالم کے حامی اہنسا کے پجاری، سب کے دوست ملک پر کمینہ پن سے اچانک دھاوا کر کے اسے جنگ کی بھٹی میں جھونک لیا۔

ہاں — آج شاید پھر تاریخ ہمارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ جس قوم نے اپنے دیس کو دنیا کی سب سے طاقت ور حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے وہ وہ کٹھنائیاں سہیں وہ وہ قربانیاں دیں جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے، اب آزادی پا کر وہ بے فکر، بے عمل، کم حوصلہ اور بے جان تو نہیں ہو گئی؟ آج وہ ہمارا امتحان لے رہی ہے دنیا کی ایک بہت بڑی فوجی طاقت رکھنے والی حکومت سے بھڑا کر۔ کہ دیکھے کہ ہندوستان کس طرح اس کٹھنائی کو جھیلتا ہے!! کیا اس میں تیاگ، بلیدان، ویرتا، اور آزادی کی پرستش کا جذبہ اب بھی اتنا ہی شدید ہے جیسا ماضی میں تھا؟

ہاں تاریخ نے ہندوستان کو یہ چیونتی دی ہے جسے اس نے ایک لمحے کی جھجک کے بغیر قبول کر لیا ہے۔ وہ اپنی آزادی کے دشمن سے مقابلہ کرے گا۔ اپنی ساری قوت، ساری طاقت سارے وسائل کو کام میں لا کر۔ وہ دشمن جو اس کی ترقی سے جلتا، اس کی جمہوریت سے خار کھاتا اور اس کی عزت و وقار سے حسد کرتا ہے جو اس تھوڑی سی مدت میں اس نے حاصل کر لی ہے۔ اس کا اور کچھ بس نہ چلا تو یہ چال چلی کہ ہندوستان کو جنگ کی آگ میں کھینچ لو تا کہ ایک طرف اس کی ترقی کے منصوبے (خاک اس کے منہ میں)، خاک میں مل جائیں اور دوسری طرف دنیا میں وہ بدنام ہو جائے۔ چین نے شاید یہ بھی سمجھا ہو کہ ہندوستان جو امن و شانتی کا پرچار کرتا ہے

وہ بزدل ہے لیکن اس نے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ہندوستان بزدل نہیں دنیا کا سب سے بہادر ملک ہے۔ جس کا ارادہ اٹل، حوصلہ بلند، عزم پہاڑوں سے زیادہ مضبوط اور استقلال چٹانوں سے زیادہ استوار ہے۔ چین کا عمل خود اس پر الٹ گیا۔ ایک آدھ چھٹ بھیئے ملک کے سوا ساری دنیا نے چین کے حملے کی مذمت اور ہندوستان کی حمایت کی خود اس کے ساتھی کمیونسٹ ملکوں تک نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور بہت سے دیسوں نے بلا کسی شرط کے ہندوستان کو ہر طرح کی مدد دینے کی پیش کش کی اور ہر تعاون کا یقین دلایا ہے۔

اور شاید چین اس غلط فہمی میں بھی مبتلا تھا کہ ہندوستان کے اندر ہی پھوٹ پڑ جائے گی۔ ہندوستان میں بہت سی نسلیں، بہت سے مذہب، بہت سی زبانیں، بہت سی سیاسی پارٹیاں ہیں جن میں آپس میں اختلافات ہیں۔ ان میں پھوٹ ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں آپے سے باہر ہو کر سر پھٹول پر اُتر آتے ہیں۔ اور جب اس جیسی طاقت سے مقابلہ کا وقت آئے گا تو ان کی یہ آپس کی پھوٹ اور مخالفت اندرونی طور پر ہندوستان کو اتنا کمزور کر دے گی کہ وہ چین کے مقابلے کی ہمت ہی نہ کر سکے گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا ہوگا کہ مصیبت کے وقت سارا ہندوستان اس طرح متحد ہو گیا ہے جیسے وہ ایک جسم ہو اور اس کے سارے باسی اس جسم کے مختلف حصے۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ ہندوستانیوں نے اس وقت اپنے دیس کی لاج ساری دنیا کے سامنے رکھ لی۔ اس نازک وقت میں وہ اپنے سارے اختلافات بھول گئے۔ سارے مطالبے، ساری مخالفتیں پس پشت ڈال دیں۔ ان کے دل میں سوئی ہوئی یک جہتی، اتحاد اور محبت کی جوت جاگ اٹھی اور آج وہ ایک جان ایک دل ہو کر دیس کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہو چکے ہیں۔

ہو سکتا ہے چین کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوج ہو، ہو سکتا ہے اس کے پاس بہت مہلک ہتھیار ہوں، چین کو وقتی اور عارضی فتح بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان

کے پاس حق کی طاقت ہے۔ اور حق و باطل کی لڑائی صرف آج ہندوستان اور چین کی سرحد پر ہی نہیں لڑی جا رہی ہے۔ ازل سے لڑی جاتی رہی ہے۔ یہ چنگیز و ہلاکو کے ورثہ دار شاید یہ نہیں جانتے فتح آخر میں ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ ہزار ہا سال کی تاریخ کے ورق الٹ جایئے یہ حقیقت کبھی بدلتی نظر نہ آئے گی۔ تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے، آج بھی دہرائے گی۔ چین کو اپنی طاقت کا بہت غرّہ ہے مگر ہندوستان کے پاس جتنی فوج اور جو ہتھیار ہیں ان کا مقابلہ وہ کر سکے گا؟ ہندوستان کو ناز ہے، بھروسہ ہے اپنی چالیس کرور کی سینا پر جس کا ہر ہر فرد، مرد، عورت، بوڑھا، بچہ، جوان، اپنی مقدس سرزمین کی ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنے خون کا آخری خطرہ تک بہا دے گا۔ چین کو اپنے آٹومیٹک ہتھیاروں کا غرور ہے ـــــ مگر ہندوستان کو بھروسہ اور غرور ان ہتھیاروں پر نہیں ہوگا جو وہ دوسرے دیسوں سے حاصل کر سکتا ہے اور کرے گا اور جو چین کے دنیاوی ہتھیاروں کا توڑ کر سکتے ہیں۔ ہند کی فوج کے یہ سپاہی تو اس زیور جنگ سے آراستہ ہو کر میدان جنگ میں آئیں گے جن کو دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی! یہ چالیس کروڑ فوج آراستہ ہوگی حب الوطنی کی زرہ، سچائی اور انصاف کے جوشنوں عزم و ثبات کی تلواروں، آزادی کی سپر اور حق کے خود سے۔ چین کی مجبور فوج جو بھوک غلامی، جبر و تشدد کا پہلے ہی سے شکار رہے، وہ بچاری تو ان الوٹ ہتھیاروں کا کیا مقابلہ کرے گی؟ یہ تو وہ طاقتیں ہیں جن کے سامنے عظیم الشان پہاڑوں کی قوت سرنگوں ہو جاتی ہے، سمندروں کے سینے دہل جاتے ہیں، طوفانوں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ آج جس عزم و استقلال، جس عزم و حوصلہ، جس یک جہتی اور اتحاد کا مظاہرہ ہندوستان نے کیا ہے، اس کی مثال خود ہماری تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ آج کروروں سینوں میں ایک ہی دل دھڑک رہا ہے، کروڑوں دماغوں میں ایک ہی خیال پل رہا ہے، کروروں گلوں سے ایک آواز نکل رہی ہے۔ ہندوستان ہمارا ہے۔ ہمارا رہے گا اور اس کی چپہ چپہ

زمین کی حفاظت کے لئے ہم خون کا ہر ہر قطرہ نچھاور کر سکتے ہیں۔

یہ بھیم وارجن کا، نانک وکبیر اکبرو پرتاب، حیدر علی و ٹیپو، حضرت محل اور رانی جھانسی آزاد و انصاری، گاندھی اور جواہرلال کا دیس ہے ــــــ یہ کبھی ظلم کے سامنے سر نہ جھکائے گا۔ کبھی ناانصافی کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے گا۔ کبھی باطل سے سمجھوتہ نہ کرے گا۔

بے شک ہندوستان امنِ عالم کا پجاری، انسانیت کا دوست، حق کا پالن ہار اور اہنسا کا پیامبر اور انھیں قدروں کی حفاظت کے لئے وہ دشمن سے مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ حق ثابت ہو جائے اور باطل مٹ جائے۔ اس لئے کہ ہمیشہ سے سچائی کی فتح اور ظلم و ناانصافی کی ہار ہوتی آئی ہے اور آج بھی ہوگی۔ آج ہندی اپنے عمل سے دنیا پر یہ ثابت کرے گا کہ ؎

ہو محفلِ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے ہندی

عظمت رفتہ ——— ایک تاثر

جناب ابو علی اعظمی

ملک میں مہاتما گاندھی کے علاوہ جہاں اور بہت سے اپنے عمل و اخلاص اور جوش خدمت کے اعتبار سے "گاندھی" پیدا ہو گئے تھے، ان میں ایک مسز سروجنی نائیڈو بھی تھیں، جن کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز جنوبی ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ بمبئی تھا، جس طرح خان عبدالغفار خاں سرحد کے، خان عبدالصمد خاں بلوچستان کے۔ سی راجگوپال اچاریہ مدراس کے، بابو راجندر پرشاد بہار کے، سی آر داس بنگال کے، پنڈت موتی لال نہرو یوپی کے، جمنالال بجاج سی پی کے، ولبھ بھائی پٹیل گجرات کے گاندھی سمجھے جاتے تھے، اور ان کا ملک کے ہر حصہ میں اسی حیثیت سے پر جوش استقبال ہوتا تھا، اسی طرح بمبئی میں خاص طور سے اور پورے ملک میں عام طور سے گاندھی جی کی عقیدت مند مسز سروجنی نائیڈو سمجھی جاتی تھیں، وہ آزادی سے بہت پہلے کانگریس کے سالانہ جلسہ کی جو ۱۹۲۵ء میں کان پور میں منعقد ہوا تھا، صدارت بھی کر چکی تھیں، ان کے حلقۂ احباب میں جہاں اور مذاہب کے ممتاز ماننے والے تھے، وہاں ہر مکتب فکر اور ہر شعبۂ زندگی کے بکثرت ممتاز اور سربرآوردہ مسلمان بھی تھے، جن کے ساتھ وہ بڑے اخلاص اور محبت سے پیش آتی تھیں اور ان کی بڑی قدر کرتی تھیں، اور ان سے مل کر بہت خوش ہوتی تھیں، انہی میں ایک ضیاء الدین برنی بھی ہیں۔ جو فارسی زبان کے ایک نامور و صاحب تصانیف مورخ ضیاء الدین برنی کے ہم نام، شاہجہاں کی علم پرور و ادب نواز شاہزادی جہاں آرا کے سوانح نگار اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔
انھوں نے ابھی حال میں "عظمت رفتہ" کے نام سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی "گنجہائے گرانمایہ" بابائے اردو مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" اور مولانا سید سلیمان ندوی کی "یاد رفتگاں" کے طرز پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق بینکڑوں اشخاص کے متعلق جو دنیا سے

گزر گئے ہیں۔ اور جو ان کی نظر میں باعظمت محترم اور کسی نہ کسی حیثیت کے مالک تھے، اپنے نقوش و تاثرات پیش کئے ہیں۔

ہم مصنف سے ان کی مقبول ترین کتاب جہاں آرا کی وجہ سے واقف تو ضرور تھے، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ تصنیف و تالیف و سوانح نویسی کا اتنا اچھا ذوق رکھنے کے ساتھ وہ سرکاری ملازم بھی ہیں۔ اور اتنے وسیع الملاقات بھی، اس کا علم بالکل پہلی مرتبہ ان کی اس گرانقدر کتاب سے ہوا، ان کے دائرہ ملاقات میں مذہب کے اعتبار سے ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور پارسی بھی، اور پھر ذوق و فکر اور پیشہ و مشغلہ کے لحاظ سے مصنف بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، عالم بھی ہیں، وکیل بھی ہیں اور معلم بھی زبان کے لحاظ سے اردو داں بھی ہیں، فارسی دان بھی ہیں، اور انگریزی دان بھی، مرز و بوم کے اعتبار سے، انگریز بھی ہیں، عرب بھی ہیں اور ترکی و ایرانی بھی، اشخاص و اعاظم رجال کے اعتبار سے گاندھی جی بھی ہیں، قائد اعظم بھی ہیں، سر آغا خاں بھی ہیں، اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی، صنف نازک میں مسز اینی بسنت بھی ہیں، بیگم حسرت بھی ہیں، اور مسز سروجنی نائیڈو بھی، اور تینوں خواتین جیسا کہ معلوم ہے، اپنی زندگی میں ہر اعتبار سے بڑی عظمت، عزت اور شہرت کی مالک تھیں، اور ملک و ملت کی راہ میں جن کی بیش بہا قربانیوں اور کارناموں سے اس ملک کا بچہ بچہ واقف ہے، ان میں سے ہر ایک سے مصنف کے کسی نہ کسی نوع کے تعلقات تھے اور وہ اُن کی شخصیت سے متاثر تھے، انھوں نے اپنی اس کتاب میں شاعرۂ ہند مسز سروجنی نائڈو پر بھی اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ جو ۱۶ صفحوں میں آئے ہیں حافظ شیرازی کا وہ مشہور شعر بھی درج کر دیا ہے جو خطیبۂ ہند اپنی اردو تقریروں میں اکثر و بیشتر لوگوں میں جوش پیدا کرنے یا ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پڑھا کرتی تھیں، یعنی

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے   شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

جب یہ فارسی شعر اپنے خاص ترنم میں جلسوں میں پڑھتی تھیں تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، راقم الحروف نے بھی اعظم گڑھ کے ایک پولیٹکل جلسہ میں جو انہی کی صدارت میں، خالص کھدر کے پنڈال میں مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولانا مسعود علی ندوی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا،

یہ شعر ان کی زبان شیوا بیان سے سنا ہے، اور ان کے پڑھنے کا سماں اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو کو حافظ شیرازی کے علاوہ خیام و اقبال اور بہت سے ممتاز اردو شعرا کے اشعار بھی بکثرت یاد تھے، جنھیں وہ بقول مصنف کے اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر حاضرین میں خاص ولولہ پیدا کر دیتی تھیں، اقبال سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ان کی مزاج پرسی کے لئے لاہور بھی تشریف لے گئی تھیں، اقبال خود بھی، کبھی کبھی اپنا کلام انھیں بھیجتے رہتے تھے، اور ان کا کلام سُن کر وہ بہت محظوظ ہوتی تھیں۔

انہی کے ہم نام اردو زبان کے دوسرے مشہور اور نعت گو شاعر علامہ اقبال سہیل سے بھی مسز نائیڈو کو بڑا اخلاص تھا، اور وہ ان کے اردو فارسی کلام کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ان کی علی گڑھ میں پہلی آمد کے موقع پر اقبال سہیل نے قاآنی کے طرز پر، ان کی شان میں ایک مختصر خیر مقدمی نظم پڑھی تھی، جس کو سُن کر اور تو اور خود بلبلِ ہند پر وجد و کیف کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی شاعر کی ان سے ملاقات ہوتی، یہ نظم پڑھوا کر سنتیں اور اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں، یوں تو یہ پوری نظم بہت مرصع، دلآویز اور موسیقیت سے لبریز ہے لیکن ان چند اشعار میں تو شاعر نے ممدوح کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

کنول بہ چشم روشنی چو جلوہ زد سروجنی　　فلک بہ سطح سوسنی بساط ماہتاب زد

تبسمش تکلّمے، تکلمش ترنّمے　　سز د ما گر تلاطمے بہ جانِ شیخ و شاب زد

شکستِ رنگِ سامری چو زد نوائے شاعری

نمودہ سحر سامری اگر در خطاب زد

بقول مرزا احسان احمد صاحب ان نغموں سے صحیح طور پر وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جس کو مسز نائیڈو کی تقریر سننے کا کبھی اتفاق ہوا ہو، واقعہ یہ ہے کہ جب وہ تقریر کرتی تھیں، تو یہ معلوم ہوتا تھا، کہ کسی رباب رنگین کے پردے مشتعل ہو گئے ہیں، اور سامعہ نغمۂ وسرود کی نشاط انگیز

موجوں میں ڈوب گیا ہے۔

کتاب کے مصنف ضیاء الدین صاحب برنی کی مسز نائیڈو سے پہلی ملاقات ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنت کے قائم کردہ تھیوسوفیکل ہائی اسکول کانپور میں ہوئی تھی، جہاں وہ ٹیچر تھے، اسی ملاقات نے بعد میں دوستی، یگانگت اور اخلاص کی صورت اختیار کرلی تھی، وہ جب تک ہندوستان میں تھے، اور موصوفہ بقید حیات تھیں۔ وہ برابر ان سے ملتے رہے اور وہ ہمیشہ ان پر لطف وکرم اور عنایات کی بارش کرتی رہیں۔ وہ تقسیم سے پہلے سکریٹریٹ کے شعبۂ اطلاعات سے متعلق تھے، اس تعلق کے زمانہ میں ایک مرتبہ وہ بمبئی سے رمضان کے مہینہ میں اپنے وطن دہلی گئے، جہاں کسی ضرورت سے یہ مخدومۂ ملک بھی قیام فرما تھیں، ایک دن سہ پہر میں یہ گشت کے لئے شہر میں نکلے، تو پھرتے پھراتے موصوفہ کے یہاں پہنچ گئے، دیکھ کر باغ باغ ہوگئیں، اور فرمایا کہ اس وقت تم خوب آئے، چلو میرے ساتھ ایک ٹی پارٹی میں، انھوں نے ہر چند عذر کیا، لیکن مسموع نہیں ہوا، آخر میں عرض کیا، کہ میں روزہ سے ہوں، فرمایا کوئی ہرج نہیں ہر تم میرے ساتھ چلو تو، چنانچہ وہ موصوفہ کی قابلِ فخر معیت میں ٹی پارٹی میں جو انہی کے اعزاز واکرام میں تھی، پہنچے، کوئی ڈیڑھ سو مہمان مدعو تھے، جو ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، اور قاعدہ سے ان کے پہنچتے ہی پارٹی شروع ہوجانی چاہیے تھی، لیکن روزہ کھولنے میں ابھی ۱۵ منٹ کی دیر تھی، موصوفہ بجائے اس کے کہ چائے کے پیالہ وساغر کی طرف ہاتھ بڑھائیں، اور چائے نوش فرمائیں، فرمایا کہ میرے ساتھ بمبئی کے ایک مسلمان دوست بھی آئے ہیں، جو روزہ سے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تھوڑی دیر آپ اور انتظار کی زحمت کریں، تاکہ روزہ کھولنے کا وقت ہوجائے، اور ہمارے معزز دوست بھی اس میں شریک ہوجائیں، چنانچہ ٹی پارٹی ۱۵ منٹ کی تاخیر کے ساتھ بعد مغرب شروع ہوئی، اس پارٹی کی مہمان خصوصی تو در حقیقت مسز نائیڈو تھیں، اور سب کی نگاہوں کا مرکز وہی تھیں۔ لیکن ان کے تعارف کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خود مصنف کتاب حاضرین کی توجہات کا مرکز بن گئے اس دور میں اس رواداری کی توقع تو درکنار کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔

مسز نائیڈو جیسا کہ معلوم ہے، حیدرآباد کے ایک معزز ہندو بنگالی گھرانہ میں پیدا ہوئیں،

وہ ہر اعتبار سے ہندو تھیں، ہندو روحانیات اور ہندو اخلاق و فلسفہ کی بڑی دلدادہ تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ بڑی فراخ دل، وسیع القلب، اور وسیع المشرب تھیں، ان کے دل میں دنیا کے سب مذاہب کے لئے گنجائش تھی، ان کی بڑی قدردان تھیں، کسی مذہب کی طرف سے تعصب یا نفرت کا شائبہ تک ان میں نہیں تھا، وہ اسلام کی خوبیوں کی بڑی معترف تھیں، خصوصاً اخوت، مساوات اور جمہوریت کے متعلق اس کی جو تعلیمات ہیں، اور اس کے ماننے والوں نے اس کے جو شاندار نمونے پیش کئے ہیں، اور جو تاریخوں میں محفوظ ہیں، ان کی وہ دل سے قدردان تھیں، اور اپنی تقریروں میں شاندار اور موثر الفاظ میں ان کا ذکر کرتی تھیں، ان کی رواداری کی ایک عجیب و غریب مثال ابھی آپ کی نظر سے اوپر گذری ہے، دوسری یہ ہے،

یوں تو شروع سے آخر تک ان کا پورا خاندان ہندو تھا، اور اس کے ہر فرد کو اپنے ہندو ہونے پہ فخر تھا، خود مسز نائیڈو بھی ہندو روایات و معتقدات کی حامل تھیں ان کو ہر چیز پر ترجیح دیتی تھیں، لیکن ان کے بھائی، عیسائی مشنریوں کی تبلیغ، اور انجیل کے مطالعہ سے عیسائی ہو گئے تھے، اور خاندان سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے، اور اس تبدیلی مذہب کی وجہ سے ان کو خاندان سے بڑا بُعد ہو گیا تھا، لیکن مسز نائیڈو نے زندگی کے آخر تک ان سے اپنا تعلق قائم رکھا، اور ان کو اپنا بھائی سمجھتی رہیں۔ اپنی کسی بات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا، کہ ان کا مذہب کچھ اور، اور ان کے بھائی کا کچھ اور ہے۔

"عظمت رفتہ" مصنف کے ہم عہد اشخاص سے متعلق اسی قسم کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات حکایات سے لبریز ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اور واقعات بھی زیادہ تر ایسے، جن سے براہ راست مصنف کا تعلق رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مصنف دوسروں کے واقعات و حالات نہیں خود اپنی آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اس کتاب سے اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مصنف کا انداز بیان اتنا سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، اور اس میں اتنا خلوص ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی، جی چاہتا ہے، کہ اس کو بار بار پڑھا جائے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے۔

اِنسانی حقوق کا شعور

اب سے پندرہ سال قبل دس دسمبر ۱۹۴۸ء کو انجمنِ اقوامِ متحدہ کی مجلس عام (جنرل اسمبلی) نے انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامے کو باضابطہ اور واضح طور پر منظور کیا۔ اسی دن سے تمام اراکین پر یہ ذمہ داری عائد ہوگئی ہے کہ اس تاریخی کارنامے کی ترویج، واشاعت ہر ممکن طریقے سے اپنے اپنے ممالک میں برابر کرتے رہیں۔ تعلیمی اداروں میں اس اعلان نامے کے نکات کی واقفیت پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ اس پیغامِ اُخوت سے زیادہ سے زیادہ دلوں کو گرمانے کی غرض سے ہر سال دس دسمبر کو 'یوم حقوقِ انسانی' منایا جاتا ہے۔ لیکن فطرتِ انسانی کا یہ عجب المیہ ہے کہ ہر مرتبہ فرزندِ آدم کی سال بھر کی کارگزاریوں کے پیش نظر اس اعلان نامے کو دُہرانے کی ضرورت کا احساس کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ آج جو انسان تمام قدرتی حدود پر عبور حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے، جو سارے عالم کو چند لمحوں کے اندر بآخیر کر سکتا ہے اور جسے بڑی سے بڑی مسافت طے کرتے ہوئے کچھ دیر نہیں لگتی، وہی انسان تنگیٔ قلب و نظر کا کچھ ایسا شکار ہے کہ ہر جگہ اتفاق و اتحاد کے بجائے انتشار و ادبار کے آثار برابر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ تاہم اولادِ آدم میں مساوات کا اصول ہی امن و آشتی کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر اس جہان میں آدم کی جنت بنانی ہے تو بیان و خیال کی آزادی سب کو دینی ہوگی اور مجبوری و لاچاری سے ہر ایک کو چھٹکارا دلانا ہوگا۔ ان حقائق سے منہ موڑنے کی صورت میں ابتری لازمی۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ دنیا کی تمام قومیں ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھیں اور انسان سے انسان، پیار و محبت کے رشتے میں دائمی طور پر منسلک ہو جائے۔

اس اعلان نامے کی غرض وغایت یہی ہے۔ یہاں شخصی احترام پر پورا زور دیا گیا ہے اور عورت و مرد کے ساتھ برابری کا برتاؤ بتایا گیا ہے تاکہ سماجی ترقی کا بہتر معیار جلد قائم ہو سکے۔ ملکی اور غیر ملکی تعلقات میں اِن باتوں کو پورے خلوصِ نیت کے ساتھ برتنے پر زور دیا گیا ہے۔ اعلان نامے میں کل تیس دفعات ہیں۔ پہلی دفعہ میں ہی اعلان کیا گیا ہے کہ سب انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں جو اپنے حقوق اور عزتِ نفس کے اعتبار سے بالکل برابر ہیں۔ وہ صاحبانِ عقل و دل ہیں اور اُن سب کو ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اسی طرح دوسری دفعہ کے تحت رنگ و روپ، زبان و بیان، جنس و خیال کا پاس کئے بغیر انسانیت کے تمام حقوق سب کے لئے برابر قرار دئے گئے ہیں۔ دیگر دفعات کے اندر غلامی سے نجات، قانون کی مساوات، آزادیٔ عقائد جیسے حقوق کو سراہا گیا ہے۔ اس اعلان نامے کی چھبیسویں دفعہ میں ہر فرد کے حقِ تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔ کم از کم ابتدائی منزل تک کی تعلیم لازمی اور مُفت قرار دی گئی ہے۔ فنی تعلیم اور مخصوص پیشوں کی تربیت حاصل کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور اہلیت کے مطابق ہر ایک کو اعلیٰ تعلیم کی یکساں سہولتوں کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم کا مقصد، شخصیت کی تشکیل و تکمیل اور اس کا احترام بتایا ہے۔ حصولِ امن عالم اور بین الاقوامی مفاہمت اس کی ذمہ داریاں قرار دی گئی ہیں۔ اگلی دفعہ میں ہر شخص کو سماجی مشاغل میں شرکت کرنے، فنونِ لطیفہ سے لطف اٹھانے اور سائنس کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کا حق دیا گیا ہے۔ مزید برآں ہر فن کار ادیب اور سائنس داں کو اپنے فکر و عمل کے اخلاقی اور مادّی فوائد میں بھی شریک مانا گیا ہے۔

تعلیم کا یہ نصب العین نیا نہیں ہے۔ لیکن انجمنِ اقوامِ متحدہ نے اُسے انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامے میں بجا طور پر دہرایا ہے کیونکہ آج کی دنیا میں انسان کی اپنی افتادِ طبع کی بدولت ظلموں کی بدلیاں کچھ اس طور سے گھر کر آ رہی ہیں کہ خود وجودِ انسانی ہی معرضِ خطر میں نظر آنے لگا ہے۔ تعلیم کو حصولِ اقدار کے بجائے تکمیلِ اغراض کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ لیکن

ہندوستان نے ہر دَور میں تعلیم کو روحانیت کا وسیلہ سمجھا ہے اور اسے ہمیشہ ایک مذہبی فریضے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ پنڈت ہو یا مولوی۔ درویش ہو یا سنیاسی۔ جبہ پوشانِ شرع ہوں یا گدلئے خرقہ پوش، سب اپنے اپنے طریقے سے خلق خدا کے ظاہر و باطن کو سنوارنے میں لگے رہے ہیں اور اس خدمت کو اختیاری کو عبادت سمجھ کر کیا ہے۔ کسی نے کوئی گروکل یا مٹھ آباد کیا ہے اور کوئی مسجد و خانقاہ میں بیٹھا ہے لیکن علم کی آبیاری ہر ایک نے کی ہے اور انسانی قلوب کی تسکین کو سب ہی نے اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اس دیس میں تعلیم کو تجارت کبھی نہیں بنایا گیا بلکہ اُسے انسانی صفات کا سرچشمہ، راہ نجات، اور خدمتِ خلق کا موثر ذریعہ مانا گیا ہے بس اقتدارِ مغرب کے دَور میں پہلی مرتبہ تعلیم کی خواری دیکھنے میں آئی اور مادیت کے غلبے کی بنا پر اس عہد میں بے شک اُسے محض دنیادی ضروریات کی تکمیل کے ایک آلۂ کار کی حیثیت دی گئی۔ یہ دورِ غلامی کی ایک لعنت تھی جسے چار و ناچار جھیلنا پڑا۔ لیکن جبر سے دست و بازو کو گرفت ہو سکتی ہے، زبان پر مہرِ سکوت لگ سکتی ہے مگر دل نہیں بدلے جا سکتے۔ اس دورِ آزادی میں ہمیں اپنی روایاتِ کہن کو از سرِ نو تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اب یہ ذمہ داری قوم کے اساتذہ پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے منصب کو پہچانیں اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں۔ تعلیم دراصل انسان بناتی ہے۔ اگرچہ یہ کام اس ملک کے رہنمایانِ تعلیم کی زیرِ نگرانی ہوا کرتا ہے لیکن اصل ہاتھ ایک استاد کا ہی سلجھے آتا ہے۔ جس قدر یہ ہاتھ ہنرمند ہوگا اسی قدر اس کی دستکاری چمکے گی۔ ہمارے دیس میں تعلیم کا مسئلہ، بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں اپنے دیس میں جلد از جلد ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت کرنا ہے۔ اگر حالات سازگار رہے اور ہمارے اندازے ٹھیک نکلے تب ۱۹۷۵ء میں چھ سال سے لے کر گیارہ سال تک کے سب بچے مدرسوں میں پہنچ سکیں گے۔ اور یہ بھی اس وقت ممکن ہوگا جبکہ قومی آمدنی خاطر خواہ بڑھتی رہے اور اس کا چار فیصدی تعلیم پر

صرف کیا جائے جس میں نصف، ابتدائی تعلیم کے لئے محفوظ رہے۔ ثانوی مدارس میں طلبہ کی مختلف صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور ابھارنے کی غرض سے مختلف نوعیتوں کے مضامین کا انتظام کرنا ہے تاکہ ذہین طلبہ اپنے ذوق و شوق کو پورے طور پر اُبھار سکیں۔ اس زمانے میں مغربی ممالک نے جو حیرت انگیز مادی ترقی کی ہے، اور فطرت کو مطیع اور قوت کو دست نگر بنا لیا ہے، اس کا واحد سبب ان ممالک میں سائنس کی تعلیم کا بہتر انتظام اور اعلیٰ معیار ہے۔ ہمیں اس وقت ثانوی تعلیم کی منزل پر سائنس کی تعلیم کا بہت کچھ اہتمام کرنا ہے۔ ہماری حکومت نے اس طرف ضروری قدم بھی اٹھالیا ہے۔ تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں سائنس کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے اور سائنس کے اساتذہ کی تربیت کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم میں صرف وسعت ہی نہیں بلکہ وقعت بھی پیدا کرنے کا سوال ہے تاکہ ہونہار فرزندانِ وطن، بساطِ علم وفن کے درخشندہ ستارے ہوسکیں۔ اس کام میں مادی وسائل کے ساتھ ساتھ کارکنوں کا خلوصِ نیت بھی نہایت ضروری ہے۔ وطن کے اساتذہ ہی اس کی آبرو رکھ سکتے ہیں اور ان ہی کے سوزِ دروں سے لاکھوں ننھی ننھی جانیں اپنے ذہن کے چراغ، روشن کرسکتی ہیں جن سے وطن کی عظمت کو چار چاند لگتے ہیں۔ اس لئے وطن کی ساری فلاح و بہبود، اس کا وقار و افتخار سب کچھ وطن کے اساتذہ کی اہلیت و محنت پر منحصر ہے۔ علاوہ ازیں تعلیم کا کام وقتی ہنگامہ آرائی سے انجام نہیں پاتا۔ اس عمل میں دیر لگتی ہے۔ تعلیم کے پھل مسلسل جدوجہد کے بعد برسوں میں نصیب ہو پاتے ہیں اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ پودا کوئی اور لگاتا ہے اور پھل کسی دوسرے کی موجودگی میں آتے ہیں۔ لیکن پھل آتے ضرور ہیں۔ گلزارِ وطن کی بہار کے لئے نونہالوں کو سرسبز و شاداب کرنا لازمی ہے تاکہ ایک دن وہ بار آور ہو کر فیضِ رساں ثابت ہوسکیں۔ پود لگانے کا کام ابتدائی مدرسے میں ہوتا ہے۔ یہ منزل سب سے کٹھن بھی ہے اور اہم بھی۔ پھر دوسری منزلیں آتی ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی خاص حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے اور اسی لحاظ سے ان کی طرف

توجہ دَر کار ہے۔

ہمیں اپنے تعلیمی نظام کی بنیادیں پورے طور پر استوار کرنی ہیں۔ آزادی کے بعد ایک ساتھ تعلیمی میدان میں جو توسیع ہوئی ہے اس کی وجہ سے خاطر خواہ معیار قائم نہیں ہو سکا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور اس صورتِ حال سے ہراساں ہونے کا سوال نہیں اُٹھتا۔ اس وقت تک قومی معاشرے میں ڈھیلے پن کے جو آثار نظر آئے ہیں، انھیں حالات کا مظہر سمجھنا چاہیے۔ وہ ہماری فطرت کے آئینہ دار قطعی نہیں ہیں لیکن اب آزادی حاصل کئے ہوئے پندرہ سال گذر چکے ہیں لہذا غلامی کی گرد قطعی طور پر ضرور جھڑ جانی چاہیے تاکہ قوم کا اصلی رنگ وروپ نکھری ہوئی صورت میں جھلک سکے۔ اس مقصد کے لئے تعلیمی کارکنوں کو سختی سے اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ تعلیمی کام میں دوسرے درجے کے نتائج سے مطمئن ہو جانے کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں ملمع سازی اور نعرہ بازی کے ذریعے کام نہیں چل سکتا۔ اس میں صبر و استقلال کے ساتھ لگ جانے کی ضرورت ہے۔ اب تک قوم کی تعمیرِ نو کا کام پنج سالہ منصوبوں کی صورت میں میانہ روی کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ تیسرے منصوبے کے اختتام پر ہمارے خوابوں کا ایک عکس واضح طور پر سامنے آئے گا لیکن چین نے ہمارے شمالی مشرقی سرحدی علاقے کو اپنی ہوس ناکی کا نشانہ بنانا چاہا۔ موج بلا کے یہ تھپیڑے ہمیں چونکانے کے لئے کافی ہیں۔ اس وقت سارے ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے اور ہمارے حوصلے بلند ہو گئے ہیں لیکن اس عزم کو عزمِ مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں موجودہ حالات کے تحت صرف فوری انتظامات سے اپنی تسکین نہیں کرنی ہے بلکہ قوم کا مزاج بدلنا ہے۔ ہمارے سامنے صرف وقت کی پکار پر کان دھرنے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ زمانے کی چال پہچاننے کا مسئلہ ہے۔ درندگی کو دفع کرنے کی غرض سے طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ہم اپنی قوم کو ہر حیثیت سے مضبوط بنائیں گے تاکہ آئندہ

کوئی ہم پر نگاہِ بد نہ ڈال سکے۔ اس غرض سے ہمیں اپنی تعلیم کا چولا بدلنا ہوگا۔ لیکن تعلیمی مصارف کو کم کرنے یا نظرانداز کرنے کی بات کم نگاہی پر مبنی ہے بلکہ حالات کے تقاضے اس باب میں ہماری مزید توجہ چاہتے ہیں۔ کسی ملک کی سب سے بڑی دولت اُس ملک کے بچے ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ منفعت بخش کاروبار، تعلیم۔ ہمیں بہر طور تعلیمی کام کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دینا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ چین یا کسی اور ملک کی بدسلوکی کی بنا پر ہم اپنا مسلک ہرگز نہیں بدلیں گے۔ دنیا کے سامنے دین و ایمان کی بات ہم نے ہمیشہ کی ہے اور اب بھی کرتے رہیں گے۔ ہم نے انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامے کی تائید جس خلوصِ دل سے کی تھی، آج کے حقائق کی روشنی میں ہمیں اس کی وقعت کچھ اور محسوس ہوتی ہے۔ ہمارا استاد اپنے ہاتھ میں محبت کی مشعل لئے ہوئے تہذیبِ نفس کا درس برابر دیتا رہے گا۔ اس نے حادثاتِ زمانہ سے گھبرانا نہیں سیکھا ہے۔ اُس کا پیغام ایک ہی ہے کہ:

انساں بن انسان، یہی ہے تری معراج!

"معلم"

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات

مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

سائز ۲۰ × ۳۰ / ۱۶ - حجم ۲۴۸ صفحات - غیر مجلد - قیمت: ساڑھے تین روپے - تاریخ اشاعت دسمبر ۶۱ء - جناب مرتب سے "رابعہ منزل - بدر باغ - علی گڑھ" کے پتے پر مل سکتی ہے۔

مرزا احمد ہادی رسوا سے کون واقف نہیں؟ "امراؤ جان ادا" نے انھیں شہرت دوام عطا کر دی ہے، مگر زیر تبصرہ مراسلات سے ان کی ایسی خصوصیات اور خوبیاں سامنے آتی ہیں، جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایا بہت کم ہے، شبلی اور حالی کے بعد اس موضوع پر کوئی جامع اور مستقل کتاب نہیں لکھی گئی، اگر تنقیدی مضامین کے بہت سے مجموعے چھپے ہیں، جن کے مضامین زیادہ تر عملی تنقید سے تعلق رکھتے ہیں، نظری سے کم، مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ مجموعے جدید خیالات اور رجحانات کی پوری طرح ترجمانی کرتے ہیں اور مستقل تصنیف کے احساس کمی کے باوجود ان سے اردو ادب میں اضافہ ہوا ہے، آج بھی جبکہ اردو ادب نے کافی ترقی کر لی ہے اور مغرب کے اثرات سے ہمارا مزاج اور ذوق کافی بدل چکا ہے، مرزا رسوا کے یہ تنقیدی مراسلات جو اب سے کوئی بیس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ بقولِ مرتب خاصے کی چیز ہیں۔

مرزا رسوا عربی فارسی کے جید عالم تھے، فلسفہ اور منطق سے نہ صرف گہری واقفیت تھی بلکہ طبیعت کو ان سے مناسبت بھی تھی، اس کی وجہ سے ان مراسلات کی زبان اور اصطلاحیں بہت مشکل اور غیر معروف ہیں، فاضل مرتب نے پیش لفظ میں موضوع بحث کی وضاحت کی کوشش

کی ہے اور آخر میں "تعلیقات" کے عنوان سے بعض ضروری باتوں، خصوصاً اصطلاحوں کی صراحت کردی ہے، لیکن مجھے شبہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے پوری طرح استفادہ کرسکے گا۔ البتہ مرزا کی سیرت و سوانح اور ان کے علمی کارناموں پر ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر "اودھ پنچ" اور مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے مضامین بہت دلچسپ ہیں اور ان سے مرزا رسوا کی سیرت و شخصیت کے بہت سے تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

نئے ڈرامے   مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۴۱۲ صفحات، غیر مجلد، قیمت پانچ روپے۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۰ء۔
ناشر: انجمن ترقی ہند۔ علی گڑھ۔

اردو میں ڈرامے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو اس موضوع سے طبعی لگاؤ ہے اور اس کے فن اور اسٹیج کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کتاب میں اردو کے مشہور ادیبوں کے بارہ ڈرامے شامل ہیں، انتخاب میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ انھیں آسانی سے اسٹیج کیا جاسکے اور ان کا ادبی معیار بھی بلند ہو۔ ان میں سے بیشتر موجودہ سماجی مسائل پر لکھے گئے ہیں اور جدید رجحانات و خیالات کے آئینہ دار ہیں، کردار وہی ہیں جو ہماری دنیا میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور زبان وہی ہے جو روزمرہ بولی جاتی ہے۔

کوائف جامعہ

امیر جامعہ کی وفات

تیسرے امیر جامعہ ڈاکٹر عبد المجید خواجہ صاحب کا ۷۷ سال کی عمر میں ۲ دسمبر کو ۱۱ بجے علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اطلاع ملتے ہی جامعہ میں چھٹی کردی گئی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کافی عرصے سے سخت بیمار تھے اس لئے وہ تو علی گڑھ نہ جا سکے، مگر قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، مسجل جامعہ جناب ارشاد الحق صاحب اور بعض دوسرے اساتذہ تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ ۴ دسمبر کو سیوم کے دن جامعہ میں قرآن خوانی ہوئی، جس میں اساتذہ اور طلباء نے شرکت کی، اس کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب کی صدارت میں تعزیتی جلسہ ہوا، استاد اسلامیات مولانا قاضی زین العابدین صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تقریر کی اور مرحوم کی قومی خدمات کو تفصیل سے بیان کیا۔ آخر میں صدر جلسہ کی طرف سے حسب ذیل تجویز پیش کی گئی:-

جامعہ ملیہ کے استادوں کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ امیر جامعہ عبد المجید خواجہ صاحب کی وفات پر اپنے رنج والم کے گہرے جذبات کا اور مرحوم کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اور چند بزرگانِ قوم کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں جامعہ ملیہ کی بنا رکھی۔ ایک مدت تک شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اور چوتھائی صدی تک امیر جامعہ کی حیثیت سے اس کی رہنمائی کی۔ مرحوم ہمارے لئے حب وطن اور حب ملت خلوص ایثار اور خدمت کا ایک شاندار نمونہ چھوڑ گئے ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی مغفرت کرے

اللہ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

جامعہ کے طلبائے قدیم کی ایک تقریب ۲ دسمبر کی شام کو پہلے سے طے تھی۔ امیر جامعہ کی وفات کی وجہ سے یہ تقریب تعزیتی جلسہ میں تبدیل کردی گئی۔ اس موقع پر ایک تجویز منظور کی گئی، جس میں مرحوم کی ملی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

"جنگ بند ہوگئی ہے، مگر دفاعی تیاریاں جاری رہیں گی"

جامعہ میں ملک کے دفاع کے لئے جہاں اور بہت سی تیاریاں شروع کی گئی تھیں، وہاں سول ڈیفنس کی تربیت کا ایک مختصر سا کورس شروع کیا گیا تھا۔ اس کورس کی ٹریننگ لینے والوں کے ایک جلسے میں شیخ الجامعہ صاحب اور دلی اسٹیٹ کے اسکاوٹ کمشنر سکینہ صاحب نے تقریریں کیں۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ فی الحال لڑائی بند ہوگئی ہے مگر ہماری تیاریاں اسی طرح جاری رہیں گی، جیسے کہ جنگ کے زمانے میں ہوتی ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ چینیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ کس وقت وہ کیا کر بیٹھیں، اس لئے ہمیں جنگ بندی کے باوجود اپنی تیاری جاری رکھنی ہے۔ چینیوں کے حملے سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ ہم کسی لڑائی کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہماری حکومت تعمیری کاموں میں لگی ہوئی تھی، یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ آزادی کو قائم رکھنے اور اس کو مضبوط بنانے کے لئے یہ سب تعمیری کام بہت ضروری تھے مگر جو خرابی تھی وہ یہ کہ ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ کسی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور اگر حملہ ہو تو کیا کرنا ہوگا بہرحال اب ہم کو اپنی کمزوریاں معلوم ہوگئی ہیں۔ اس لئے قومی دفاع کے سلسلے میں جو کام شروع کئے گئے ہیں، وہ جاری رہیں گے۔ موصوف نے فرمایا کہ ہمیں اس کو نظر میں رکھنا چاہیئے کہ بری کی بری شکل پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہیئے آپ نے فرمایا کہ تھوڑے دنوں میں موسم سرما کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں، اس میں ہماری تیاریاں حسب معمول جاری رہیں گی۔ جو لوگ اس زمانے میں سول ڈیفنس کی ٹریننگ لینی چاہتے ہیں وہ اپنے نام لکھوادیں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے آخر میں اس کی وضاحت فرمادی کہ ان تیاریوں کا تعلیم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے، تعلیم معمول کے مطابق جاری رہے گی اور اگر کوئی یہ عذر کرے گا کہ ان دفاعی سرگرمیوں کی وجہ سے کوئی تعلیمی کام پورا نہیں ہوا ہے تو یہ عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔

مراسلہ بسلسلہ مضمون

"مولانا فضل حق خیرآبادی"

مکرمی، تسلیم

نومبر ۶۲ء کے "جامعہ" میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی پر مولانا امداد صابری کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں صفحہ ۲۶۹ پر ایک عجیب اور مضحکہ خیز عبارت نظر سے گزری۔ عبارت یہ ہے: "مولانا فضل حق ..... دریا پار گئے، جنگلوں میں سے گزرے اور بھیکن پور ضلع علی گڑھ میں ۱۸ روز مقیم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے چچا نواب عبدالشکور رئیس بھیکن (پور؟) نے سانگرہ (سانکرہ؟) کے گھاٹ سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروا دیا" اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب عبدالشکور خاں، مولانا فضل حق کے چچا تھے! نہ معلوم یہ ستم ظریفی کاتب کی ہے یا خود مضمون نگار کی۔ مضمون نگار نے پیش نظر پیراگراف کے آخر میں "الثورۃ الہندیۃ" (مؤلفہ مولوی عبدالشاہد خاں شروانی) کا حوالہ دیا ہے۔ کتاب مذکور میں یہ واقعہ ص ۱۰۵ کے حاشیے میں اس طرح درج ہے: "نواب صدریار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ علامہ معہ متعلقین بھیکن پور ضلع علی گڑھ آکر ۱۸ روز رہے، صاحب زادہ مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ ۱۸ یوم کے بعد موصوف کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے ۸ میل ہے اور موصوف اور ان کے عزیزوں کی عمل داری میں واقع تھا اور اب بھی ہے اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروا دیا تھا" اس اقتباس سے واضح ہو جائے گا کہ "موصوف" سے مراد نواب صدریار جنگ بہادر ہیں نہ کہ مولانا فضل حق!

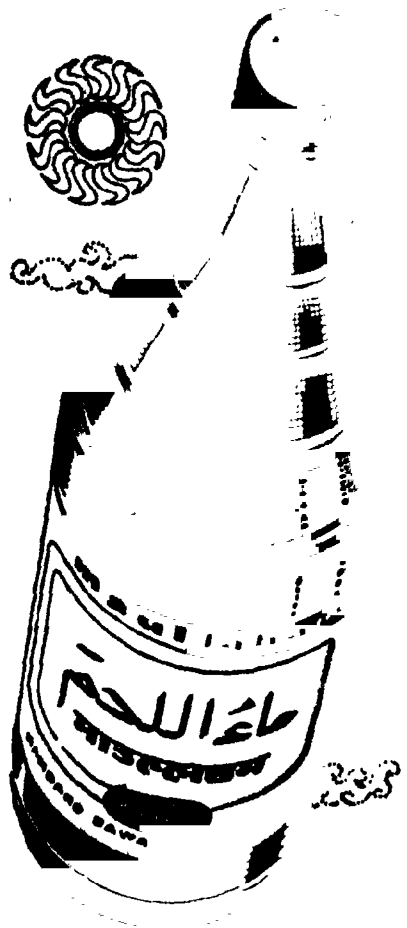
نواب عبدالشکور خاں مرحوم ایک خدا ترس، دیندار اور علم دوست رئیس تھے۔ علماء و صلحائے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ خود بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن دوسروں کی خدمت اپنی استطاعت سے زیادہ فرماتے تھے۔ آپ کے زمانۂ ریاست میں بھیکن پور متعدد نامور علماء و صلحاء کے قدوم سے مشرف ہوا

نواب صدر یار جنگ بہادر کے والد ماجد محمد تقی خاں صاحب مرحوم (جو نواب عبدالشکور خاں کے چھوٹے بھائی تھے) انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں اتنی محبت اور شیفتگی تھی کہ اس کی داستانیں ہمارے خاندان میں آج تک بیان کی جاتی ہیں۔ دونوں بھائیوں کی زندگی میں جائداد مشترک رہی۔ نواب صدر یار جنگ کی تعلیم و تربیت بھی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم ہی نے فرمائی تھی محمد تقی خاں صاحب مرحوم کی وفات پہلے ہو گئی جس کا عبدالشکور خاں صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد دنیا سے دل برداشتہ ہو کر سفر حج پر ایک بڑے قافلے کے ساتھ تشریف لے گئے۔ اس وقت موصوف کے تین صاحب [illegible] ئے حیات تھے لیکن کل جائداد کا انتظام بھتیجے کو سپرد کر کے گئے۔ حج سے فارغ ہو کر واپسی میں جدہ میں سنہ ۱۹۰۱ء میں رحلت فرمائی حد سے بڑھی ہوئی فیاضی کی بدولت جائداد پر کثیر قرض تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا چونکہ محمد تقی خاں صاحب مرحوم انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے اس لئے قرض کی سب دستاویزوں پر تنہا عبدالشکور خاں صاحب کے دستخط تھے۔ وکیلوں نے نواب صدر یار جنگ کو مشورہ دیا کہ تقسیم جائداد کے بعد قرض کا سارا بار عبدالشکور خاں صاحب کے ورثا پر رہے گا، آپ اس سے محفوظ رہیں گے لیکن نواب صاحب نے اسے پسند نہیں فرمایا اور دستاویزوں پر جہاں جہاں عم محترم کے دستخط تھے، ان کے نیچے خود اپنے دستخط فرما دیئے اور پھر پورے عزم و ہمت سے کل قرض جلد از جلد ادا فرمایا۔ یہاں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ نواب صدر یار جنگ فرماتے تھے کہ جب میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوف نے مجھے دعا دی کہ خدا تمہیں قرض کے بار سے سبکدوش کرے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھ پر تو کسی کا قرض نہیں ہے۔ برسوں کے بعد جب مشترک جائداد کے قرض سے واقعی سبکدوش ہوا اس وقت اس دعا کی مصلحت سمجھ میں آئی۔

حبیب منزل علی گڑھ ۹-۱۱-۶۲ نیاز مند ریاض الرحمٰن شروانی

نوٹ: اس مراسلہ کے بعد ہم نے فاضل مضمون نگار سے رجوع کیا۔ موصوف نے لکھا ہے کہ "ماہ نومبر ۱۹۶۲ء کے مولانا فضل حق خیرآبادی کے مضمون میں نواب صدر یار جنگ کے چچا نواب عبدالشکور کی جگہ مولانا فضل کا چچا منزل شرح ہوتا تھا وہ لکھ دیا گیا تھا، جو غلط ہے۔"

ہم فاضل مراسلہ نگار کی اس تصحیح کے شکر گزار ہیں۔ (مرتب)



طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی مطبوعہ یونین پریس دہلی ٹائٹل، دیال پریس دہلی

JANUARY 1963

Regd. No. D-763
The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ	قیمت فی پرچہ
چھ روپے	پچاس نئے پیسے

جلد ۴۸	بابت ماہ فروری ۱۹۶۳ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

تعلیم اور روایتی قدریں

از پروفیسر محمد مجیب   ترجمہ: عبداللطیف اعظمی

آپ اجازت دیں تو پہلے یہ عرض کر دوں کہ سمپوزیم کے عنوان سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے طے کر لیا ہے کہ قدروں کی ماہیت کیا ہے، یہ بھی طے کر لیا ہے کہ تعلیم قدروں کے ساتھ جو چاہے کر سکتی ہے، جو لوگ نصاب بناتے ہیں وہ اپنی صواب دید کے مطابق جس قدر کو چاہیں قائم رکھیں، جسے چاہیں ترک کر دیں، گویا آدمی کو پورا اختیار ہے کہ اپنے عقیدے اور عمل کے بارے میں جو پسند ہو وہ کرے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ہماری زندگی کا ایک روائتی نقشہ تھا جسے سیاسی اور معاشی انقلابوں نے بالکل بگاڑ دیا، لیکن کیا اس کے ساتھ ہماری فطرت بھی بدل گئی، کیا اب ہمارے عمل کو ایسی اخلاقی اور نفسیاتی طاقتیں ڈھالتی ہیں جن کا پہلے وجود نہ تھا؟ کیا ہم قدروں کی حقیقت میں شبہ نہیں پیدا کرتے اگر ہم بعض کو کہیں کہ یہ روایتی ہیں اور بعض کو جدید یا موڈرن ٹھہرائیں؟

"روائتی" کی تو شاید تعریف کی جا سکے، لیکن "موڈرن" کے کیا معنی ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ تھا جب موڈرن سے مراد ایسا شخص ہوتا تھا جو ہر ایسی عادت، عقیدے اور طریقے پر ناک بھوں چڑھائے جو انگریزی نہ ہو، جو انگریزوں کا لباس پہنے اور انھیں کی طرح لوگوں کے ساتھ پیش آئے، جو اس کوشش میں لگا رہے کہ انگریز اسے اپنی صحبتوں میں بلانے کے قابل سمجھیں اور بلائیں، صرف انگلستان اور جرمنی کی بنی ہوئی چیزوں کو خریدنا اور استعمال میں لانا چاہتا ہو، جو اپنی انگریزی کی قابلیت کی نمائش کرتا ہو اور ہندستانی زبانوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہو۔ اب خیال ہوتا ہے کہ موڈرن آدمی وہ ہے جو علمی اور

تہذیبی معاملوں میں دقت پسند ہو، تمام قدروں کو محض نسبتی سمجھتا ہو، عقیدہ اور عمل کے درمیان مطابقت کا ذکر کرنا بھی کٹ حجتی قرار دیتا ہو جس کا دماغ موجودہ دور کی علمی اور صنعتی ترقیوں سے چکرا گیا ہو، جو ہندوستان میں ان تمام ملکوں کے خیالات کو رائج اور تعلیمی اور اصلاحی اداروں کو قائم کرنا چاہتا ہو جو ہندوستانیوں کے لئے مفت سفر اور قیام کا انتظام کرتے ہیں، جو بہت موثر انداز سے ایٹمی جنگ کے ذریعہ انسانیت کے نیست و نابود ہو جانے کے خطرے کو بیان کرسکتا ہو۔ "موڈرن" کا لفظ استعمال کرنے سے ہمارے ذہن کا رُخ کسی غلط سمت میں مڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یقین نہیں رہتا کہ حقیقت اور چیز ہے اور نیا پن یا رواج یا علم کی منڈی کا پسندیدہ مال ہونا اور چیز۔ "موڈرن" کو ہم کسی صورت سے 'دانشمندانہ' یا 'مناسب' یا 'مطابق عقل' کا مرادف قرار نہیں دے سکتے۔ 'موڈرن' کے لفظ کو ہم ایک تاریخی دور کے لئے بے تکلف استعمال کرسکتے ہیں، لیکن قدروں کی بحث میں اس کے استعمال سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہیئے۔

موجودہ نظام تعلیم انیسویں صدی میں بتدریج قائم ہوا اور جس جذبے کے ساتھ اور جس طریقے سے قدیم طرز تعلیم کی جگہ اس کو قائم کیا گیا، اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ یہ تبدیلی کچھ اس طرح عمل میں لائی گئی، جس طرح کسی خاندان کی نو عمر نسل اپنے ان بزرگوں کو جن کے سایۂ عاطفت میں اس نے پرورش پائی ہے، لعنت ملامت کرکے اور ٹھوکریں مار کر گھر سے باہر نکال دے۔ قدیم نظام کی کوئی چیز اس قابل نہیں سمجھی گئی کہ اسے باقی رکھا جائے، کیونکہ اس کی بنیاد سنسکرت یا عربی اور فارسی پر تھی، نیز اس لئے کہ اس کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا تھا وہ بہت محدود اور فرسودہ تھا اور اس بات پر زور دیتا تھا کہ ان عقائد و اعمال کو اپنایا جائے جن میں صدیوں سے تقریباً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ نئی تعلیم کے وسیلے سے جو علم حاصل کیا جاتا تھا، وہ بھی محدود تھا اور چونکہ اس علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ایک بیرونی زبان تھی، اس لئے اس کی ترقی میں ہندوستانیوں کے کسی نمایاں حصے کا سوال بمشکل ہی پیدا ہوتا تھا۔ وہ عقیدے اور وہ اعمال جن کی قدیم نظام میں بڑی اہمیت تھی، اوہام رسومات اور ممنوعات کا ایک پشتارہ تھا۔ نئی تعلیم نے ذہنی برتری کا احساس

پیدا کیا، نئی تعلیم پائے ہوئے لوگ ان ناواقفوں اور اوہام پرستوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتے کہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ مگر اس امر کے اپنے واضح فائدے تھے کہ ایک ہندو اپنے کو ہندو کہتا ہے اور مسلمان اپنے کو مسلمان۔ مذہب نے رفتہ رفتہ وہ شکل اختیار کرلی، جسے ہم آج کل فرقہ واریت کہتے ہیں اور ہم میں سے وہ لوگ جو بہت جلد گھبرا جاتے ہیں وہ اسے ہماری بہت ساری کشیدگیوں کا ایک بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ نئی تعلیم نے ہمیں سبق دیا ہے کہ مذہب کو استعمال کرو بغیر اس کی تعلیمات پر عمل کئے ہوئے، آزادی کے ساتھ سوچے بغیر کسی گہری فکر کے۔ اس نے ان وفاداریوں کو بھی جو ہندوستان میں بنیادی طور پر مذہب کی دین اور غیر مشروط تھیں، رسمی اور کاروباری تعلقات کی شکل دے دی۔ اس نے مختلف رنگوں پر مشتمل زندگی کا ایسا خاکہ تیار کیا، جسے کسی زاویے سے بھی دیکھئے، کوئی تصویر سامنے نہیں آتی۔

اجازت دیجئے کہ کچھ اور کہنے سے پہلے، قدیم نظام تعلیم کے متعلق اپنے خیالات پیش کروں۔ جدید اصطلاح کے مطابق یہ کوئی نظام نہیں تھا، اس طرح کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں نہ تھیں، جیسی کہ آج ہمارے زمانے میں ہیں، اس طرح کا کوئی درجہ وار نصاب تعلیم بھی نہیں تھا، جس سے کہ ہم آشنا ہیں، البتہ یہ طے تھا کہ کونسی کتابیں پڑھنی ہیں اور کس ترتیب کے ساتھ۔ یہ کتابیں یا تو اپنے موضوع کی مسلم اور مستند کتابیں ہوتی تھیں یا مستند کتابوں کی شرحیں اور تمام تر توجہ ان ہی کتابوں پر مرکوز کی جاتی۔ معلومات کے لحاظ سے ان کی حیثیت محدود ہوتی، مگر یہ محض کتابیں نہ ہوتیں، ان کے اثرات اتنے قوی ہوتے کہ انسان کو ان سانچوں میں ڈھال دیتے جنہیں معاشرہ کی سند حاصل ہوتی۔ اپنے اس ذاتی تعلق کی بنا پر جو اُسے اپنے طالب علموں سے ہوتا، ان کے ذہن کی ترقی اور سیرت کی تشکیل کے سلسلہ میں غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا تھا۔ کتاب، استاد اور ماحول یہ سب مل کر عقیدے اور حصول فضیلت کی بنیادی اہمیت کو نوخیز طالب علموں کے ذہن نشین کرتے۔

خود ہمارے زمانے میں بہ مشکل کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم اُن باتوں پر جو ہمارے معیار کے

لحاظ سے صریحاً غلط اور نامناسب تھیں تعصب کی حد تک شدت سے زور دیا جاتا تھا، پھر بھی جو بنیادی اصول پیش نظر رہتا تھا وہ یہ تھا کہ جو کچھ حق، نیک اور احسن ہے اُس کی خدمت میں فکر و عمل کی ساری قوتیں صرف کر دی جائیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اس مفہوم کی تھوڑی وضاحت کر دوں۔ زندگی کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ کبھی نہ بدلنے والے اوائل قوانین کی تابع ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ان قوانین کو بے چون وچرا تسلیم کرے اور پابندی سے ان پر عمل کرے، اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے مادی، ذہنی اور رُوحانی وسائل کو ایک ایسی امانت تصور کرے جس کا ایک دن سختی سے حساب ہوگا۔ اسے احترام اور افہام وتفہیم کا انداز پیدا کرنا اور ایسا طرز عمل اختیار کرنا ہوتا تھا کہ دوسرے اپنے عقیدے کے مطابق آزادی سے عمل کر سکیں اور اس آزادی کو اپنا حق سمجھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علم دین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ لیکن یہ تردید بے اثر ہو جاتی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مروجہ رسم و رواج سے پرے انسانی اور عالمگیر اقدار پر نظر پڑنے لگتی تھی۔ چونکہ مذہب محض چند اصولوں اور نظریوں کا نام نہیں تھا، بلکہ عمل اور سیرت کی تعمیر بھی اس کے مدنظر ہوتی تھی اس لئے تہذیب وثقافت کے نمونوں کی کم وبیش وہی حیثیت ہوتی تھی جو مذہبی احکام کی ہوتی تھی اور اس طرح پوری زندگی قاعدے اور ضابطے اور مستند نمونوں اور مثالوں کے معیار پر جانچی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ اِن قاعدوں کی پروا نہیں کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے کہ آج بہت سے لوگ قانون کی پروا نہیں کرتے، مگر مہذب وہی شخص سمجھا جاتا تھا جو ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ قدیم قاعدوں اور جدید قوانین میں فرق یہ ہے کہ نئے قوانین بنیادی طور پر منفی ہیں اور ان کا تعلق خاص طور پر اس بات سے ہے کہ غلط کاری کی روک تھام کی جائے لیکن پرانے قاعدے اثباتی تھے، ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انسان کو نیک عمل کی ترغیب ہو، اس نے اپنے

میں صحیح بات کو کرنے اور انھیں صحیح طریقے پر کرنے کے لئے نظیریں موجود تھیں اور ان نظیروں کے جواز کی بنیاد وہ تصورات تھے جو جمالی بھی تھے اور اخلاقی بھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان نظیروں نے روزمرہ کی زندگی کے تمام معمولات کو مذہبی رسوم کی مکمل اور جامع شکل دے دی اور اظہار رائے کو سخت گیر ضابطے کا محکوم بنا دیا گیا، یہاں تک کہ اتفاق اور اختلاف، محبت اور نفرت لذت اور الم کے شدید جذباتی تقاضے اور نفسیاتی ضرورتیں بھی اس بات کا عذر نہیں بن سکتی تھیں کہ مقررہ تہذیبی نمونوں کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہر شخص ہر موقع پر فضیلت کو اپنا مطمح نظر سمجھتا تھا۔ فضیلت اور ہنرمندی کا یہ آئیڈیل اُس زمانے کی مصنوعات مثلاً کپڑے، برتن اور زیورات میں ظاہر ہوا، اس کی جھلک اُس عہد کے ادب میں بھی ملتی ہے۔ کوئی پچاس سال پہلے قدیم خاندانوں کے نونہالوں کے آداب گفتگو، وضع قطع اور اخلاق و عادات میں بھی اِسے دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے فن اور دستکاری کی سرپرستی کو خیرباد کہا اور اپنے کلچر کی پیداوار پر مغربی مشینوں کی پیداوار کو ترجیح دی، ہم نے باور کر لیا ہے کہ اب تہذیب اور شائستگی کو برتنے کی فرصت نہیں ہے، ادیب اور مصنف کچھ کہنا چاہتے ہیں تو محاورے اور روزمرہ کے استعمال کی زحمت گوارا نہیں کرتے، سلوک اور معاملت میں شائستگی اور تمیز کی جگہ ذاتی خوشی اور مفاد نے لے لی ہے، اس طرز عمل اور انداز فکر سے جو انتشار پیدا ہو گیا ہے اُسے ہم عبوری دور کا ایک واقعہ تصور کرتے ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی طرف سے بےپروا ہیں اور ہمیں یہ فکر نہیں ہے کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔

لیکن تعلیم کے سلسلے میں جو مسائل اُبھرے ہیں، وہ پہلے ہی سے تشویش ناک ہیں اور عدم مداخلت کے اصول پر مزید عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم اور جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی کمیٹیاں اس ضرورت کا احساس دلاتی ہیں کہ اس سلسلے میں عزم و ارادے کے ساتھ مثبت اقدامات کئے جائیں۔

رومن کیتھولک چرچ ایک مثال ہے ایسے مذہب کی جس نے ایک ادارہ کی شکل اختیار کرلی ہو، یہ مذہب ایسے تمام رجحانات کو جو عقیدے کو بگاڑتے ہیں، چیلنج کرتا ہے اور انھیں باطل قرار دے کر ان کا زور توڑتا رہتا ہے۔

کمیونزم نے ایک خاص عقیدہ کی جبری تعلیم کی مثالیں پیش کی ہیں، لیکن واضح اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی مثال ہمارے لئے مفید نہیں، رواجی مذہب کو، جیسا کہ یہ ہندوستان میں رہا ہے، دوبارہ رائج کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں اور احیار کی تحریکوں نے عام طور پر تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے اور زمانے کے اصل تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ہم نے مذہب کو ـــ لیکن فرقہ پرستی کو نہیں ـــ اپنے بس بھر تعلیمی اداروں سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا، لیکن اب ہم اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کسی مشترک عقیدے کے بغیر منظم اور صحت مند زندگی ممکن ہے؟ کیا ہمارے دستور کے آدرشوں کو حقیقت کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے، اگر ہم سرد مہری کے ساتھ ان کو مانتے ہوں، جس طرح بے دلی کے ساتھ سچّائی اور دیانت کو مانتے ہیں؟ کیا قانون سازی اور کسی مخصوص سیاسی پارٹی کی حکمرانی کے ذریعہ اشتراکی سماج قائم کیا جا سکتا ہے؟ بلا شبہ ان میں سے ہر سوال کا امید افزا جواب دیا جا سکتا ہے، لیکن ایک رجائیت پسند کو بھی موجودہ حالات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا پڑے گا، اگر وہ ٹال مٹول کرنا نہیں چاہتا یا غیر سنجیدہ نہیں ہے۔

یہ بحث و گفتگو کہ ایسی قدروں کے ساتھ جو مذہب اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں تعلیم کا کیا رویہ ہونا چاہیئے، اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک ہم اس عظیم ترین تبدیلی کی اہمیت کو تسلیم نہ کریں جو ہمارے ملک میں ہوئی ہے ـــ ایک آزاد قومی ریاست کا قیام، ایسی ریاست جو مستحق ہے موثر وفاداری کی، مستعد خدمت کی اور اس معیاری شہری ڈیوٹی کی جو خود شہریوں کے باہمی تعاون اور شہریوں اور انتظامیہ

(ایڈمنسٹریشن) کے باہمی اشتراک کے لئے ضروری ہے۔

یہ بالکل اُس شخص پر جو نعروں اور بحثیں یا افتادہ باتوں کے دھوکے میں نہیں آ جاتا
یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ آج بھی ہم ریاست سے وفاداری کا ایک بہت ہی مبہم تصور رکھتے ہیں۔ سیاسی وفاداری ہمارے روایتی اوصاف میں شامل نہیں ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ریاستیں جن کی تاریخ ہماری سیاسی تاریخ ہے، درحقیقت اقلیتوں کی حکومتیں تھیں جن کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ جمہوری طرز حکومت کی دریافت سے پہلے دنیا کی ساری حکومتوں کا یہی حال تھا۔ اور آج بھی تمام جمہوریتوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اکثریت کی ایسی حکومتیں ہیں جن کی باگ ڈور اُن اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے جو یہ ثابت کر سکتی ہیں کہ وہ عوام کے مشترک اور حقیقی مفاد کی نمائندہ ہیں۔ لیکن مغربی جمہوری حکومتوں میں وفاداری کے جذبے کی جڑیں اس قدر گہری ہیں کہ اختلاف آراء کے باوجود قومی اتحاد قائم ہے، ہندوستان میں بدقسمتی سے، خود نظام تعلیم، جسے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور اس کو ترقی دینا چاہیے، اس کو کمزور کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ انگریزی حکومت کو، جس نے جدید تعلیم کو رائج کیا، ایسے ماتحت افسروں کی ضرورت تھی، جو انگریزی سے واقف ہوں۔ ایڈمنسٹریشن کی توسیع، امتیازی قاعدوں کے برتنے میں نرمی اور رعایت، ملازمت اور ترقی کے قاعدے اور طریقے نے ہندوستانیوں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا لیکن وہ نہ تو عوام کے سامنے جواب دہ تھے اور نہ حکمراں طبقہ کے پوری طرح رکن ہی بن سکے

موجودہ صدی کے آغاز سے ہی وفاداری رفتہ رفتہ سیاسی گالی کی ایک اصطلاح بنتی گئی، کیونکہ اس کے معنی تھے بیرونی طاقت کے مفاد میں شرکت کے۔ ۱۹۴۷ء سے چند سال پہلے کا زمانہ، جب یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان آزاد اور حکمراں ریاست کی حیثیت اختیار کرلے گا اس ذہنیت میں اُس انقلابی تبدیلی کے لئے جو ضروری تھی، رنا کافی تھا۔ جدید تعلیم کے جلو میں اُس ہندوستانی تاریخ و تہذیب کی نئی تشریحیں بھی اُبھریں جنھوں نے ہندوستانی قوم کو ہندوؤں مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ ان کے دلوں میں نفرت و حسد کا مقام

کے جذبات جاگزیں ہو گئے۔ اور اس چیز نے پوری کامیابی کے ساتھ اُن جذبات کی نشوونما کو روک دیا جو کسی مخصوص جماعت کے بجائے پوری ہندوستانی قوم کو اپنے اثر میں لے لیتا۔

اگر تعلیم کا مقصد قدروں کی از سرِ نو تاویل و توضیح کرنا اور اس طرح اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنا ہے تو اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ تمام ممکن ذرائع سے یہ عقیدہ جاگزیں کرے کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور تمام ہندوستانی ایک قوم۔ اتحاد اور یکجہتی ایسے الفاظ ہیں جنہیں ہر شخص دہراتا رہتا ہے، لیکن اگر جرح اور جانچ کی جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو لوگ اتحاد اور یکجہتی کی باتیں کرتے ہیں' ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو اس "ضروری فریب" کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ سے واقف ہیں اور حقیقت پسند ہیں تو سمجھ جائیں گے کہ اشوک اور اکبر جیسے چند بادشاہوں اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے چند واقعات کا تذکرہ اتحاد اور یکجہتی کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ چھوٹے اور بڑے فرقوں کی ذہنی اور مذہبی علیحدگی پسندی، ریاستوں اور مذہبوں کی کش مکش تقریباً مسلسل رہی ہے۔ ہم صرف اسی وقت متحد ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے اندر انفرادی طور پر اور ہم آہنگی کے ساتھ اپنی طبیعت اور ذوق کے مطابق اتحاد کے لئے ایک فعال جوش اور ولولہ پیدا کریں، جو ہمارے گناہوں اور غلطیوں کے اخلاقی بوجھ کو اٹھا سکے۔ یہ پہلا قدم ہے اپنے گناہوں پر پشیمان ہونا۔ ہم نیکی کی اصلیت سے صرف اسی وقت واقف ہو سکیں گے جب ہمارے احساس شرمندگی میں خلوص ہوگا۔

اتحاد کے لئے اس طریق کار کو اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مقدس کام اور اس میں کامیابی صرف اسی وقت ہوگی جب دینداری اور تقویٰ کی روایات سے جو ہماری تاریخ کا ایک جزو ہیں، غذا اور طاقت حاصل کی جائے۔ یہ اعلان کہ ہماری

ریاست سیکولر ہو گی، ہر شہری کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اپنے رسمی مذہب سے فیضان حاصل کرکے شہری زندگی کو مالا مال کر سکتا ہے۔ سیکولرزم تعلیم کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اس نظریے ـــ امید یا خواب ـــ کو کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر ایک ہیں، واضح شکل میں پیش کرے۔ ریاست کے وسائل مذہبی تعلیم کے لئے استعمال نہیں کئے جائیں گے، بلکہ انھیں نو خیز دماغوں میں ایسے عقائد کے اوصاف جاگزیں کرنے پر صرف کیا جائے گا جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے اگر یہ ممکن ہوتا کہ مختلف مذاہب کی اخلاقی تعلیمات سے جو تصورات وابستہ ہیں اُن سے صرف نظر کرکے کوئی اخلاقی نقطۂ بحث مل سکے تو پھر مذہب یا عقیدہ کے ذکر کی ضرورت نہ ہوتی، تاریخی حقائق کا ایک سلسلہ ہے، ان میں ایک تلازم ہے، ایک مرکزیت ہے جو ہمیں ایک جگہ قائم رکھتی ہے، یہ چیز اگر نہ ہوتو انسان جلدی ہی اپنائے ہوئے نظریوں کے گورکھ دھندے میں بھٹکتا رہتا ہے ـــ اگر تعلیم غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرے، احترام کے جذبے کو پروان چڑھائے اور تعیین کی ضرورت کا احساس دلائے تو اس سے مذہبی و اخلاقی تعلیم کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔

دوسری روایتی قدر جس کا میں نے ذکر کیا ہے، افضلیت تھی۔ تعلیم کے قدیم نظام کا فرض تھا کہ وہ افضلیت کو برقرار رکھے ـــ افضلیت گفتگو میں، سلوک میں، سعی و عمل میں اور شخصی تعلقات کو مفید بنانے میں، اس قدیم خوبی کو ہم دوبارہ رائج نہیں کر سکتے، نہ صرف اس لئے کہ وہ ختم ہو چکی ہے، بلکہ اس لئے کہ محض کسی چیز کا احیا، ایک قسم کی نقالی ہے اور انسان کو سماجی بے قاعدگی کا مرتکب بنا تا ہے۔ ہمارے افضلیت کے نئے تصور کے دو نظریے ہونا چاہیئے کہ حسن سے خواہ وہ کہیں بھی ملے، ماضی میں یا حال میں فیضان حاصل کیا جائے حسن کے تشخص کو ضرورت کی قدر عطا کرے۔

اگر تعلیم تلاش و جستجو کے ذریعہ ذاتی طور پر اطمینان بخش ترقی پذیر غور و فکر کی اور اجتماعی طور پر محرک عقیدوں کی دہری ذمہ داریاں قبول کرے اور افضلیت کے تصورات کو فرض کی انجام دہی اور تعلقات کے پیدا کرنے اور ان کو قائم رکھنے کے لئے بروئے کار لائے، تو وہ تحقیق انکشاف اور تشخیص کے مناسب حدود میں رہے گی، بلکہ وہ اپنے حدود کو وسعت دے کر زندگی اور طور طریق کے ضروری امور کو، جنھیں اب تک نظر انداز کیا گیا ہے، شامل کریگی۔ روزگار اور ملازمت کے معاملہ میں بھی یہ اپنی قدر کو نہیں کھوئے گی، بلکہ ہندوستانی شہریوں کے بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

احمد نگر کی ملکہ چاند سلطانہ
کی
موت کس طرح ہوئی؟

جناب محمد نصیر الدین ہاشمی

مہاراشٹر کا شہر احمد نگر نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہاں اصلی کانگریسی ارباب حل وعقد یورپ کی گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں نظر بند رہے تھے اور دکن کی خود مختار حکومتوں میں احمد نگر نظام شاہی حکومت کا پائے تخت بنا ہوا تھا۔ نظام شاہی حکومت کو دکن میں کئی وجوہ سے خصوصیت حاصل ہے۔ اول تو یہ کہ ملک احمد نظام الملک دکن کا ہی باشندہ تھا وہ دوسرے دکنی حکمرانوں کی طرح باہر سے نہیں آیا تھا وہ دکنی سپوت تھا جو اپنے حسن خدمات۔ دیانت دارانہ کارگزاریوں۔ بہترین سلیقہ کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے بہمنی دور حکومت میں صوبہ احمد نگر کا صوبیدار بن گیا تھا۔ اور سلطنت بہمنی کے شیرازہ حکومت کے منتشر ہونے پر دوسرے صوبہ داروں کے خود مختار ہو جانے پر اس نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شاہ طاہر جیسے صاحب علم وفضل اللہ مجتہد عصر نے ایران سے آکر یہاں اشاعت علم و فن میں حصہ لیا تھا۔ علامہ شاہ طاہر کے تبحر علمی کا نہ صرف دکن میں غلغلہ تھا بلکہ ایران میں بھی آپ کی مجتہدی کا احترام کیا جاتا تھا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ شمالی ہند کی مغلیہ حکومت کا مقابلہ سب سے پہلے اسی نظام شاہی حکومت سے ہوا۔ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ احمد نگر کی چھوٹی سی حکومت نے جس طرح بہادری اور شجاعت سے کیا تھا وہ تاریخ کے صفحات سے پوشیدہ نہیں ہے۔ احمد نگر کو عرصہ دراز تک محاصرہ کئے ہوئے مغلیہ فوج لڑتی رہی اور کئی مرتبہ مغلوں کو چاند سلطانہ نے پسپا کر دیا تھا اس کی دلیری اور چال بازی کا دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ چاند سلطانہ نے اپنے کارناموں سے تاریخ دکن میں عورت کے نام کو زندگی جاوید دے دی ہے۔ چاند سلطانہ

نظام شاہی حکومت کی شہزادی عادل شاہی حکومت کی ملکہ تھی مگر اپنے شوہر علی عادل شاہ اول کے انتقال کے بعد احمد نگر آکر اپنی آبائی حکومت نظام شاہی کو بچانے کے لئے مغلوں کے خلاف جس طرح لڑتی رہی وہ تاریخ دکن کی درخشاں مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چاند سلطانہ نے اپنی جواں مردی۔ جانبازی۔ شجاعت اور دلیری اور مردانگی کے جو کارنامے تاریخ دکن میں نہیں بلکہ تاریخ ہند میں ثبت کئے ہیں ان کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ دکن والے فخر اور ناز کر سکتے ہیں۔

دکن کے لئے چاند سلطانہ دہلی کی ملکہ رضیہ سلطانہ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے لیکن تعجب ہے کہ اب تک اس بہادر اور دلاور ملکہ کی موت کی وجہ صحیح طور پر متعین نہیں ہوئی ہے۔ احمد نگر کے بعض مورخین نے اس کو تیزاب سے لبریز کنویں میں گر کر خودکشی کرنے کی صراحت کی ہے اور بعض ایک باغی امیر سے لڑ کر شہید ہونے کی صراحت کرتے ہیں بیجاپوری اور مغلیہ مورخین آخر الذکر رائے سے متفق ہیں۔

قدیم مورخین سے قطع نظر بیسویں صدی کے مورخین میں بھی اختلاف ہے کسی نے ایک گروہ کی تائید کی ہے اور کئی مورخین کو دوسرے خیال سے اتفاق ہے۔

اس لئے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے سنجیدگی اور پوری احتیاط کے ساتھ حالات اور واقعات پر غور کرتے ہوئے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ احمد نگر کے مورخین میں قاضی شہاب الدین صاحب تاریخ شہابی۔ امیر علی مصنف تاریخ احمد نگر اور قاضی عبدالغنی مولف جامع العلوم نے اس امر سے اتفاق کیا ہے کہ چاند سلطانہ تیزاب کے کنویں میں گر کر جاں بحق ہوئی۔ چنانچہ ایک عالیہ مولف سید احمد اللہ قادری نے اپنی کتاب "سوانح چاند بی بی" میں ان اصحاب کے خیالات کو نقل کرتے ہوئے احمد نگری مورخ ہونے کے لحاظ سے اسی خیال کی تائید کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

" مغل جب قلعہ میں داخل ہوئے تو چاند بی بی نے ایک باؤلی کو تیزاب سے بھروایا

اسی میں غرق ہو کر جان بحق ہو گئی "   (صفحہ ۱۶)

اس کے بعد جامع العلوم کے ضمیمہ جلد اول کی بصراحت نقل کی ہے۔ جو یہ ہے :۔

" چاند بی بی کہ در حسن وجمال وسیرت وصورت بہ آفتاب وماہتاب ہمسری داشت واطوار شکریاں دہلی چنیں مرکوز خاطر آں خدیو گہیاں عصمت وعفت شدہ بود کہ اگر بدست آنہاں افتد عفت او نخواہد ماند ازاں جہت درخم بزرگ کہ پُر از تیزاب آب گندک نمود بود خود را انداخت دو ظرفۃ العین لاش گرد ہذا قالب او بعد موت ہم از نظر نامحرماں محفوظ ماند "   (سوانح چاند بی بی، صفحہ ۸۱)

احمد نگر کی مشہور تاریخ "برہان الماثر" جو اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھی گئی ہے اس میں اس اہم واقعہ کی صراحت نہیں ہے بلکہ مولف نے اس کو مغلیہ حملہ پر ہی ختم کر دیا ہے حالانکہ جب چاند سلطانہ کی موت کے بعد اس کی ترتیب ہوئی ہے تو اس میں اس کا تذکرہ کر کے صرف حملے کے واقعات پر ختم کر دینا خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی مزید صراحت آگے آتی ہے۔ اس کے بعد بیجا پور اور مغلیہ مورخین کی صراحت ملاحظہ ہو۔ بیجا پور کے مشہور مورخ فرشتہ نے جو صراحت کی ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

" شاہزادہ (دانیال) اور دیگر اکبری امیروں نے بلا کسی خدشہ کے قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا اور امیروں نے مورچل تقسیم کئے۔ شاہزادہ دانیال وخانخان وسید یوسف وغیرہ نے مورچل کی طرف سے نقب کھودنے لگے جب قلعہ قریب فتح کے ہوا تو چاند سلطانہ نے چیتخاں خواجہ سرا سے کہا کہ آہنگ خان اور دیگر امرا نے اس قدر سرکشی کی کہ ان کی شامت اعمال سے خود اکبر بادشاہ دکن فتح کرنے کے لئے آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قلعہ بھی چند روز میں سر ہو جائے گا جیتہ خاں نے جواب دیا کہ گزشتہ کا کیا ذکر ہے اب جو حکم ہو اس کے موافق عمل کیا جائے۔ چاند سلطانہ نے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ ہم یہ قلعہ شاہزادہ دانیال کو سپرد کر کے اپنی عزت وجان کو

بچائیں اور چینبر روانہ ہو جائیں اور وہاں قیام کر کے خدا کی مدد کا انتظار کریں۔ چیتہ خان نے تمام اہل قلعہ کو جمع کر کے بہ آواز بلند کہا کہ چاند سلطانہ نے اکبری امیروں سے سازش کر کے یہ ارادہ کیا ہے کہ قلعہ شاہزادہ دانیال کے سپرد کر دے۔ اہل دکن یہ خبر سنتے ہی حرم سرا میں گھس آئے اور انھوں نے بڑی تکلیف و ظلم کے ساتھ چاند سلطانہ کو قتل کر ڈالا۔ اکبری لشکر میں نقیب تیار ہوئی اور قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی۔ مغل فوج قلعہ کے اندر داخل ہوئی اور جوان بوڑھے بچے سب قید کر لئے گئے۔"

(ترجمہ تاریخ فرشتہ جامعہ عثمانیہ جلد چہارم صفحہ ۳۱۰)

اس کے ساتھ مغلیہ مورخین کے رائیں بھی اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں چنانچہ ابوالفضل نے اکبر نامے میں اور بختاور خاں نے اپنی تاریخ مرأۃ العالم میں حسب ذیل صراحت کی ہے :۔

" شاہ رخ مرزا خانخاناں مرزا یوسف خاں میر مرتضیٰ جگناتھ شیر خواجہ مرزا علی بیگ خواجہ بیگ مرزا اعتبار خاں کچک خواجہ محمد خاں و دیگر را مردان چاند بی بی بہ تازہ کاری پیماں برنشست۔ ازیں آگہی چیتہ خاں خواجہ سرائے یا برخے در دنی بہ گوہراں گزیں با نوراجاں بہ شکرد۔ و بیادری اعتبار خاں و میر صفی و مرزا تقی و حاجی محمد تریا ندانہ ی فرا پیش گرفت۔" (اکبر نامہ۔ ابوالفضل فیضی جلد سوم مطبوعہ دہلی صفحہ ۵۳۶)

" دریں وقت قلعہ احمد نگر بہ حسن سعی شاہزادہ دانیال مفتوح گشت و ناسک بہ تصرف آمد۔ و در آں زمانہ کہ تزلزل بہ ارکان قلعہ احمد نگر راہ من یافت چیتہ خاں نام غلام حبشی چاند بی بی را ضائع ساخت۔" (مراۃ العالم۔ قلمی۔ مولفہ محمد بختاور خاں خواجہ سرائے۔ تالیف ۱۰۷۸ھ صفحہ ۲۰۶)

خافی خاں نے اپنی کتاب کے پہلے حصہ میں اگرچہ خودکشی کی صراحت کی ہے لیکن منتخب اللباب کے

تیسرے حصے میں وہ صاف طور سے مختار خاں وغیرہ کے خیال کی تائید کرتا ہے چنانچہ لکھتا ہے :۔

" و شاہزادہ دانیال و خانخاناں کہ بعد تردداتِ و کوشش و کشش بسیار کار بر چاند بی بی تنگ ساختند در اکبر نامہ و تاریخ فرشتہ بہ شرح و بسط درج است۔ بہ روایتی چاند بی بی بعد از ملاحظہ آنکہ کار از دست رفتہ بہ تدبیری در ہلاک خود کوشید کہ احدی واقعی بر احوال او مطلع نہ گردید و اقوال مختلف دریں باب زبان زد کہن سالان دکن گردیدہ بود ... "

۱۔ (منتخب اللباب محمد ہاشم علی خافی خاں حصہ اول صفحہ ۲۱۵)

" از آں جماعہ چیتہ خاں خواجہ سرائے کہ مرضیِ چاند سلطانہ را بر سپردن قلعہ و طلبیدن امان اطلاع یافت بہ فریاد و شورش آمدہ ندائے علم نمود کہ چاند سلطانہ با سرداران چغتیہ ساختہ می خواہد کہ قلعہ را بہ منصوبان محمد اکبر بہ دہد و ہمہ اتفاق نمودہ غرہ محرم سنہ ۱۰۰۹ھ ہزار و نہ ہجری با شمشیر ہائے برہنہ بہ حرم سرائے چاند بی بی در آمدہ بہ زخمہائے پیاپے آں مظلومہ را شربت شہادت چشانندند۔ و آنکہ شہرت عام دارد و بر السنہ مردم دکن جاری است کہ چاند سلطانہ خود را در باولی انداختہ مفقود الاثر گردید خلاف متون تاریخ فرشتہ و شہرت دادہ دکنیاں است۔" (ایضاً۔ حصہ سوم صفحہ ۲۶۲)

قدیم مورخین کے بعد صمصام الملک شاہ نواز خاں نے ماثر الامرا میں اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ چاند سلطانہ بہادری سے اپنے امرا سے لڑتی ہوئی شہید ہوئی ہے اور تاریخ ماہنامہ کی صراحت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے :۔

" و دکنیان کوتہ اندیش حماقت کیش خیال خام کردند کہ از کشتن آں مخدرہ تتق عصمت بہ آنہا مسلم و بر قرار خواہد ماند۔ بنا بر آں غرہ محرم محترم ۱۰۰۹ھ با جمعی از دکنیاں بیایمان در محل حرم سرا آمدہ آں زہرہ فلک عصمت را بہ زجر و عقوبت تمام شربت شہادت چشانیدند۔"

(تاریخ دل افروز " موسوم بہ ماہنامہ غلام حسین خاں جوہر قلمی صفحہ ۲۴۰)

یہ تمام فارسی تاریخوں کی صراحت ہے۔ اب اُردو مورخین نے جو صراحت کی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔
سب سے پہلے غلام امان خاں جو شمس الامرا اور رشید الدین خاں کا متوسل تھا اپنی تاریخ رشید الدین خانی میں
حسب ذیل صراحت کرتا ہے :۔

"شہزادہ دانیال نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اس وقت چاند سلطانہ ناچار ہو کر چاہا کہ قلعہ
شہزادہ کو دے دے اور جان اور ناموس کو امن لینا۔ چیتہ خاں خواجہ سرائے باہر آکر
روبرو دکھنیوں نے یہ بات کہی کہ سلطانہ کا ارادہ ایسا ہے۔ جہلا اس امر کو برا جان کر غرہ محرم
۱۰۰۹ھ بلا تامل حرم سرا میں گھس آئے اور نادانی سے اپنی بلقیس ثانی کو کاری زخم پہنچا کر
شہید کیا۔" (مطبوعہ ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۰۱)

غلام امان خاں کے بعد عبد الغفور خاں نے جنھوں نے سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تاریخ دکن کی کئی جلدیں
مرتب کی ہیں حسب ذیل وضاحت کی ہے :۔

"اس وقت قلعہ میں چیتہ خاں حبشی بڑا سردار تھا۔ چاند سلطانہ نے بلا کر جب اس سے اپنی رائے
ظاہر کی تو اس نا معقول نے بلا مال اندیشی ایک شور مچا دیا کہ چاند سلطانہ مغلوں سے مل گئی
ہے اور چاہتی ہے کہ قلعہ ان کو دے دے چونکہ چاند سلطانہ نے پہلے برار کا علاقہ مغلوں
کو دے کر صلح کر لی تھی اس کی بدنامی نظام شاہی سرداروں کے دل سے ابھی مٹی نہیں
تھی بلکہ چاند سلطانہ کے ذمے سب سے بڑا یہی قصور لگا کر اس سے بغاوت کی جاتی تھی
اگرچہ یہ الزام ان کا محض بے عقلی سے تھا مگر جہاں بے عقلی کو کون دور کر سکتا ہے اس
بات کے کہتے ہی سب نے چاند سلطانہ کو پکا مجرم تصور کیا اور بلوہ مچا کر حرم سرا میں گھس
پڑے اور اس عاقلہ اور مصلحت اندیش کو بڑی بری طرح مار ڈالا۔"

(سلسلہ آصفیہ تاریخ دکن جلد ۳، صفحہ ۲۰۸)

حیدر آباد کے ایک دوسرے مورخ مولوی محمد مرتضیٰ نے اپنی کتاب "عہد سلف" میں اس
سے اتفاق کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"چاند بی بی کا نام تاریخ میں یادگار ہے جس نے مغلیہ فوج کی مدافعت کی لیکن طاقت اور خوش نظمی کے مقابلہ میں محض جوش بدنظمی کو فرو نہیں کرسکتا۔ چاند بی بی کا ایک حبشی نے کام تمام کردیا۔" (صفحہ ۱۰۷)

اس سلسلہ میں ڈاکٹر حفیظ سید نے اپنے مضمون میں جو رسالہ زمانہ کانپور بابتہ ماہ جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا ہے حسب ذیل صراحت فرمائی ہے۔

موصوف نے اس مضمون کو اکبر نامہ۔ تاریخ فرشتہ وغیرہ سے مدد لے کر مرتب کیا ہے اور مضمون میں ماخذ کے حوالے درج کردیئے ہیں چنانچہ وہ صراحت کرتے ہیں:۔

"اپریل ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمد نگر کا محاصرہ کرکے سرنگ لگانی شروع کردی چاند بی بی نے مشورہ کے لئے حامد خاں خواجہ سرا کو بلایا۔ یہ قلعہ کا سربرآوردہ افسر تھا۔ اور اس جنگ میں مرمٹنے کے لئے تیار تھا۔ چاند بی بی نے دیکھا کہ اس محاصرے کا مقابلہ ناممکن ہے تو اس نے مغلوں سے مصالحت کرنی چاہی تاکہ وہ قلعہ سے محاصرہ اٹھالیں اور چاند بی بی نوعمر بادشاہ کے ساتھ جونا چلی جائے۔ اور اس ارادہ سے باخبر ہوکر حامد خاں نے تمام شہر میں چاند بی بی کے مغلوں سے مل جانے کی خبر مشہور کردی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے لگا کہ چاند بی بی کے تمام سردار شہنشاہی فوج سے مل گئے اس سے دکھنی فوجوں میں شبہات پیدا ہوگئے اور غصہ کی حالت میں سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے حامد خاں کی رہنمائی میں محل پر حملہ آور ہوئے۔ ملکہ کو دیوان عام میں نہ پاکر سب لوگ محل کے اندر جہاں ملکہ موجود تھی پہنچ گئے اس منظر کو دیکھتے ہی چاند بی بی اپنا انجام سمجھ گئی۔ اس نے نہایت دلیری سے ان کا مقابلہ اور ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہا لیکن جوش غضب میں لوگوں کی عقلوں پر پردے پڑ گئے اور کسی نے اس کی ایک نہ سنی برابر یورش کرتے رہے۔ حامد خاں نے ملکہ پر وار کیا پھر ملکہ زخموں سے چور ہوکر گر پڑی اور اس کی روح قفس عنصری سے

پروازِ گرگئی : (صفحہ ۷۵)

اس کے ساتھ ایک انگریز مورخ کی رائے ملاحظہ ہو :-

"Hearing this Hamid Khan ran into the streets, declaring that Chand Sultana was in treaty with the Moghals for the delivery of the fort. The shortsighted and ungrateful Dakanis, headed by Hamid Khan, rushed into her private rooms and put her to death..."

(Bombay Gazetteers-1888 Vol. XVII-Chapter VII-Page 386)

" یہ سن کر حامد خاں باہر نکل پڑا اور شور مچا مچا کر اس کا اعلان کرنے لگا کہ چاند سلطانہ نے مغلوں سے صلح کرلی ہے اور قلعہ ان کے حوالہ کرنا چاہتی ہے ۔ کم اندیش اور ناشکرگزار دکنی جن کا سرغنہ حامد خاں تھا ، اس کے محل سرا میں گھس گئے اور اُسے قتل کرڈالا "

(بمبئی گزیٹرز ، ۱۸۸۸ء جلد ۱۷، باب ہفتم ، صفحہ ۳۸۶)

احمد اللہ قادری صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ احمد نگر کے مورخین کے خلاف بیجا پور کے مورخین کی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی ۔ اس لئے خودکشی زیادہ صحیح ہوسکتی ہے ۔ مگر اس کے بطلان کے لئے کئی اہم امور غور طلب ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔

(۱) جہاں احمد نگر کے بعض مورخین خودکشی کی صراحت کرتے ہیں وہاں چند مورخین نے باغی امرائے کے ہاتھ ہلاک ہونے کی بھی تائید کی ہے ۔ چنانچہ بختاور خاں اپنے چشم دید حالات کے طور پر اس واقعہ کی صراحت کرتا ہے اور اس کی تصنیف چاند سلطانہ کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوئی ہے ۔ اس لئے بختاور خاں کے بیان کو بہت زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے ۔

(۲) مقامی مورخ اگرچہ صحیح حالات لکھ سکتے ہیں مگر یہ امر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مقامی مورخین کو حکومت کا خوف بھی دامن گیر رہا کرتا ہے اور اپنے زمانے کے ارباب حل وعقد کے

خیالات کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ وہ اصل واقعات کو قصداً نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کو دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں جو زمانہ ما بعد کے آنے والوں کو صحیح تو معلوم ہوجاتے ہیں مگر اصلیت کے منافی ہوتے ہیں اور اصل واقعہ کی پردہ پوشی ہوکر دوسرے رنگ میں سامنے آتی ہے۔

چاند بی بی کو قتل کرنے والے غدار امرا نے چاند بی بی کو قتل کرکے خود کو عوام کا محافظ اور نظام شاہی حکومت کا طرفدار ثابت کیا تھا اس لئے اس وقت کے مورخ مجبور تھے کہ اصل واقعہ پر پردہ ڈال کر خودکشی کی داستان قلم بند کردیں تاکہ ایک طرح سے چاند بی بی کی اصلی موت پوشیدہ رہے اور دوسری طرف غداروں کے کرتوت پر پردہ پڑجائے۔

اس قسم کے حالات ہر زمانہ کے مورخ پر گذرتے ہیں مثلاً حیدرآباد میں قطب شاہی مورخ سلطان قلی اور بھاگ متی کے حالات ظاہر نہیں کرتے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی جو تاریخیں انگریزوں کے زمانہ میں قلم بند ہوئی ہیں۔ اور جنگ آزادی کی جو داستان انگریزوں کے زمانے میں لکھی گئی وہ اصل واقعات سے جس طرح خلاف ہے وہ چشم بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے خود سلطنت آصفیہ میں بعض واقعات ایسے ہوئے ہیں جن کا تذکرہ تاریخ دکن میں نہیں ہے۔ حالانکہ واقعات صداقت پر مبنی تھے مثلاً ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کا بہادر شاہ ظفر سے خط وکتابت کرنا یا مثلاً میر محبوب علی خاں آصف جاہ کا سردار بیگم (سردار جان طوائف) سے عقد کرنا کسی تاریخ دکن میں نہیں ہے۔

(۳) مشہور مورخ فرشتہ کو غیر متعلق نہیں کہا جاسکتا کیونکہ عرصہ دراز تک فرشتہ کو احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا اور وہ مرتضیٰ نظام شاہ کا مصاحب بنا۔ اس کا باپ نظام شاہی حکومت کے ارباب حل وعقد میں شامل تھا۔ علاوہ ازیں احمد نگر بیجاپور سے کوئی زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا اور تاریخ فرشتہ کی تالیف کے وقت چاند سلطانہ کو واقعہ کو پیش آکر چند سال ہوئے تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ فرشتہ کی واقفیت کو مشتبہ سمجھا جائے جس نے خودکشی کی صراحت نہیں کی بلکہ شہادت کا حال قلم بند کیا ہے

(۴) چاند سلطانہ کے کردار پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ وہ مذہبی عورت تھی جو

احکام کی سختی سے پابندی کرتی تھی چنانچہ جب پہلی مرتبہ مغلوں کے حملوں سے احمد نگر کی فصیل شہر ٹوٹ گئی تھی تو وہ چہرہ پر نقاب ڈال کر دشمنوں سے لڑتی رہی اور اپنے سپاہیوں کو ہمت دلاتی رہی۔ ایسی خاتون کا جو بے پردہ نامحرموں کے سامنے آنے کو مذہب کے خلاف تصور کرتی تھی ، خودکشی کرنا جو مذہب اسلام میں حرام ہے کس طرح قرین قیاس ہو سکتا ہے جب اس کے سامنے دشمن موجود تھے تو ان سے لڑ کر شہادت حاصل کر سکتی تھی۔ شہادت کا مرتبہ حاصل نہ کرکے خودکشی کرنا اور حرام موت مرنا ایک بہادر اور دلاور عورت کبھی پسند نہیں کر سکتی تھی۔

(۵) خافی خاں نے اپنی کتاب میں پہلی مرتبہ اس واقعہ کو اس صورت میں لکھا ہے جو احمد نگر میں عام طور سے مشہور تھا مگر اس نے دوسرے حصہ میں پوری تحقیق کے بعد یہ واقعہ لکھا ہے کہ چاند سلطانہ نے خودکشی نہیں کی بلکہ بہادری سے لڑ کر شہید ہوئی ہے۔ پہلی صورت صرف دکھنیوں کی مشہور کی ہوئی ہے جو صداقت سے دور ہے۔

(۶) چاند بی بی کا اکبر سے صلح کرنے کا ارادہ کرنا تمام مورخین کا تسلیم کردہ ہے۔ خواہ وہ احمد نگر کے ہوں یا بیجاپور کے اور اس خیال کے مخالف امرا بھی موجود تھے اور ان کا مخالفت کرنا بھی ثابت ہے تو پھر ایک بہادر ملکہ کا ان سے مقابلہ نہ کرکے خودکشی کرنا کس طرح باور کیا جا سکتا ہے۔

(۷) احمد نگر کی ایک مشہور اور معتبر تاریخ برہان مآثر ہے اس میں نظام شاہی حکومت کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں اور اس کی تالیف چاند سلطانہ کے موت کے کچھ ہی بعد ہوئی ہے مگر مولف نے اپنی تاریخ کو صرف حملہ کے حالات پر ختم کر دیا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جب اس واقعہ کے بعد اس کتاب کی تالیف ہوئی ہے تو چاند سلطانہ کے موت کو کیوں نہیں بیان کیا گیا اور اس کے پہلے ہی کتاب ختم کر دی گئی۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ برہان مآثر کا مولف صداقت پسند تھا وہ اصل واقعہ کو غلط نہیں لکھ سکتا تھا مگر حکومت کے خوف سے اس نے اپنی تاریخ کو اس واقعہ کے پہلے ہی ختم کر دیا ہے تاکہ اصل حقیقت کو غلط لکھنے کا دھبہ نہ آئے اور حکومت سے لکھا بھی جائے معتقد کی بازپرس سے بری رہے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر میں چاند سلطانہ کی خودکشی غلط قرار دیتا ہوں اور اس کے بہادری سے لڑتے ہوئے جاں بحق ہونے کو تسلیم کرتا ہوں۔

اس سلسلہ میں مہاراشٹر کے مورخین بھی روشنی ڈال سکتے ہیں کیونکہ ان کی رائے قابلِ تصدیق ہو سکتی ہے۔

غزل

حضرت تسکین قریشی

نشاطِ دل کے لئے یہ خیال کم بھی نہیں
کہ تیرے غم کے سوا اور کوئی غم بھی نہیں

وہ میرے دردِ رفاقت کی قدر کیا جانے
جو ہم سفر بھی ہے اور میرا ہم قدم بھی نہیں

میں ہر مقامِ جنوں سے گزر گیا، لیکن
وہاں گرا ہوں، جہاں کوئی پیچ و خم بھی نہیں

کہاں یہ ذکرِ عذاب و ثواب، اے واعظ
کہاں وہ رند جسے ہوشِ بیش و کم بھی نہیں

اک اور دل بھی دھڑکتا ہے میرے دل کے قریب
تمام عمر نہ ہو اب سکوں تو غم بھی نہیں

بنا لیا ہے محبت کو رہنما میں نے
کوئی مقام ہو اب مجھ سے دو قدم بھی نہیں

شکستِ دل ہو مبارک تجھے کہ اے تسکینؔ
ملال ان کو بھی ہے اور تجھ سے کم بھی نہیں

انقلاب مصر کا تاریخی پس منظر

جناب شاہ عبدالقیوم

ایشیا، افریقہ اور یورپ کے درمیان واقع فرعون اور قلوپطرہ کی سرزمین کا نام مصر ہے، جس کی گود میں دریائے نیل کی پرسکون و شاداب وادی میں کپاس کے خوشنما پھول مسکراتے ہیں، جہاں دیو ہیکل اہرام گذرے ہوئے جلیل القدر بادشاہوں کی عظمت و جبروت کی نشان دہی کرتے ہیں، حسن کی بے پناہ قدرتی دولت، علم و تہذیب کے قدیم مرکز، تجارتی منڈیاں، مذاہب کا سنگم اور مشرق و مغرب کی تجارت کے لئے آسان اور مختصر راستے اور اس کے امراء و سلاطین کے عیش و عشرت کی داستانیں، حسن اور رقص و موسیقی کے افسانے ہمیشہ سے دنیا کے حکمرانوں اور امارت پسندوں کے لئے باعث رشک رہے۔ اسی بنا پر جب کبھی کسی نے دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھا ہے، مصر پر قبضہ اس کے لئے پہلی اور ناگزیر منزل رہا ہے۔ فارس، یونان اور روم کے دور اندیش بادشاہوں نے اس ملک کی جغرافیائی، تہذیبی اور تجارتی اہمیت کو ہمیشہ مد نظر رکھا ہے، عربوں اور ترکوں نے بھی اپنی سلطنت کی توسیع و استحکام کے لئے مصر پر ہمیشہ اپنا تسلط قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے جس قوم کے قدم مصر کی سرزمین پر جب تک مضبوطی سے جمے رہے، اس کی عظمت اور وقار پر آنچ نہیں آئی اور جس کا اثر و اقتدار یہاں متزلزل ہوا وہ دنیا کی بساط سیاست پر بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔

نپولین نے بھی مصر کی اس اہمیت کو پوری طرح تسلیم کر لیا تھا۔ انگلستان کی بحری طاقت کو کمزور کرنے، ایشیا و افریقہ کی وسیع دنیا میں فرانسیسی اقتدار کی داغ بیل ڈالنے اور تجارت [illegible] کے لئے ضروری تھا کہ پہلے مصر فتح کیا جائے جو اس وقت ترکی سلطنت کے ایک حصہ کی

حیثیت سے ترک پاشاؤں کے زیر قیادت تھا۔ لیکن یہاں کے پاشا بے حد اپنی سخت گیری اور حکومت
کے معاملات میں بد معاملگی کی بنا پر عوام اور سلطان دونوں کی نظروں میں غیر مقبول تھے۔ نپولین نے مصر کی
اس سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھایا اور ۱۷۹۸ء میں مصر پر فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا۔ اسی وقت
سے مصر کی جدوجہد آزادی، قوم پرستی اور ترقی کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ نپولین اور اس
کے جانشینوں کے خلاف پورا مصر متحد ہو کر اپنی آزادی کے لئے لڑا اور ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی
فوجوں کو اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

آزادی کی اس ابتدائی جنگ میں ترکی اور برطانیہ نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر فرانس
کے خلاف مصر کی پوری مدد کی۔ ترکی نے اس خیال سے مدد کی کہ سلطنت کا ایک اہم صوبہ
ہاتھ سے جا رہا تھا، اور برطانیہ نے اس لئے کہ مصر پر فرانس کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے
ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تجارت کو ہر وقت خطرہ لاحق رہے گا۔

مصر کی اس جنگ آزادی میں ترکی فوج میں ایک البانوی سردار محمد علی بھی تھا جو شروع
سے مصری سیاست کے انتشار، گورنروں کی کمزوریوں اور عوام کی محرومیوں کا مطالعہ کر رہا
تھا اور اس بات کو پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ عثمانی سلطان کا اثر و اقتدار اس صوبہ میں محض
برائے نام ہے۔ چنانچہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، شجاعت اور حکمت عملی سے عوام اور علماء کا
تعاون حاصل کر کے مصر کا گورنر ہو گیا، جسے سلطان نے بھی تسلیم کر لیا۔

مغربی ایشیا کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عوام نے جمہوری انداز میں اپنی
مرضی اور منشاء کے مطابق ایک نااہل اور خود غرض پاشا کو برطرف کر کے کسی دوسرے کو حکومت
کی ذمہ داریاں سونپ دی ہوں۔ اس واقعہ کو ہم مصر کی سیاسی بیداری اور قومی تحریک کی
ابتدا کہہ سکتے ہیں۔

محمد علی نے مصر پر ۴۴ سال حکومت کی، اس عرصہ میں اس نے اپنی ذہانت، [illegible] اور
[illegible] سے مصر کو ایک جدید قوم بنایا۔ اس نے ملک کی [illegible]

[illegible] یورپ ملک پہلی بحری فوج کی تربیت اور جنگی سامان کی فراہمی میں [illegible]
[illegible] کر مصر کی فوجی طاقت کو اتنا بڑھا دیا کہ اپنی حفاظت کے لئے کسی ملک سے [illegible]
لگے، چنانچہ ۱۸۱۸ء میں وہابیہ کے خلاف، ۱۸۲۰ء میں سوڈان میں ۱۸۲۲ء میں یونان
میں اور ۱۸۳۲ء میں شام اور فلسطین کی جنگوں میں محمد علی کی فوجوں نے عظیم الشان معرکے
سر کئے، یہاں تک کہ ۱۸۳۹ء میں سلطان سے ان بن ہو جانے پر مصری فوجیں ترکی
کے دارالخلافہ تک پہنچ گئیں اور قریب تھا کہ عثمانی سلطنت سپر ڈال دے کہ برطانیہ اور
روس مل کر محمد علی کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ان کے خیال میں ترکی سلطنت کی گدی پر
ایک کمزور عثمانی بادشاہ کی بجائے ایک غیور، شجاع اور ترقی پسند سلطان کسی صورت میں
یورپ کی تجارت و سیاست کے لئے مفید نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا محمد علی کو اس شرط پر صلح
کرنا پڑی کہ مصر ایک خود مختار ریاست ہوگا جس کی حکمرانی محمد علی کے خاندان میں محدود
ہوگی۔ گویا مصر اب ایک ماتحت صوبے کی بجائے ایک خود مختار ریاست تسلیم کر لیا گیا۔
اس کے علاوہ محمد علی نے عوام کی معاشی اور تہذیبی حالت کو سدھارنے کے لئے نصاب تعلیم
میں جدید سائنسی علوم شامل کئے اور ذہین نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے لئے یورپی ممالک
بھیجا، اور صنعت و حرفت کو بڑھانے کے لئے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کیں، زراعت
کی بہتری کے لئے آب پاشی کا معقول انتظام کیا اور بڑے پیمانے پر روئی کی کھیتی کے لئے
سرکار نے خود زمینیں حاصل کر لیں۔

لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ ترقی و بہبود کے یہ تمام کام ملک کی طاقت [illegible]
[illegible] محمد علی نے اپنی ذاتی طاقت یا [illegible] کے لئے [illegible] تھے، عوام کو
اگر [illegible] سے فائدہ پہنچا اور ملک نے بحیثیت مجموعی ترقی کی، لیکن در اصل وہ ایک
[illegible] کرنے والا ایک عظیم فاتح [illegible] کے خیال سے [illegible]
[illegible] کے انتقال کے بعد مصر [illegible]

لیکن اس کے تمام جانشینوں نے اپنی نااہلیت، خود غرضی اور عیش کی خاطر ملک کی آزادی غیر ملکی یورپی اقوام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عباس اول نے اپنی سخت گیری اور رجعت پسندی کی بنا پر تعلیم و تعمیر کے تمام منصوبے منسوخ کر دیئے، اسکول اور کارخانے بند کر دیئے۔ لیکن اس کے جانشین محمد سعید نے اس کے برخلاف یورپی باشندوں کو مراعات دیں، ان کی تہذیب و تصورات کو سراہا، یہاں تک کہ ۱۸۵۴ء میں اپنے ایک فرانسیسی دوست ڈی لیسپ کو نہر سوئز کی تعمیر کا ٹھیکہ دے دیا، جبکہ مصر کے سابق حکمران ہمیشہ اس پروجیکٹ کی مخالفت کرتے آئے تھے اور ڈرتے تھے کہ اس نہر کی تعمیر سے مصر کی آزادی کو ہمیشہ سخت خطرہ لاحق رہے گا، اور تاریخ نے اسے سچ ثابت کر دکھایا۔

نہر سوئز کی تعمیر کے ساتھ مصر میں فرانس کے اثرات بڑھنے لگے، چنانچہ برطانیہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ نہر کی تکمیل نہ ہو سکے، لیکن جب نہر بن گئی، اور ۱۸۶۹ء میں جہازرانی کے لئے باقاعدہ کھول دی گئی تب انگلستان نے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا کہ اس کے ذریعہ یورپ اور ایشیا کے درمیان سمندری راستے میں تقریباً پانچ ہزار میل کی کمی ہو جاتی ہے۔ تجارتی سامان کی نقل و حمل آمد و رفت کے علاوہ ہندوستان اور افریقہ کی نوآبادیات کی پوری طرح حفاظت کی جا سکتی ہے چنانچہ اس اہم بحری راستے پر کنٹرول حاصل کرنا برطانوی حکمت عملی کا ایک بڑا مقصد بن گیا۔ اور یہ کام سعید اور اسمٰعیل کی عشرت پسندی، فضول خرچی اور قرض خوری نے بہت آسان کر دیا۔ اپنے محلات کی آرائش، سیر و سیاحت اور تجدید مصر کے مبہم خاکوں میں مغربی تہذیب کے رنگ بھرنے کے منصوبوں کے لئے اس قدر قرض لیا کہ اس کی ادائیگی اور حکومت کی ضروریات کے لئے اسمٰعیل کو اپنی رعایا سے کئی کئی سال کا پیشگی لگان لینا پڑا۔ لیکن جب اس سے بھی خزانے کی حالت میں کوئی بہتری نہ ہو سکی اور مزید قرض لینے کا امکان نہیں رہا تو مجبوراً نہر سوئز کمپنی میں مصر کے حصے کم قیمت پر فروخت کر دیئے جنہیں برطانیہ نے فوراً ہی خرید لیا۔ ان حصوں کے ساتھ گویا پورا ملک بک گیا۔ انگریزوں نے فوراً ہی اپنے قرض کی واپسی کے لئے شاہی خزانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر ترکی سلطان سے دباؤ ڈلوا کر اسمٰعیل پاشا کو برطرف کرا دیا اور اس کی جگہ توفیق کو مصر کا خدیو (گورنر) مقرر کرا دیا جو محض [illegible]

کچھ تھا [illegible] یہاں تک کہ جب ملک کے داخلی و سیاسی معاملات میں بڑھتے ہوئے انگریزوں کے اثرات اور ناجائز مداخلت کے خلاف کرنل عرابی پاشا نے احتجاج کیا تو اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

۱۸۸۲ء میں انگریزوں کی منظم و اعلیٰ فوجی طاقت نے کرنل عرابی کی تحریک آزادی کو کچل دیا، اور ملک کا مکمل انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن آزادی کی لگن بدستور باقی رہی، جائز حقوق اور انصاف کے لئے جو آواز اٹھی تھی وہ اگرچہ وقتی طور پر دب گئی لیکن حریت کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ مصری عوام لارڈ کرومر کی تعلیمی اور معاشی اصلاحات کے باوجود اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے، یہاں تک کہ انہی میں ایک رہنما پیدا ہوا جس کی شجاعت اور دانشمندی نے تحریک آزادی کو باقاعدہ منظم کیا اور دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ جولائی ۱۹۵۲ء کا "شاندار انقلاب" جس نے محمد علی کے خاندان کے آخری تاجدار شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا اور صدہا سال کی غلامی سے ملک کو آزاد کیا، کرنل ناصر اور ان کے ساتھیوں کی حب الوطنی اور قوم پرستی کی مثال ہے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے انگریزوں نے مصر پر اپنے قبضہ کو باقاعدہ قانونی شکل دے دی تھی۔ گویا اس وقت تک مصر ترکی سلطنت کا ہی ایک خودمختار صوبہ تھا، لیکن جنگ عظیم میں چونکہ ترکی انگریزوں کے خلاف جرمنی کے ساتھ تھا، اس لئے مصر کو برطانوی تاج کے زیر نگرانی (PROTECTORATE) رکھا گیا، اور یہ وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے اختتام پر مصر اور دیگر عرب علاقوں کو عثمانی سلطنت سے علیحدہ کر کے آزاد قومی حیثیت دی جائے گی، چنانچہ اسی امید پر شریف مکہ کی قیادت میں انہوں نے ترکی کے خلاف جنگ کی، اور بلاشبہ یہ عربوں کے ہی تعاون کا نتیجہ تھا کہ مغربی ایشیاء اور افریقہ کے محاذ پر انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے پر انگریزوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اور مصر پر اپنا کنٹرول پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیا۔ چنانچہ آزادی کے خواب کو یوں منتشر دیکھ کر مصری عوام کی بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی، معاشی بحران، بے روزگاری اور آزادی کے خیال نے [illegible]
[illegible]

قیادت میں مصر[illegible] ہوگیا۔ جوں جوں انگریز کا ظلم بڑھتا گیا ویسے ویسے وفد کی تحریک میں شدت [illegible] جنگ کے اختتام پر خود حکومت برطانیہ میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے مقبوضات کی [illegible] حالات میں حفاظت کرسکتی، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں حسب ذیل شرائط کے ساتھ مصر کی آزادی کو تسلیم کرنا پڑا،

۱۔ مصر کی بیرونی حملوں سے حفاظت۔

۲۔ برطانوی مفادات کی نگرانی۔

اور ۳، اقلیتوں کے حقوق کی ذمہ داری برطانیہ پر ہوگی۔

۴۔ سوڈان کی آزادی یا مصر سے الحاق کا مسئلہ فی الحال جوں کا توں رہے گا۔

ان شرائط سے اگرچہ مصر کی آزادی بہت محدود ہوجاتی تھی لیکن مصر نے انھیں اس لئے منظور کرلیا کہ مکمل آزادی کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

مشروط آزادی کے اس اعلان کے بعد مصر کو امید تھی کہ ملک میں عدل و انصاف رائج ہوسکیگا اور حکومت جمہوری دستور کی روایات کے مطابق کام کرے گی۔ مگر اس امید پر فواد اول کے رویہ سے اوس پڑگئی۔ فواد ایک ڈکٹیٹر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور اپنے جدِ امجد محمد علی کے انداز میں حکمرانی کے منصوبے بنانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں اس نے دستور میں ایسی تبدیلیاں کردیں جس کی وجہ سے تمام اہم اختیارات سمٹ کر اس کے ہاتھ میں آگئے۔ وفد پارٹی نے جو ۱۹۱۹ء میں سعد زغلول کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی اور اس وقت سے جنگ آزادی کی رہبری کررہی تھی فواد کے ان منصوبوں کی مخالفت کی، لہذا بادشاہ اور وفد میں اقتدار کے لئے جنگ آزمائی ہونے لگی۔ بادشاہ کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی تو وفد کو عوام کی حمایت۔ مگر ۱۹۲۷ء کے بعد [illegible] اثر و اقتدار جاتا رہا۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد نحاس پاشا کی قیادت میں وفد کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوا، اور انگریزوں نے پھر وفد سے مصالحت کو بہتر سمجھا۔

۱۹۳۹ء کے اوائل میں دنیا کو پھر ایک بار جنگ کی تباہیوں سے [illegible]

میں جو صورت جنگ کی وجہ سے مصر کی جغرافیائی اہمیت کا برطانیہ کو خوب اندازہ تھا۔ ایشیاء اور افریقہ میں مورچے قائم کرنے، روس کو رسد پہنچانے اور فوجوں کی تیز نقل و حرکت کے لئے نہر سویز اور مصر کے ہوائی اڈوں پر کنٹرول ناگزیر تھا جو مصر سے دشمنی مول لے کر کبھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ برطانیہ نے نحاس پاشا کے مطالبوں کو منظور کر لیا جو حسب ذیل تھے :-

(۱) برطانیہ مصر کی مکمل آزادی کو تسلیم کرے۔

(۲) سارے ملک میں پھیلی ہوئی برطانوی فوجوں کو صرف نہر سویز کے علاقے میں محدود کیا جائے جن کی تعداد دس ہزار سپاہی اور چار سو ہوا باز سے زیادہ نہ ہو۔

(۳) لیگ آف نیشنز میں مصر کی نمائندگی کا وعدہ کیا جائے۔

(۴) یورپی باشندوں کو جو قانونی، سماجی اور مالی مراعات (CAPITULATIONS) حاصل ہیں وہ ختم کی جائیں۔

(۵) اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی مصری حکومت پر چھوڑ دی جائے۔

(۶) سوڈان میں مصریوں کو داخل ہونے اور ملازمت و تجارت کرنے کے حقوق بحال کئے جائیں جو ۱۹۲۴ء میں سوڈان کے گورنر جنرل لی ٹیسٹک کے قتل کی سزا میں سلب کر لئے گئے تھے۔

(۷) جنگ کے بعد جلد از جلد مصر سے برطانوی فوجیں ہٹائی جائیں۔

یہ معاہدہ مصر کی مکمل آزادی کی طرف دوسرا یقینی قدم تھا جس کا سہرا نحاس پاشا کے سر رہا اور عوام میں وفد پارٹی کی مقبولیت اور بڑھ گئی۔ یہ امر شاہ فاروق کے لئے ناگوار تھا۔ چنانچہ نحاس پاشا کو برطرف کر دیا گیا۔ شاہ اور وفد کے درمیان اس سیاسی رسہ کشی نے ملک کی سیاست کو [illegible] طبقہ میں وفد کی قدر گھٹ رہی تھی، اور فاشسٹ اثرات [illegible] کے اثرات پھیل رہے تھے اور [illegible]
[illegible]

بڑھ گئی تھی، ادھر جرمنی اور اس کے ساتھیوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے پیش نظر مصر میں داخلی طور مخالفت برطانیہ کے لئے مضر تھی، چنانچہ اس نے فوج کشی کی دھمکی دے کر فاروق کو مجبور کیا کہ نحاس پاشا کو دوبارہ وزیر اعظم مقرر کیا جائے چونکہ نحاس پاشا اس وقت اصولی طور پر برطانیہ سے مصر کا تعاون منظور کر چکے تھے اور عوام میں ان کی مقبولیت باقی تھی اور پوری عرب دنیا کو متحدہ کرنے میں بڑی حد تک مدد دے سکتے تھے، اس لئے برطانیہ کی کوشش اور مصر کی دلچسپی کے باعث عرب لیگ کے نام سے ۱۹۴۵ء میں ایک انجمن قائم کی گئی، جس میں مصر کو ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی اس کی وجہ سے تمام مغربی ایشیا میں مصر کے وقار کی دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن ملک کی داخلی سیاست میں انتشار ہنوز باقی تھا، وفد اور بادشاہ کے درمیان طاقت آزمائی اب بھی جاری تھی، بادشاہ ہر دم اسی فکر میں رہتا کہ وفد کی ساکھ کو کسی طرح عوام کی نظروں سے گرا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں جب جنگ اختتام پر تھی اور برطانیہ کو اپنی فتح کا یقین ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ مصر کی سیاست میں دلچسپی بھی کم ہو گئی تھی، شاہ فاروق نے وفد پارٹی پر بدعنوانیوں کا الزام لگا کر نحاس پاشا کو برطرف کر دیا۔ اور خود ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی سیاست نے ایک نیا موڑ لیا۔ کیمونسٹ روس اور مغربی یورپ کے ممالک میں نظریاتی اختلافات کی بنا پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اہل مغرب کے خیال میں روس جو کل تک ان کے دوش بدوش جرمنی و جاپان کے خلاف لڑ رہا تھا، آج خود آزادی اور جمہوریت کے لئے جرمنی سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا، ادھر روس "آزاد دنیا" کو سامراجیت اور سرمایہ پرستی کا الزام لگا کر دنیا کو معاشی آزادی اور مساوات کی امید دلا رہا تھا چنانچہ اسی تضاد کی بنا پر دنیا دو گروہوں میں بٹ گئی اور ہر دو طاقتیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔ گویا "سرد جنگ" شروع ہو گئی۔

سرد جنگ کے اس ماحول میں مصر ایک بار پھر اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع اور عرب دنیا کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے امریکہ اور یورپ کے لئے بہت اہم ہو گیا۔ چنانچہ اس [illegible]

[illegible] اور افریقہ میں اپنے سیاسی رجحانات پھیلانے کی تگ ودو میں تھا، ایران کے بعض علاقوں سے اپنی فوجیں بھی ہٹانے کو تیار نہیں تھا، ترکی یونان اور شام میں کمیونسٹ تحریکوں کو ہوا دے رہا تھا انگریزوں نے نہ صرف یہ کہ نہر سوئز کو خالی کرنے کے عہد کو نظر انداز کیا بلکہ مزید فوجیں بھیج کر اپنی دفاعی طاقت کئی گنا بڑھالی، اور سوڈان کی آزادی کا مسئلہ بھی التوا میں ڈال دیا۔

برطانیہ کا یہ اقدام مصریوں کی غیرت اور آزادی کو ایک چیلنج تھا، چنانچہ سارے ملک میں احتجاج اور فسادات ہونے لگے۔

ابتدا میں یہ غم وغصہ محض انگریزوں کے خلاف تھا، لیکن بعد میں جب شاہ فاروق کی بدعنوانیوں بدکرداریوں اور جنگ فلسطین میں جنگی سامان میں غبن اور بے ایمانیوں کا راز کھلا تو وہ اس سے بدظن ہو گئے، پھر جب مشتعل عوام کو قابو میں کرنے کے لئے فاروق نے فوج کے اندرونی معاملات اور انتظامات میں مداخلت کرنا چاہی تو فوج بھی مخالف ہو گئی۔

سال ۱۹۵۱ء کے اختتام تک بدامنی ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی، انگریزوں کے خلاف غصے نے انتقام کی شکل اختیار کر لی اور ان کی جان وعزت خطرے میں پڑ گئی۔ اخوان، وفد اور کمیونسٹ سب اپنے اختلافات بھول کر قومی غیرت اور ناموس کی خاطر متحد ہو گئے اور انگریزوں کے فوجی کیمپ پر گوریلا حملے شروع کر دیئے، جسے پسپا کرنے کے لئے جنرل آرسکن کے ٹینک سواروں نے اسماعیلیہ میں مصری فوج کے ایک کیمپ پر حملہ کر کے سینکڑوں مصریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثے کی خبر نے سارے مصر کو چراغ پا کر دیا۔ ارسکن کی اس بربریت کا بدلہ قاہرہ کی گلیوں اور بازاروں میں یورپی باشندوں سے لیا جانے لگا۔ ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ سرکاری عمارتیں، اور دکانیں، کلب، ہوٹل اور سینما آگ کے شعلوں میں ڈھیر ہو گئے۔ ہر طرف [illegible] کے تعفن اور خاکستر عمارتوں کے دھوئیں سے فضا بوجھل ہو گئی۔

[illegible] ان فسادات کو وفد اور اخوان نے ایک دوسرے کی دشمنی میں نظر انداز کیا، [illegible] اپنی اپنی وفاداری کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے رہے۔ بعض نے یہ بھی سوچا تھا کہ [illegible]

فسادات سے انگریزوں پر نہر کے انخلا کے لئے دباؤ پڑے گا۔ لیکن اب یہ آگ اتنی بڑھ چکی تھی کہ وفد کے قابو سے باہر تھی۔ چنانچہ کرنل ناصر کی قیادت میں فوج نے امن قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالی اور ملک کو بدمعاملہ و بدکردار بادشاہ اور خودغرض، نکمے سیاست دانوں کے چنگل سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کا شاندار انقلاب مصر میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوا۔ کرنل عرابی اور سعد زغلول کی عظیم قربانیوں اور آزادی کے خواب کی تعبیر تھا۔ انقلاب کے بانیوں نے شاہ فاروق اور اس کے آباؤ اجداد کے مظالم سے دبے ہوئے عوام اور سیاسی کش کش سے تھکے ہوئے ملک کو پرسکون اور خوش حال زندگی کی امید دلائی اور جمہوری طرز حکومت کا پیغام سنایا جس میں آزادئ فکر و خیال کے ساتھ زمینداری نظام میں اصلاحات، دولت کی مساوی تقسیم اور سوڈان و مصر کے قضیے کے تصفیہ کا یقین دلایا۔

ابتداء میں کرنل ناصر نے پس پشت رہ کر ایک بزرگ شخصیت جنرل نجیب کو انقلاب کی رہنمائی سونپی اور علی ماہر کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد انقلاب کے تقاضوں اور وعدوں کی تکمیل پر انقلابی کمیٹی اور جنرل نجیب میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ جنرل نجیب فوراً ہی ایک پارلیمانی حکومت کی تشکیل چاہتے تھے، لیکن "انقلاب کمیٹی" کی رائے میں عوام ابھی ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھے، ملک میں وفد و اخوان کے علاوہ کوئی اور منظم سیاسی جماعت نہیں تھی، ایسے حالات میں پارلیمنٹ قائم کرنے کا مطلب تھا کہ حکومت ان میں سے کسی کی ہو، جبکہ ان میں ایک پارٹی عوام کی نظر میں اپنا وقار کھو چکی تھی اور دوسری کے نظریات بدلے ہوئے وقت اور سماج کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ قائم ہونے کی صورت میں پرانا جاگیردار طبقہ پھر سے برسر اقتدار آجاتا اور ترقی و اصلاحات کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے اور نہ مصر کی سرزمین سے یورپی فوجیں ہٹائی جاسکتیں تھیں اور نہ سوڈان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا۔ اس لئے انقلاب کے اصل مقصد کی تکمیل کے

ء کرنل ناصر نے جنرل نجیب اور علی ناصر کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کر کے حکومت کی زمام کار خود سنبھال لی۔

مصر آج جو کچھ ہے وہ صدر ناصر کی انتھک اور بے لوث کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ جولائی ۱۹۵۲ء سے اب تک کئی بار مصر موت وحیات کی کشمکش سے دوچار ہوا ہے، مگر ہر بار صدر ناصر نے دانش مندی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا اور دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود انقلاب کی روح کو تازہ رکھا، اور ترقی وخوش حالی کے ساتھ مصری عوام کی عزت اور وقار کو اور بلند کیا۔

آج مغربی ایشیاء کی سیاست میں مصر کو جو نمایاں حیثیت حاصل ہے وہ صدر ناصر اور ان کے پُرخلوص ساتھیوں کی قربانیوں کا انعام ہے۔ مصر پہلے بھی اپنی جغرافیائی، تجارتی اور تہذیبی مرکزیت کی بنا پر دنیا کی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور آج بھی رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت مغربی ایشیا میں اپنے سیاسی، تجارتی اور دفاعی مفاد کے لئے مصر کی دوستی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

رسالہ نقیب مرحوم

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

رسالہ نقیب کا سب سے پہلا شمارہ فروری ۱۹۱۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا اس کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" مولانا وحید احمد اس کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ آپ اس زمانے میں ادبی حلقوں میں ڈبلوا احمد کے نام سے مشہور تھے۔ یہ رسالہ میر محفوظ علی مرحوم کی نگرانی اور سرپرستی میں نکالا گیا تھا اور اس کے قلمی معاونین میں سلطان حیدر جوش، عظمت اللہ خاں، قمرالدین، چودھری محمد علی ردولوی، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود، سبطین احمد بدایونی جیسے مشاق اور مشہور ادیب شامل تھے۔ نقیب نکالنے کا خاص مقصد سنجیدہ ظرافت تھا جو ہندوستان میں صحیح معنی میں اس وقت نایاب تھی۔

نقیب نظامی پریس سے تین ماہ تک شائع ہوتا رہا، اس کے بعد وحید احمد صاحب نے خود رسالے کے نام پر نقیب پریس قائم کیا اور یہ رسالہ اس پریس سے شائع ہونے لگا۔ نقیب پریس کا دفتر پہلے صدر بازار بدایوں میں سید محمد صاحب عرف بیکو میاں کے گودام میں رہا، اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں سول لائن بدایوں کی اس کوٹھی میں منتقل ہو گیا جو اس وقت علی مقصود صاحب سابق چیرمین میونسپل بورڈ کی ملکیت تھی مگر اب فروخت ہو چکی ہے رسالہ کے ساتھ پریس بھی اسی کوٹھی میں اٹھ گیا۔ ۱۹۲۱ء میں پریس اور دفتر دونوں شیخوپورے میں منتقل کئے گئے اور جنوری ۱۹۲۲ء میں نقیب بند ہو گیا۔

فروری ۱۹۱۹ء سے جنوری ۱۹۲۲ء تک نقیب کے صرف چھتیس شمارے شائع ہوئے، درمیان میں ایک رسالہ بند رہا۔ مکمل فائل وحید احمد صاحب کے پاس موجود تھا لیکن ان کے بھائی سلطان حیدر جوش ان سے مطالعہ کے لئے لے گئے، مگر اپنی زندگی میں واپس نہ کر سکے، اب معلوم

نہیں کہ اس مکمل تالیف کا کیا حشر ہوا۔ نقیب پریس سے کلیات اکبر حصہ سوئم ابن مسلم، سلطان حمید جوش، دیوان فانی بدایونی، چھلے مصنفہ عظمت اللہ خاں، اصلاح بیگم کی سازش مصنفہ رازدار (اور یہ شیخ احمد قدوائی تھے اور اس وقت تک سیاست میں نہیں آئے تھے) جیسی قابل ذکر کتابیں شائع ہوئیں۔ نقیب کے فروری ۱۹۱۹ء کے شمارے میں سات سوچیاسی، کے عنوان سے وحید احمد صاحب فرماتے ہیں۔

"نقیب محض ایک ماہواری رسالہ ہے اور رسالے زبان اردو میں کوئی حیرت انگیز ایجاد نہیں، لاکھوں وجود میں آئے، ہزاروں فنا ہو گئے، سینکڑوں باقی ہیں اور نت نئے ظہور میں آئیں گے ناکامیاں ہمیشہ ہمت کو مشتعل کرتی ہیں اور اگر باعث مایوسی ہوں تو نظام دنیا بدل جائے جس قدر راہ دشوار گزار ہوتی ہے اسی قدر جوش بڑھ جاتا ہے۔ ناکامیاں ناامیدی پیدا کرنے کے لئے سبق آموز ثابت ہوتی ہیں۔"

"نقیب حرکت شوقیہ کا نتیجہ ہے اور تجارتی اصول پر نکالا گیا ہے۔ تجارتی اصول کے یہ معنی ہیں کہ رسالہ خود اپنا کفیل ہو کر اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔ مصارف کے بعد واقعی جو قیمت ہونا چاہیئے وہی اس کا سالانہ چندہ ہے، مالی منفعت قطعی مقصود نہیں، زیادتی اشاعت سے وہ خود پروان چڑھے گا۔ اشاعت سے یہ مراد ہے کہ یہ ایک ذات واحد کا شوق ہے اور وہی ذات اسی وقت تک جب تک کہ یہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو اس کا بار اپنے سر لیتی ہے۔ ہر کوشش میں خیال خود نمائی سمجھ لینا دستور زمانہ ہے مگر تعمیل شوق میں نام و نمود کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا، اظہار نام و نمائش کسی طرح بھی مقاصد میں شامل نہیں لیکن اگر کامیابی نے تمغہ شہرت دیا تو یقینی قابل فخر ہوگا اس سے انکار کرنا تصنع و خود نمائی کی دلیل ہے۔"

اجرا کا خیال اس وقت دماغ میں آتا ہے جبکہ دنیا تذبذب میں ہے کسی کوئی مفقود ہے اور تمام دشواریاں جمع ہو کر حائل راہ ہو گئی ہیں۔ کاغذ کی گرانی اور چاندی کی اعلا انی تاریخ عالم میں [illegible] کے نرخ ان [illegible] کا ثبوت ہیں کہ کاغذ چاندی کے بھاؤ بک رہا ہے

شک کرنے کی قطعی گنجائش نہیں کہ نقیب چاندی کے ورقوں پر شائع کیا جاتا ہے:
"نقیب زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اس وقت حاضر ہوتا ہے جبکہ اطمینان کی امید ہے تنزل دور ہو جانے کا خیال ہے اور خوشی و خرمی ہر دل میں جھلک رہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو نقیب مژدہ بہار لاتا ہے اور اسم با مسمیٰ ہے۔"

رسالہ نقیب میں سیاست حاضرہ پر ظریفانہ انداز میں مضامین لکھے جاتے تھے۔ سوشل ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں وحید احمد صاحب خاص نقیب کے لئے اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں سے لکھواتے تھے۔

"نقیب" نئی سیاست وطنی کا علم بردار تھا جو اب انگریزی حکومت کے ساتھ انگریزی تہذیب سے بھی بیزار ہو چلی تھی۔ نقیب میں اس وقت کی سیاست کے متعلق کافی مضامین ملتے ہیں وحید احمد صاحب نے اپنے رسالے کے ذریعہ قومی تحریک کو کافی تقویت پہنچائی۔ اس زمانے میں جبکہ انگریز کی مخالفت کرتے ہوئے ہمت والے لوگ بھی گھبراتے تھے۔ آپ نے نقیب کا ایک خاص نمبر جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں "علی برادر نمبر" نکالا۔ اس نمبر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وحید احمد صاحب کی رگ رگ میں قومی درد تھا اس خاص نمبر میں قاضی عبدالغفار، مولانا محمد علی، سلطان حیدر جوش، میر محفوظ علی اور خود وحید احمد صاحب کے مضامین شامل ہیں۔ نقیب میں کلام اکبر پر ایک نظر کے عنوان سے مولوی قمرالدین مصنف بزم اکبر کے مضامین کا ایک سلسلہ لگاتار پانچ سات شماروں میں شائع ہوا۔ قمرالدین صاحب کو اکبر کی ذات اور کلام دونوں سے عقیدت ہے اور یہ مضامین اس عقیدت کے مظہر ہیں۔ عظمت اللہ خاں نے روغن قاز کے عنوان سے نہایت ہی دلچسپ اور لطیف پیرایہ میں مضامین لکھے ہیں جو جدت اسلوب، معنی آفرینی اور خوش فکر ظرافت کے نمونے ہیں۔

شعرا کو دیکھیے تو شفق رضوی، آزاد سبحانی، کشن پرشاد کیفی، چڑیاکوٹی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اقبال، اکبر الہ آبادی، امیر بدایونی، عزیز لکھنوی، ثاقب بدایونی، آسی بدایونی، [illegible]

اور آصف علی جیسے ممتاز ادیبوں کے نام نظر آئیں گے۔ مولانا آزاد سبحانی اور آصف علی کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا صرف پرانے رسالوں میں ان مشاہیر و مجاہدین کی نظموں اور غزلوں کی زیارت ہو جاتی ہے۔ آزاد سبحانی اردو کے ممتاز غزل گو تھے اور آصف علی کی نظموں میں بڑی پختگی، شگفتگی اور روانی ہے۔ آصف علی مرحوم کی قومی اور وطنی شاعری پر الگ مقالہ لکھنے کا خیال ہے اس لئے صرف مولانا آزاد سبحانی کے نمونہ کلام پر اکتفا کرتا ہوں۔

بے زبان والا میں چرچا کہ کوئی دل نہ رہا — اہل دل کہتے ہیں باقی کوئی بے دل نہ رہا
اُٹھ گیا خلق سے اب لطفِ محبت افسوس — آپ کی تیغ محبت کا وہ گھائل نہ رہا
سن کے یہ طعن کہ ہے قحط کرم کا بولے — دینے والے تو بہت ہیں کوئی سائل نہ رہا
رسم ظاہر پہ نہیں اصل تعلق موقوف — تجھ کو بھولا رہا لیکن کبھی غافل نہ رہا
حشر انگیز ہیں ہر سمت زبانی دعوے — صفحۂ ارض پہ شاید کوئی غافل نہ رہا
لگ گئی فتوئے تعزیر پہ مہر آخر کار — کیا زمانے میں کوئی مفتی کامل نہ رہا
معرکے سخت پڑے ہیں سروتن کے کتنے — شکر شرمندہ ہیں خنجر قاتل نہ رہا
آبرو رہ گئی اک بھیڑ تماشائی تھی — زیر تیغ آپ کا سرباختہ بسمل نہ رہا
مجمعِ بلبل و گل تھا کبھی سامانِ نشاط — دلِ پژمردہ اب ان قصوں پہ مائل نہ رہا
مٹ گیا نامِ تسکین میری امید دل کا — کہہ دو موجوں سے نہ ابھریں کہ وہ ساحل نہ رہا

اب میں آزاد ہوں سچ ہے کہ کوئی قید نہیں
پردۂ وہم بھی اب بیچ میں حائل نہ رہا

اے سینۂ خالی، دل بیتا نہیں ملتا — اس گھر کا جو سرمایہ کل تھا نہیں ملتا
خورشید تو ہر ذرہ میں ہے محو تماشا — اے وائے کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا
صحرا میں گل کھل کے یہ کرتا ہے اشارہ — گھر بیٹھنے والوں کو تماشا نہیں ملتا
[illegible] ہے شکر — [illegible] شکایت گل [illegible] نہیں ملتا

کاہے کی شکایت تری پھر یہ تو بتا دے   قطرہ نہیں ملتا ہے کہ دریا نہیں ملتا

رسالہ نقیب " کے بارے میں چند ممتاز ادیبوں کی رائیں ملاحظہ ہوں :-

مولانا احسن سہسوانی مرحوم زمانہ جون ۲۲ ۱۹ء میں رقم طراز ہیں :

" بدایوں کا یہ ادبی جاندار ماہتاب کی مرتبہ شیخوپور ضلع بدایوں کے افق پر نور سے طلوع ہوا ہے وہی شان حسن، وہی ادب نوازی، وہی جلوہ نمائی، وہی سنجیدہ ظرافت، وہی سحر طرازی جو اس کی شعاعوں میں پہلے تھی اب بھی ہے۔ شائقین ادب اگر متانت میں ظرافت اور ظرافت میں متانت کا جلوہ دیکھنا چاہتے ہیں تو رسالہ نقیب کا مطالعہ کریں"۔

پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم اڈیٹر صبح امید" فرماتے ہیں :

" نقیب نامی ایک رسالہ بدایوں سے نکلتا ہے۔ اس میں ۴۸ صفحات ہوتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر مولانا وحید احمد ہیں۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں"

مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی مرحوم نے رسالہ نقیب" پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں :

" کل صبح میں مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ناگہاں نقیب پہنچا۔ مجھے مبحث کذب الحواس سے کسی قدر دلچسپی ہے اس کا واقعی صحیح اندازہ کچھ وہی دماغ کر سکتے ہیں جو مانٹیگو، کے استعفا کو سویلینیوں کا اعلان شاہی مانتے ہیں، لیکن غیر واقعی صحت کے ساتھ بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک نظر نقیب کو دیکھ کر کچھ اور سمجھا اور کیا سمجھا۔ نقیب ہے مگر پرانا لیکن نہ اس طرح جیسا کہ متقدمین پرانی روح حکومت کو نئے قالب اصلاحات میں دیکھ کر آزادی ہند کا جشن دن مناتے ہیں اور نہ تجدد امثال کے قائل مسکرا دیتا ہے ریفارم لیگ کی طرح کہ وعدوں کو ابھی دھرے جاتے ہیں۔ نگاہ ہوں یہ مطلع ایسا ہو

ازلی وابدی تھا جیسی اہل ہند کی نااہلی۔ لیکن مطبوعہ نقیب پریس شیخوپور آرکے آر بدایوں دیکھتے ہی جہات علم کے تمام پردے اٹھ گئے اور اب وہ صاف آنکھوں کے سامنے تھا جو آج سے پورے ایک سال کچھ دن پہلے بدایوں سول لائن یعنی سرکاری رقبہ آبادی سے ایسا ترک موالات کر گیا تھا کہ اس کے ساتھ جانے والے بالفاظ دیگر اس کا قالب چوبیں اور اعضائے آہنیں اٹھانے والے جب اتفاقیہ خیریت سے گھر پلٹے تو کاندھے کے درد کی شکایت کے ساتھ واپس آجانے کا شکر ایسی بلند آہنگی سے کرتے تھے جیسے کوئی بڑے مولوی کا وعظ سن کر آتا ہے اور حادثہ جانکاہ دہراتا ہے۔"

(نقیب مئی ۲۲ ۱۹ء)

بین الاقوامی مفاہمت

نیویارک یونی ورسٹی کی طرف سے بین الاقوامی مفاہمت کو فروغ دینے کی غرض سے امسال ایک سمینار کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس سمینار کے تحت، ۷ جنوری ۱۹۶۳ء کو دہلی میں ایک پنج روزہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسی سلسلہ میں ایک چار روزہ کانفرنس، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء کو بمبئی میں ہوئی تھی اور بنارس مدراس میں بھی جنوری کے مہینے میں ہی یک روزہ کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی ان کانفرنسوں کے علاوہ نیویارک میں بھی سمینار کے آغاز و اختتام پر ایک ایک جلسہ پروگرام میں شامل ہے۔ اس طرح ہندوستان اور امریکہ کے تعلیمی کارکنوں کے مابین تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں تاکہ امریکہ کے مدرسوں اور کالجوں میں ہندوستان کے بارے میں طالب علموں کو صحیح حالات سے اچھی طرح باخبر رکھا جاسکے۔ دہلی کی کانفرنس کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ امریکہ کے بارے میں ہندوستانی طالب علموں کی واقفیت کے دائرے کو مناسب طور پر وسیع کرنے کے لئے ہندوستانی اساتذہ کو امداد پہنچانے کے طور طریقوں پر غور و خوض کیا جائے۔ اس سمینار کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور امریکہ کے شہریوں میں انسان دوستی کے جذبات کو ترقی دی جائے اور اس سلسلے میں معلّم کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے۔ خیال ہے کہ اس طرح دو مختلف المزاج ممالک کے ربط باہمی سے بین الاقوامی مفاہمت کے جذبے کو بڑی تقویت پہنچے گی۔ اس موقع پر یہ بھی کوشش کی جارہی ہے کہ مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچوں کے لئے ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جس کی بدولت خلوص، عدل اور مساوات دل میں گھر کرے اور اُن کا ذہن، رنگ و نسل، اور قوم و مذہب کے محدود تصورات سے پاک رہے یہ ایک نہایت ہی مقدس اور اہم مقصد ہے۔ آج جبکہ ہر جگہ تنگ دلی اور تنگ نظری کا بازار گرم ہے اور آدمی کا خود آدمی شکار ہو رہا ہے، تمام ممالک میں رہنمایانِ تعلیم اپنی اپنی جگہ نہایت سنجیدگی کے

اسی موڑ میں ہیں کہ کیوں کر اس دنیا کے رنگ و بو کو تباہی و بربادی سے بچایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں نیویارک یونیورسٹی کی یہ مبارک کوشش ایک فالِ نیک ہے اور اس طرح وقت کے ایک اہم تقاضے کی تعمیل ہو جاتی ہے۔

مفکرین عالم اس صورتِ حال سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ ذرا چوک ہوئی تو انسان خود اپنے ہی ہاتھ سے قبائے انسانیت چاک کر ڈالے گا۔ لہٰذا موجودہ زمانے میں بہت سے بیدار ذہنوں نے "انسانیتِ عام کے مرکز" کا خواب دیکھا ہے اور تعلیم کا ایک اہم مقصد عالمی سماج کی تیاری قرار دیا ہے۔ اس ناقابلِ اعتبار دنیا میں اگر کوئی بات قابلِ اعتبار ہے تو یہی کہ اگر موجودہ نسل کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور اسے مدرسے میں انسانی ہمدردی اور رواداری کی تعلیم نہ دی جا سکی تو پھر ایک عالمی نظام کی کوئی توقع باقی نہیں رہے گی بلکہ وجودِ عالم ہی معرضِ خطر میں پڑ کر رہ جائے گا۔ ہم بلاشبہ تعلیم میں آزادی کے علم بردار ہیں لیکن یہ آزادی فضول ہے اگر اسے مناسب اور معقول طریقے سے سمجھ داری کے ساتھ نہ برتا جا سکے۔ ہم استاد کو کسی طور پر پابند نہیں کرنا چاہتے تاہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ "ہر ملک ملکِ ماست" کے عظیم تصور سے حقیقی طور پر متاثر ضرور ہو۔ بعض کے نزدیک اس عالمی نظریے کی تعلیم بھی ایک سیاسی مسلک کی اشاعت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور وہ اس بات کو تعلیمی غیر جانب داری کے خلاف خیال کرتے ہیں لیکن یہ احساس درست نہیں ہے۔ یہاں ہم امن عالم کا پیغام سناتے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ اگر شانتی کی فضا ہم نہ قائم کر سکے تو پھر غالباً ہماری داستان کو دہرانے والا بھی کوئی نہ رہ پائے گا۔ لہٰذا بین الاقوامی مفاہمت کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کا سوال نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی مفاہمت کے لئے پڑھانے کا معاملہ ہے۔ اس منزل تک ہم اس وقت پہنچ سکیں گے جب مدرسے کی سماجی زندگی میں شہریت کا قومی احساس موجود ہو گا اس لئے ہمارا پہلا قدم ماحول کی واقفیت ہی ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے مدرسہ اپنی فضا کو خوشگوار بنائے۔ وہ اپنے سماج کی صالح روایات کا سچا آئینہ دار ہو۔ وہاں پر قومی اقدار کی آبیاری ہوتی رہے اور وہاں طلبہ

کی یگانگت کے گیت کے نغمے گونجتے ہیں۔ ان مدرسوں میں ہی معصوم ذہن، تربیت پاتے ہیں جو مستقبل کے امین ہیں۔ تاہم اس منزل پر عالمی معلومات بہم پہنچانے کی ضرورت ہے اور شہریت و قومیت اور وطنیت و بین الاقوامیت جیسے تصورات کو صحیح طور پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس وقت انھیں آپس میں میل جول کے مواقع فراہم کرنے ہیں اور ماحول کے ذریعے ان میں ذمہ داری اور پیش قدمی کی صلاحیت پیدا کرنی ہے اور اتحاد و یگانگت کے جذبات ابھارنے ہیں، یہ بیداری سطحی تعلیم سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر مدرسہ، سماج کی ضروریات اور توقعات سے قطعی بے گانہ رہا، محض نصاب کے الفاظ پر کاربند رہا اور روح کی پروا نہ کی تو بچی تعلیم کا منصب پورا نہ ہو سکے گا۔ ہمیں کسی طور پر بھی واجبی قسم کی نام نہاد نظری تعلیم سے مطمئن نہیں ہونا ہے بلکہ بچوں کی تعلیم میں ان مشاغل کو شامل کرنا ہے جن کی بدولت تجسس کی خواہش جاگتی ہے اور ایجاد و انکشاف کا ذوق شوق بڑھتا ہے۔ بنیادی تعلیم میں ربط کا اصول اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت اور افادیت کا مالک ہے۔ اگلی منزل پر ثانوی مدارس کے اندر سماجی معلومات اور ماحول کی واقفیت کو دنیا اور اس کی رنگینیوں سے روشناس کرانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اب باضابطہ طور پر شہریت اور انسانیت کی تعلیم دینے کا موقع ہے۔ اس روح کو مختلف انجمنوں تنظیموں کے ذریعے پھونکا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں سائنس کا بول بالا ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کیوں کر انسان کی روشنی طبع، خود اس کے لئے عذاب کا باعث ہو رہی ہے۔ ہماری تعلیم میں اس وقت ثانوی منزل پر سائنس کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ بہر طور مناسب ہے لیکن سائنس کی تعلیم کو جہاں ایک طرف زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ محض کتابی ہو کر نہ رہ جائے وہاں اسے بے راہ روی سے بچانا ہے۔ پہلی بات کا تعلق تدریس کے طریقوں سے ہے اور دوسری صورت مذہبی روایات سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی زندگی میں مذہب کی حیثیت سے ہم سب واقف ہیں لیکن یہ عجیب سانحہ ہے کہ بعض لوگ ہی مذہب کو محدود بناتے ہیں اور اس کا نام لے کر انسانی معاشرے میں زہر پھیلاتے ہیں۔ اس وقت

مذہب کو صحیح طور پر برتنے اور سمجھانے کی اشد ضرورت ہے۔ سچا مذہب دراصل انسان دوستی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی مذہب ہو بالآخر اس کی آواز جبر و تشدد اور بے انصافی کے خلاف ہی اٹھتی ہے۔ اس کے اصول انسان کا احترام سکھلاتے ہیں اور ربطِ باہمی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ مشینوں کی ہل چل میں دلوں کی آواز دب کر رہ گئی ہے اور روحِ انسانی مضمحل ہوتی چلی جارہی ہے، ہم پر اس معاملے میں خصوصیت کے ساتھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ہمیشہ سے اس سرزمین پر مذہبی عقائد کی سچی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ یہاں کے بزرگانِ دین اور اولیائے کرام ہمیشہ دلوں کو ملانے کا کام کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے خدمتِ خلق کو عبادت سمجھ کر کیا ہے اور ان کا مسلک صلح کل اور انسان دوستی ہی رہا ہے۔ اس وقت دیس بھر میں سوامی ویویکانند کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات منائی جارہی ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ یہ سلسلہ تمام سال جاری رہے گا۔ ہمارے اس دینی رہنما کا پیغام بھی یہی تھا کہ خالق تک رسائی کا ذریعہ، خدمتِ خلق ہے اور وہ بھی مشرق و مغرب کی مفاہمت کے خواہاں تھے ٹیگور اور اقبال بھی انسانیت کا راگ گاتے رہے ہیں اور گاندھی جی نے بھی دنیا کو بھائی چارے کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اپنے ان معلمینِ اخلاق کے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ ان کے ارشادات میں بھی مذہبیت ہے اور ایسی ہی تعلیم سے بین الاقوامی مفاہمت کی داغ بیل پڑتی ہے۔

تعلیم صرف معلومات فراہم کرنے کا ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس سے انسانی شخصیت کی تربیت کی جاتی ہے۔ یہ کام چند سبق پڑھا دینے سے پورا نہیں ہو جاتا بلکہ مسلسل رہنمائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مدرسہ اسی وقت پورے طور پر کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ سماج بھی اس کا ساتھ دے۔ مسائل دراصل سیاسی اور معاشی ہوتے ہیں تاہم اگر مدرسے کے اندر اچھے ساتھی اور اچھے پڑوسی بننے کی تعلیم نہ ہوئی تو اچھے شہری کیسے پیدا ہو سکیں گے۔ اگر اچھے شہری ہی نہ بنے تو سچے وطن پرست کہاں سے آئیں گے اور اگر سچے وطن پرست نہ ہوئے تو پھر عالمی شہری کہاں! لہذا بین الاقوامی مفاہمت کی طرف منزل بہ منزل بڑھنے کا سوال ہے۔ دراصل بات یہی ہے کہ بین الاقوامی مفاہمت کی بنیاد شہریت کی اچھی تعلیم اور مذہب کی سچی رہنمائی پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔

(معظم)

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہی)

قاموس القرآن یعنی قرآنی ڈکشنری مرتبہ : مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۹۸ صفحات، قیمت مجلّد نو روپے، غیر مجلّد آٹھ روپے۔

طبع ثانی : ۱۹۶۲ء پتہ : مکتبہ علمیہ۔ قاضی منزل۔ میرٹھ (یو۔پی)

مولانا قاضی زین العابدین صاحب علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، آپ نے نہ صرف علمی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں بلکہ بیان اللسان اور قاموس القرآن کے نام سے عربی سے اُردو میں لغت کی دو کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب قاموس القرآن میں تمام قرآنی الفاظ کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے اور حسب ضرورت تشریح و توضیح بھی کردی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب تفسیر کا کام بھی دیتی ہی۔ مثلاً حَسَّ کی ساڑھے تین صفحے میں وضاحت کی گئی ہے اور مشہور مفسرین کی تحقیقات درج کردی گئی ہیں عربی لغات میں کسی لفظ کے معنی دیکھنے کے لئے اس کا مادّہ جاننا ضروری ہے، اس کی وجہ سے اُردو داں طبقہ کے لئے بڑی دقّت پیش آتی ہے۔ اس لغت کی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ بجنسہٖ درج کیا گیا ہی اس لئے ہر شخص بغیر کسی دقّت کے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہی۔

نیا خواب (پندرہ روزہ)

پچھلے سال ستمبر میں "نیا خواب" کے نام سے رام پور سے ایک نیا اخبار جاری ہوا ہی جس میں اگرچہ زیادہ تر رام سے متعلق نوٹ اور مضامین ہوتے ہیں، مگر رام پور کے ادیبوں اور شاعروں کے

تعارف کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے نیز اسی قسم کے بعض دوسرے مضامین اپنی افادیت، دلچسپی اور معیار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھا جائے اور محفوظ رکھا جائے۔ اس نے اپنی اس مختصر عمر میں علی گڑھ نمبر بھی نکالا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ اس اخبار کے مفید ہونے کے لئے اتنی ضمانت کافی ہے کہ اس کی پشت پر اُردو کے جانے پہچانے اہل قلم عابد رضا بیدار ہیں۔

سالانہ چندہ صرف تین روپے ہے اور پرانی تحصیل، رام پور (یو پی) سے منگوایا جاسکتا ہے۔

جدید سائنس

از: اے، کے، ڈیلویکر۔ ریاض آفندی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۸۰ صفحات، قیمت سوا روپے،

ملنے کا پتہ: مشتاق بک ڈپو $\frac{12}{5}$ مسجد اسٹریٹ۔ بمبئی ۳

زیر تبصرہ کتاب ساتویں جماعت کے لئے لکھی گئی ہے اور سائنس کے مختلف مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان بڑی حد تک آسان ہے۔ لیکن ابھی اور آسان کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سائنسی مسائل کو سہل زبان میں بیان کرنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی "لعاب دہن" "رطوبت معدی" اور "لحمی اجزاء" جیسے الفاظ ساتویں جماعت کے طالب علموں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔

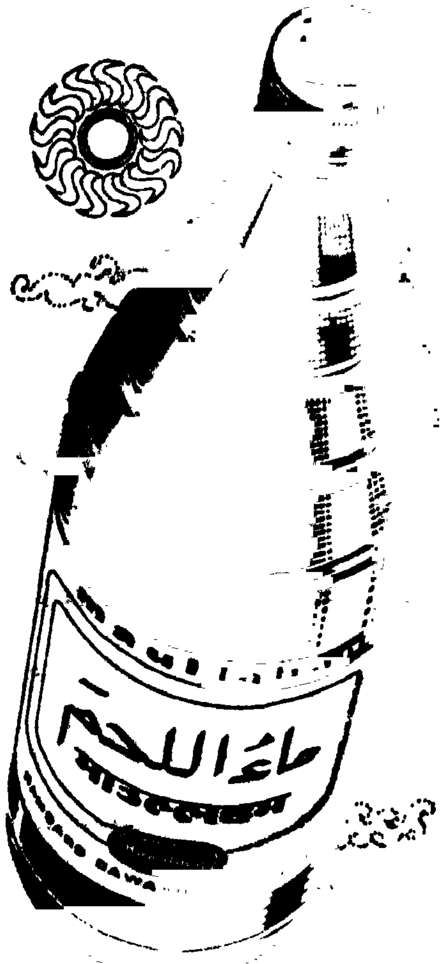
جامعہ کے اگلے دو شمارے

مولانا آزاد کی پانچویں برسی

۲۲ فروری ۱۹۶۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی وفات کے پانچ برس پورے ہو جائیں گے۔ ہم نے مشہور اصحابِ قلم کو مرحوم کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھنے کی دعوت دی ہے، اگر ہماری دعوت کو سب نے قبول کر لیا تو جامعہ کا اگلا شمارہ صرف مولانا آزاد کے لئے مخصوص ہوگا۔

۱۹۶۲ء کے اُردو ادب کا جائزہ

اپریل کا جامعہ جائزہ نمبر ہوگا، جس میں ۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا اور ۱۹۶۲ء کی جملہ مطبوعات کی مضمون وار فہرست شائع کی جائے گی۔


ماء اللحم

کوائف جامعہ

جامعہ اُردو مراکز

جناب منظور عبدالرحمٰن

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے جشن چہل سالہ (منعقدہ نومبر ۱۹۷۰ء) کے موقع پر طے کیا تھا کہ دہلی میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے تجربہ کے طور پر "اُردو مراکز" قائم کئے جائیں تا کہ جامعہ نہ صرف اپنے تعلیمی اور تہذیبی مقاصد کے حصول کے لئے بلکہ ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کو باقی رکھنے اور مستحکم کرنے کی خاطر ٹھوس قدم اٹھا سکے۔

اُردو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح محض ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اس نے اب تک ملک کے تہذیبی اتحاد کی نمائندگی کی ہے اور مشترکہ تہذیب کے حسن کو سنوارا ہے۔ اس کی تشکیل اور تعمیر میں ہندو، مسلمان، سکھ غرضیکہ سبھی برابر کے شریک رہے ہیں۔ دراصل اردو نے عوامی زندگی کی ہر کروٹ کا ساتھ دیا ہے اور اس کے قافلے کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ زبان کا مسئلہ بھی تنگ نظری کا شکار ہو گیا۔ جس کا لامحالا اثر اُردو اور اُردو بولنے والوں پر بھی پڑا۔ ان لوگوں کا اُردو سے تعلق رفتہ رفتہ کم زور ہوتا جا رہا ہے اور نئی نسل تو اردو سے بالکل بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل کی فضا میں اردو کے بہی خواہوں کے لئے اردو سے رابطہ قائم رکھنا دشوار سا ہو گیا ہے۔

اس لئے مذکورہ مقاصد اور مسائل کے پیش نظر اردو مراکز کے منصوبہ کا آغاز یکم مئی ۱۹۷۱ء کو جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ کی سرپرستی اور نگرانی میں ہوا جبکہ سب سے پہلا اُردو مرکز

دہلی کے شہری علاقہ باڑہ ہندوراؤ میں قائم ہوا۔ بعد ازیں یکے بعد دیگرے تین مرکز کالکاجی، امر نگر اور مالویہ نگر کی پنجابی بستیوں میں ۱۹ مئی سنہ ۱۹۶۱ء، یکم جولائی سنہ ۱۹۶۱ء اور ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء کو علی الترتیب قائم ہوئے۔ اس طرح فی الحال کل چار اُردو مراکز، اردو کی ترویج و اشاعت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مرکزوں کے ممبران سے کسی قسم کا بھی معاوضہ وصول نہیں کیا جا رہا ہے۔

ان نئی بستیوں کی آبادی اردو سے روشناس ہے لیکن یہاں نہ کوئی کتب خانہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی دکان جہاں اردو کی معیاری کتابیں دستیاب ہو سکیں ایسی صورت میں اردو کے بہی خواہوں کی علمی تشنگی بڑھتی رہی اور آبادی کا اردو سے تعلق بتدریج کمزور ہوتا رہا۔ چاروں مرکزوں کے قیام کا متعلقہ بستیوں اور علاقے کے باشندوں نے خیر مقدم کیا اور اُردو کے بہی خواہوں نے مرکزوں کے ساتھ اپنے تعاون اور اشتراک کا پورا ثبوت دیا۔ اردو مراکز کے قیام نے لوگوں کی توجہ معیاری ادب کی جانب مبذول کرائی اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ مرکزوں کے ممبروں میں کتب بینی کا شوق برابر بڑھتا رہا۔

اردو مراکز کی چار سرگرمیاں ہیں:—

۱۔ دارالمطالعہ	۲۔ کتب خانہ
۳۔ اردو تعلیم	۴۔ ادبی محفل۔

دارالمطالعہ:

اُردو مراکز حسبِ ذیل رسائل کے خریدار ہیں:

۱۔ جامعہ نئی دہلی ۲۔ آج کل دہلی ۳۔ سریتا نئی دہلی ۴۔ شمع نئی دہلی ۵۔ بیسویں صدی دہلی ۶۔ کتاب نما نئی دہلی ۷۔ ہماری زبان علی گڑھ ۸۔ نقوش لاہور ۹۔ نقش ادبی ڈائجسٹ کراچی ۱۰۔ ساقی کراچی ۱۱۔ ادبِ لطیف لاہور ۱۲۔ نیا دور کراچی ۱۳۔ تعمیر سری نگر ۱۴۔ سویرا لاہور

مرکزوں کے ممبران کتابوں کی طرح رسالے بھی گھر پر پڑھنا پسند کرتے ہیں اس لئے رسالے بھی

مجلات کے نام جاری کئے جاتے ہیں۔ یہ تمام رسالے بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

کتب خانہ :

آج کل اردو جاننے والوں کے حلقے میں جتنا ناول پڑھنے کا شوق ہے اتنا افسانے، ڈرامے، ادب و تنقید اور شعر و شاعری کا نہیں۔ اس لئے عام ممبران کے شوق کا احترام کرتے ہوئے ہر ماہ بیشتر ناولوں کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن افسانے، ڈرامے، نظم و غزل کے علاوہ خصوصاً ادب و تنقید اور معلوماتی کتابوں کے اضافے پر بھی خاص توجہ مبذول کی جاتی ہے تاکہ ممبران کو اپنے اپنے ذوق کی کتابیں فراہم کی جا سکیں اور ساتھ ہی ساتھ کتب بینی کے شوق اور ذوقِ مطالعہ کی نشو و نما بھی ہو سکے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ممبران ناول کے علاوہ اردو کے دوسرے اصناف کا بھی مطالعہ کریں۔

اب تک چاروں مرکزوں کے لئے ۱۳۲۱ کتابیں خریدی جا چکی ہیں جو بیشتر ناولوں اور افسانوں پر اور بقیہ کتب ڈرامہ، ادب و تنقید، نظم و غزل، معلومات اور تعلیم بالغان وغیرہ پر مشتمل ہیں، ۲۴۴ اصحاب مرکزوں کے ممبر بن چکے ہیں جو ان سینکڑوں کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اردو مراکز، اردو کے اساتذہ، مشاہیر ادب، نامور ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کے علاوہ غیر ملکی بلند پایہ ادبا کی تخلیقات سے اپنے قارئین کو متعارف کرا چکے ہیں۔

قارئین کی اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے بارے میں رائے لینے کے لئے ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا ہے جو ستمبر ۱۹۶۲ء سے ہر ایک کتاب کے ہمراہ دیا جا رہا ہے۔ سوال نامہ میں ناول و افسانہ سے متعلق پلاٹ، کردار، زبان اور مرکزی خیال یا مقصد کے بارے میں، ادب و تنقید سے متعلق زبان اور نقطۂ نظر کے بارے میں اور نظم و غزل سے متعلق زبان، ندرت خیال اور ہیئت و موضوع کے بارے میں تحریری طور پر رائے دریافت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے قارئین کے تنقیدی شعور اور رائے کا علم ہوتا ہے۔ گذشتہ ایک ماہ کے وصول شدہ سوال ناموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عام ممبران جس ذوق و شوق سے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اتنے شد و مد سے تحریری صورت میں اظہار خیال نہیں کر پاتے۔ پڑھنے

اور لکھنے کے معیار میں بہت فرق ہے۔ ابھی صرف ایک مہینہ سے ممبروں کو سوال نامے دیئے جا رہے ہیں اس لئے ابھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ سوال نامہ کو ممبروں میں مقبول کرنے کے لئے مسلسل ترغیب کی ضرورت ہے تاکہ ہر ایک ممبر کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے لکھنا نہ بھولے۔

اُردو تعلیم :

ہماری سرگرمیوں کا یہ مقابلتاً کمزور پہلو ہے کیونکہ اس کمزوری میں ملک کی موجودہ صورتِ حال اور لسانی تنگ نظری کا بڑا دخل ہے۔ تاہم ہر ایک مرکز اردو تعلیم کو مقبول کرنے کی حتی الوسع کوشش کر رہا ہے۔ ممبروں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں اور عزیزوں کو مرکز میں اردو کی ابتدائی تعلیم دلوائیں۔ اس سلسلہ میں ملاقاتی گشت پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں کی طویل تعطیلاتِ گرما کے دوران میں زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو اردو پڑھنا لکھنا سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مراکز اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اُن دنوں اردو سیکھنے والوں کی تعداد میں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن مدرسوں اور کالجوں کے کھلنے پر تعداد پھر خاصی کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ والدین اپنے بچوں پر مدرسہ کی تعلیم کے علاوہ اردو تعلیم کا مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے خیال میں بچوں کے مستقبل کو سنوارنے میں اردو کا دخل نہیں ہوگا۔

مرکزوں میں جناب حیات اللہ صاحب انصاری کے قاعدہ (دس دن میں اُردو) کی بنیاد پر اردو کی ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ہر ایک مرکز میں تعلیم و ترقی (جامعہ ملیہ) کی تعلیم بالغان سے متعلق کتابوں کا سیٹ فراہم کیا گیا ہے جو عام فہم موضوعات پر دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہیں۔ قاعدہ ختم کرنے والے ان کتابوں کو پڑھنا تو شروع کر دیتے ہیں لیکن انھیں پڑھنے میں شروع شروع میں خاصی دشواری ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ گریڈ کے لحاظ سے سلسلہ وار نہیں لکھی گئی ہیں۔

مرکزوں کی طرف سے قاعدے بھی فروخت کئے جاتے ہیں تاکہ گھر پر پڑھنے والوں کو بھی

سہولت ہو۔ بعض اشخاص قاعدہ خرید کر اپنے کسی عزیز سے گھر ہی پر اردو پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں۔

مرکز باڑہ ہندو راؤ میں اردو تعلیم مقابلتاً زیادہ مقبول ہے۔ یہاں پر دوسرے مرکزوں کے مقابلہ میں اردو سیکھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے کیونکہ اس علاقے کی بیشتر آبادی چھوٹے دکانداروں، گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور تجارت پیشہ افراد پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں، مقامی ہندوؤں اور پنجابی شرنارتھیوں کی کہیں کہیں ملی جلی لیکن زیادہ تر الگ الگ بستیاں اور علاقے بھی ہیں۔ مسلمانوں کی باڑہ ہندو راؤ کے علاقے میں خاصی آبادی ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے نوجوان خاص شوق اور جذبے کے تحت اردو سیکھنے مرکز آتے ہیں۔ یہاں پر اردو سیکھنے والوں میں تقریباً تمام اَن پڑھ ہوتے ہیں لیکن دوسرے مرکزوں میں اردو سیکھنے والے اَن پڑھ نہیں ہوتے بلکہ وہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔

جامعہ کی طرف سے اردو تعلیم کی مقبولیت اور اسے اہمیت دینے کے لئے تقسیم اسناد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ سند صرف ان ہی لوگوں میں باقاعدہ تقسیم کی جائے گی جنھوں نے صرف مرکز میں اردو پڑھنا سیکھا ہے۔

ادبی محفل:

مرکزوں کی جانب سے ادبی محفلیں بھی منعقد کی جاتی ہیں جن میں افسانہ نگار اپنے افسانے سے اور شاعر اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ممتاز ادیبوں کی ادبی موضوعات پر تقریریں ہوتی ہیں اور بعض مقبول ناولوں پر مقالے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کو مرکز سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ ممبران کا ان سے براہِ راست رابطہ قائم ہو جائے لیکن اس راہ میں خاصی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ مراکز سے متعلقہ بستیوں اور علاقوں میں مقیم نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات ادبی محفلوں میں پیش کریں۔ ادبی محفلوں سے اردو مرکزوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا ہے ہمیں امید ہے کہ ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ ہم اردو کے بہی خواہوں، ادیبوں اور شاعروں کو ایک مرکز پر جمع کر سکیں گے۔

حاصل ادبی محفلوں کا باقاعدگی سے سلسلہ جاری رکھنے میں اردو مراکز کو دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کے تعاون اور اشتراک کی شدید ضرورت ہے۔

اردو مراکز جزوقتی طور پر چل رہے ہیں۔ روزانہ شام کو تین گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ اسی دوران میں دارالمطالعہ کتب خانہ اور اردو تعلیم کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ ممبران سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا ہے لیکن اب ممبروں کی جانب سے یہ پیش کش کی جا رہی ہے کہ ان سے مرکز چندہ وصول کرے تاکہ مرکزوں کا مالی بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے اور سرگرمیوں کی رفتار تیز ہو سکے۔ ممبران کا ایسا رویہ مرکزوں کے ساتھ ان کے تعاون اور اشتراک کا بین ثبوت ہے۔

اردو مراکز کا دائرہ اثر وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ نواحی بستیوں اور علاقوں کے لوگ مرکزوں کے ممبر بنتے جا رہے ہیں سینکڑوں گھروں تک اردو کی معیاری کتابوں کی رسائی اور اردو کے اساتذہ، مشاہیر ادب اور ممتاز ادیبوں اور شاعروں کا تعارف خود اپنی جگہ مرکزوں کا ایک اہم اور دور رس تعمیری کام ہے۔ ادبی ذوق اور کتب بینی کے شوق میں اضافہ ہو رہا ہے جس کا اندازہ اجرائے کتب، سرگرم اور متحرک ممبروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اب یہ ممبران ایسی دکانوں کی طرف رخ نہیں کرتے جو ہیجان انگیز جاسوسی اور گھٹیا رومانی و جنسی ناولوں کو کرایہ پر پڑھنے کے لئے دیتی ہیں۔ جب یہ سننے میں آتا ہے کہ ان دکانوں کا ایسا کاروبار ٹھپ ہوتا جا رہا ہے تو بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے اور امید افزا صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کے بہی خواہ روز بروز مرکزوں سے قریب سے قریب تر ہونے جا رہے ہیں۔

اردو مراکز نے اپنے ممبروں کو ادبی مطالعہ کا محبوب مشغلہ فراہم کیا اور اکثر ممبروں کی مرکزوں میں یومیہ حاضری ان کا ایک معمول سا بن گئی ہے۔ وہ دوران تعطیلات مطالعہ پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ ہر ایک مرکز میں ایسے ممبروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو پہلے ایک کتاب جاری کرواتے تھے اور اب ایک سے زائد۔

مرکزوں کے قیام سے ممبروں میں تہذیبی اتحاد مضبوط ہوا ہے اور فی الحال چھوٹے پیمانہ پر متعلقہ بستی یا علاقہ میں صحت مند ماحول پیدا ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔

مرکزوں کی مذکورہ تعمیری سرگرمیوں نے نہ صرف اردو کے بہی خواہوں کو بلکہ غیر ... کو بھی

متاثر کیا ہے۔ بعد میں یہ لوگ مرکز کے ممبر بن گئے۔

مرکزوں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ متعلقہ علاقوں اور بستیوں میں جامعہ ملیہ بھی مقبول ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لوگ جامعہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے مرکز میں آتے ہیں۔ جامعہ کے طلبائے قدیم نے بھی مرکزوں کے ساتھ پوری طرح تعاون اور اشتراک کیا جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جامعہ کا اردو مراکز کے ذریعہ متعلقہ بستیوں اور علاقوں کے باشندوں سے رابطہ پیدا ہو گیا۔

"اردو مراکز" کا منصوبہ دہلی میں اپنی طرز کا بالکل ہی نیا منصوبہ ہے جس کی ابتدا پرسکون دھیمے پن سے ہوئی اور پھر خاموش تعمیری سرگرمیوں کے ذریعے اس کا دائرہ اثر وسیع ہوتا رہا۔ یہ ایک صبر طلب کام اور مدت چاہتا ہے۔ اگر وسیع النظری، مستقل مزاجی، ہمت اور بلند حوصلوں کے تحت اردو مراکز تہہ اتحاد پیدا کرنے اور تنگ نظری دور کرنے کی خاموش جدوجہد کرتے رہے تو یقیناً یہ اپنے اپنے علاقوں کے اردو کے بہی خواہوں اور اردو بولنے والوں کو تہذیبی طور پر متحد کر سکیں گے جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملے گی۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پرس دہلی   کاتب: ...

Regd. No. D - 768 February 1963

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر

شمارہ ۳	بابت ماہ مارچ ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۴۸

فہرست مضامین

پرچے کی قیمت: ایک روپیہ — سالانہ چندہ: چھ روپے

مولانا ابوالکلام آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر
جامعہ کا یہ حقیر نمبر پیش کیا جاتا ہے
کچھ مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں
اور کچھ اس لئے کہ ہم مولانا کی یاد کو تازہ رکھنے
کے لئے اس موقع پر اپنی ذمہ داریوں پر غور
کریں۔

(ادارہ)

ہندوستانی قومیت اور مسلمان

مولانا آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر چند خیالات

پروفیسر آل احمد سرور

مولانا آزاد کے انتقال کو پانچ سال ہو گئے۔ ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی اسے کوئی پُر نہ کر سکا ایک حد تک مولانا حفظ الرحمن نے ہندوستانی مسلمانوں کو قومیت کی شاہراہ پر آگے بڑھایا، مگر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب یہ عالم ہے

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

آزادی کے پندرہ سال کے بعد بھی قومی زندگی میں ہندوستانی مسلمانوں کی نہ وہ اہمیت ہے جس کے وہ مستحق ہیں، نہ ان کے یہاں وہ جذبہ ہے جو مشکلات پر قابو پاتا ہے اور مردانہ وار منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے عام طور پر وہ اپنے آپ کو مظلوم کہتے ہیں۔ جمہوریت کا تصور، غیر مذہبی ریاست کا وجود، سوشلزم کی منزل، اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے وعدے، نہ ان کے دل کو گرماتے ہیں نہ ان کے دماغ کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سن لیتے ہیں جو انھیں ہندوستانی قومیت کے شاندار نصب العین اور ہماری قومی حکومت کے نیک ارادوں کی داستان سناتے ہیں۔ مگر ان پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں ایک ایسی تاریک رات آئی ہے جس کی کوئی سحر نہیں۔ وہ اپنے مذہب کے سچے پیرو تو نہیں کہے جا سکتے ہاں اس سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر کوئی انھیں پکارتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے دوڑتے ہیں۔ مذہب پر ان کے خیال میں کوئی آنچ آتی ہے تو احتجاج کرتے ہیں، مذہب کا کوئی نام لے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی تہہ میں کوئی سیاسی

مصلحت پوشیدہ ہے یا نہیں۔ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کے جذبات سے کھیل رہا ہے۔ اگر کوئی جماعت انھیں اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی ہے تو اس کے لئے بڑی آسانی ہے وہ صرف یہ کہہ دے کہ اسلام خطرے میں ہے، اس کے بعد جو چاہے سو کرالے۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک مذہب تو ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس کے ساتھ مل کر ہی انھیں دین اور دنیا مل سکتے ہیں، مگر قومیت کو وہ ایک ایسا سودا سمجھتے ہیں جس میں ان کے لئے نقصان ہی نقصان ہے اور اکثریت کے لئے نفع ہی نفع۔ پھر انھیں یہ بھی خیال ہو چکا ہے کہ اسلام اور قومیت ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ قومیت سے مسلمان جتنا ہی ہم آہنگ ہوگا اتنا ہی وہ اسلام سے دور ہوتا جائے گا پہلے اُسے ہر معاملے میں اکثریت کی غلامی قبول کرنا پڑے گی پھر اُسے رفتہ رفتہ ایک خاموش زہر کے اثر سے اپنی تہذیبی خصوصیات سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، اس کے بعد نوبت یہ آئے گی کہ عقائد بھی کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ خطرہ کیوں مول لے۔

اقبال نے پہلی جنگ عظیم سے پہلے قومیت کے متعلق کہا تھا:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے　　قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس کے بعد سے گنگا میں کتنا پانی بہہ گیا۔ دو عالم گیر لڑائیاں ہوئیں۔ اسلامی ممالک میں قومیت کی تحریک نے زور پکڑا۔ ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوئے۔ ایشیا اور افریقہ کا نقشہ بدل گیا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر کچھ لوگوں کو چھوڑ کر جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے مجموعی طور پر ہندوستان کے مسلمان قومیت اسلام کے نظریئے سے ہی چمٹے رہے۔ انھوں نے ہندوستانی قومیت کو آتش نمرود تو سمجھا مگر اس میں کود دے نہیں، ورنہ یہی آگ اسی طرح ان کے لئے گلزار ہو جاتی جس طرح حضرت ابراہیم کے لئے ہو گئی تھی۔ مولانا آزاد نے "ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے" کے آخری صفحے پر صاف صاف کہا تھا:

"تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلی چند دہائیوں کے بعد یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے

بعد اسلام، صرف اسلام کی بنیاد پر تمام مسلم ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔"
مگر آج بھی بیشتر ہندوستانی مسلمان جب کسی اسلامی بلاک کی تجویز سنتے ہیں تو انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آج بھی ان کے دل میں ہندوستان کے لئے وہ جذبہ نہیں ہے جو اسلامی ممالک کے لئے ہے، آج بھی وہ اپنے ہم وطنوں سے جو کسی دوسرے مذہب کے پیرو ہیں ذہنی طور پر اتنے قریب نہیں جتنے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ہیں۔ آج بھی وہ قومیت کے فروغ کو مذہب کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ آج بھی پہلے مراعات اور سہولتیں ڈھونڈھتے ہیں اور بعد میں خدمت کی بات کرتے ہیں۔ آج بھی حقوق تو یاد ہیں، فرائض سے غفلت ہے۔ اس لئے مولانا آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر یہ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا قومی فریضہ یاد دلائیں اور انھیں بتائیں کہ قومیت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے اور ایک سے وفا دوسرے سے بے وفائی کے مترادف نہیں کہی جا سکتی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے خود مولانا کے رام گڑھ کے خطبے کا ایک اقتباس دینا ضروری ہے جس سے نہ صرف مولانا کا بلکہ قوم پرست مسلمانوں کا بھی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ اقتباس طویل ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ اس میں سے کوئی جز حذف نہیں کیا جا سکتا۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں

میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (فیکٹر) ہوں۔ میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

مولانا کے نزدیک قومیت اور اسلام میں سے کسی کو چھوڑنا ضروری نہیں۔ نہ ان میں سے ایک کے بڑے اور ایک کے چھوٹے ہونے کا سوال ہے۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور ان کے آپس میں ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبال کا یہ خیال نہ تھا۔ آخر عمر میں ان سے اور مولانا حسین احمد سے اس پر بحث بھی ہوئی تھی۔ اقبال کی طرح بہت سے ہندوستانی مسلمان یہ پہلے بھی سمجھتے تھے اور آج بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے اور کسی دوسری شے سے وفاداری گوارا نہیں کرتا خواہ وہ قومیت ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں اسلام اور قومیت دونوں کا ایک خاص تصور ذہن میں آتا ہے۔ اگر اسلام کے آئیڈیل تصور اور قومیت کے آئیڈیل تصور کا موازنہ ہو تو بھی بات نتیجہ خیز ہو سکتی ہے مگر عام طور پر اسلام کا آئیڈیل تصور اور قومیت کا عملی روپ دیکھا جاتا ہے اگر دونوں کے عملی روپ کی بات ہو تو بھی گفتگو دلچسپ ہو سکتی ہے اور شاید نتیجہ خیز بھی ہو۔

قومیت ہندوستان کے لئے نئی چیز ہے۔ مغربی ملکوں کا تجربہ ہمارے لئے مفید ہو یا نہ ہو مگر خود اسلامی ممالک کا کوئی بھی معروضی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان میں قومیت آج سب سے بڑی طاقت ہے۔ عرب ممالک میں صدر ناصر کی مقبولیت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے یمن میں انقلاب اور عراق میں نئی کروٹ ناصرازم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا پتہ دیتے ہیں۔ اگرچہ ایک دنیا کا تخیل دانش وروں اور ادیبوں کے دلوں کو گرمانے لگا ہے، اگر عملی طور پر قومیت آج دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مذہب سے بڑی ہے۔ مذہب کے مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ مذہب میں عقاید۔ عبادات اور معاملات سبھی پہلو آتے ہیں۔ ان تینوں میں اسلام کی تعلیم کے مطابق عمل ہونا چاہیئے مگر معاملات صرف اپنے گروہ کے لوگوں سے نہیں

دوسروں سے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے معاملات کے سلسلے میں دوسروں سے رشتے کا سوال بھی آتا ہے اور اس لئے روزمرہ کے کاروبار میں اور ایسے معاملات میں جن سے آج کی پیچیدہ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے، قومیت کی طاقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر دور کے ذہن کی ایک کنجی ہوتی ہے اور یہ کنجی بدلتی رہتی ہے۔ یہ کنجی اس کنجی کے علاوہ ہوتی ہے جو مذہب کی ہے اور جس کے ذریعہ سے انسان اور اس کے خدا کے درمیان راستے کھلتے ہیں۔ اس دور کے ذہن کی کنجی قومیت ہے اور جب ہم قومیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے کسی طرح اسلام کی اہمیت کو گھٹانا مقصود نہیں۔ اسلام بہرحال ہمیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ممتاز کرتا ہے اور علیحدہ کرتا ہے۔ قومیت ہمیں ان سے ملاتی ہے۔ مذہبی مسائل کے علاوہ، روزمرہ زندگی میں ہمارا سابقہ دوسروں سے زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے یہ رشتہ جو ہمیں اس ملک کے دوسرے رہنے والوں سے ملاتا ہے، اتنا اہم، جاندار اور معنی خیز ہے کہ ہم اس کی اہمیت سے انکار کرکے اپنا نقصان کریں گے۔ دنیا یہ دیکھتی ہے کہ اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے، وہ اپنے کاروبار میں ہر مذہب کے پیرو کو شریک کر لیتی ہے بشرطیکہ کاروبار پر برا اثر نہ پڑے۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے عام طور پر اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ وہ جب قومیت کی طرف بڑھتے بھی ہیں تو ان کا اسلام کا تصور ان کے سامنے دیوار بنکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ حقیقی اسلام قومیت کے فروغ میں کوئی خطرہ نہیں سمجھتا، بلکہ قومیت کا فروغ علاوہ دوسرے مذاہب کے ہندوستان میں اسلام کے فروغ کے لئے بھی راہیں کھول سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ ابھی قومیت کا تجربہ ہمارے ملک میں نیا ہے۔ ابھی اس میں وہ پختگی نہیں آئی کہ ہم اس کے سارے محاسن کو دیکھ سکیں۔ ابھی اس کے فروغ کے راستے میں تاریخی وجوہات کی بنا پر کچھ سنگ گراں حائل رہے ہیں اور ان میں سے کچھ دوسروں نے پیدا کئے ہیں تو کچھ کے پیدا کرنے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ یہ پتھر وقت کے تقاضے کے مطابق رفتہ رفتہ راہ سے ہٹنے والے ہیں۔ ہم ان دونوں پہلوؤں کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیں گے۔

ہندوستان کا مسلمان مجموعی طور سے اسلام سے محبت کرتا ہے، مگر اس کا اسلام حقیقی اسلام سے خاصا دور ہے۔ وہ قبر پرستی کی لعنت میں بڑی حد تک گرفتار ہے۔ اس کے یہاں فرقہ بندی بھی ہے اور ذاتیں بھی۔ وہ جاگیردارانہ نظام سے بری طرح چمٹا ہوا ہے۔ اس کا قدیم نظام تعلیم تقلیدی ہے، یہ کولہو کے بیل بناتا ہے، عرصۂ کارزار میں چلنا نہیں سکھاتا۔ اس میں آدھی آبادی یعنی عورت کچھ عرصے پہلے تک سماج کا فعال حصہ نہیں بلکہ سماج پر بوجھ رہی ہے۔ اس کے یہاں دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہے اس نے جدید علوم کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان میں پرانی حکومت کا نشہ ہے، یہ محنت سے جی چراتا ہے۔ یہ ہر اندرونی یا بیرونی طاقت کا آلۂ کار بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کا کچھ فائدہ ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس عمومی جائزے میں سرسید کے وقت سے جو تبدیلی ہوئی ہے اس کا احساس بظاہر نظر نہیں آتا، مگر یہاں بات مجموعی طور پر کہی گئی ہے۔ سرسید ہوں یا ابوالکلام، ان کا احترام تو برابر کیا گیا ہے مگر ان کے خیالات پر عمل کم ہی ہوا ہے۔

کیا ہندوستان کے مسلمان نے حقیقی اسلام کی کوئی بڑی خدمت کی ہے! کیا پاکستان بنوانا اسلام کی واقعی خدمت تھی؟ اور کیا یہ بات غلط ہے کہ پاکستان کا وجود ہندوستانی مسلمانوں کی کاوش سے زیادہ مغربی استعمار پرستوں کی ایک سیاسی مصلحت کا مرہونِ منت ہے؟

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست میں بالائی طبقے کے مسلمانوں کے طبقاتی مفاد کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، غریب اسلام کا صرف نام لیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ مفاد اس نام کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ نظام حیدر آباد سے ہندوستانی مسلمانوں کو کتنی ہمدردی تھی اور اس ہمدردی کی کیا قیمت دینی پڑی، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

اسلام ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ توحید و رسالت پر یقین محکم رکھے۔ وہ قرآن کی روشنی میں اپنی زندگی کو منظم کرے اور اس زندگی کو انسانیت کے لئے باعث خیر و برکت

بنائے۔ اسلام میں فرقوں کی گنجائش نہیں، مگر ہمارے یہاں بہتر فرقے موجود ہیں جو اپنے علاوہ دوسرے کو کافر سمجھتے ہیں۔ اسلام نے وراثت، نکاح، طلاق کے لئے کچھ قوانین بنائے ہیں۔ ہمارے یہاں ان قوانین سے زیادہ رسم کی پیروی ہے۔ اسلام کی روح جمہوری ہے۔ ہم نے دولت اور خاندان کا لحاظ زیادہ رکھا ہے۔ اسلام نے علم کے لئے کوئی دروازہ بند نہیں کیا، ابھی کتنے دن ہوئے کہ ہمارے علما انگریزی تعلیم کو بے دینی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اب بھی کچھ لوگ ہندی اور سنسکرت سے اس لئے جھجکتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مذہب سے دور ہو جائیں گے۔ ہم نے صدیوں تک نئے علوم کی طرف سے اپنے ذہن کا دریچہ بند رکھا ہے۔

اس لئے اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ایک مدت سے ہندوستانی مسلمان اسلام کی خدمت کم کرتا رہا ہے۔ اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کی جدوجہد میں زیادہ معروف رہا ہے۔ تاریخ کا نقشہ بدلنے پر جمہوری عناصر کے تقویت پانے پر غلام ملکوں کے آزاد ہونے پر آبادی کے بڑے حصے کا ملک پر اثر انداز ہونا قدرتی تھا۔ اس ماضی کی یاد جس کے شاندار کارنامے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، اکثریت کو کیوں نہ آتی، وہ فلسفہ، وہ ادب وہ تہذیب، کیوں نہ ابھرتے جن کو مغربی سامراج نے اپنے مصالح کی بنا پر دبا رکھا تھا۔ اس سے یہ شکایت تو بجا ہوتی کہ وہ صرف قدیم ہندوستان کو کیوں یاد کرتا ہے، درمیانی دور کے ہندوستان کو بھی کیوں اپنی یاد میں شامل نہیں کرتا، لیکن اس سب سارے جذبات کو محض اکثریت کا نشہ قرار دینا کہاں کی دانش مندی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا پروفیسر ہمایوں کبیر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک کانووکیشن میں خطبہ پڑھتے ہوئے یونیورسٹی کے مسلمان طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کے مشاہیر کو اپنائیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ ہندو مذہب کے بزرگوں پر ایمان لے آئیں بلکہ سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ اشوک، کالی داس، وکرماجیت۔ کرشن جی، رام چندر جی کا بھی اقرار کریں۔ مگر عام طور پر پروفیسر کبیر کے ارشادات کو ایک ہندو پرست وزیر کے بھاشن سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی جو جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تنگ نظری اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ہر جدید تحریک کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا یا یاروں نے اپنے مفاد کی خاطر ان کو یہ سمجھا دیا۔ جمہوریت سے وہ بیزار، قومیت ان کے نزدیک ایک فریب، سوشلزم یا کمیونزم لامذہبیت کا دوسرا نام، اہنسا کا فلسفہ گوسفندی کا نیا روپ۔ جن اللہ کے بندوں نے نئی تحریکوں کی کچھ تعریف کی وہ فوراً ٹاٹ باہر کردئے گئے۔ برسوں مولانا آزاد کے متعلق یہ پروپیگنڈا ہوتا رہا کہ کانگریس نے انھیں چند سکوں کے عوض خرید لیا ہے۔ مولانا کا جرم یہ تھا کہ وہ کانگریس کی حمایت کرتے تھے جو قومی تحریک کی سربراہ تھی۔ گاندھی جی کے متعلق اقبال کے شعر پر سر دھننے والے اب بھی موجود ہیں۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حالانکہ جن لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ذہنوں پر جالا نہیں ہے وہ جانتے ہیں کہ رشی کے فاقوں نے نہ صرف برہمن کا طلسم توڑ دیا بلکہ ہندو حکومت کے خواب کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

ہندوستان کا مسلمان اب تک معلّق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا اسلام سے رشتہ مضبوط ہے حالانکہ صدیوں کے رسم ورواج کی وجہ سے مذہب کے ایک ظاہری روپ کی پرستش تو اس کے پاس رہ گئی ہے، مذہب کی روح نہیں رہی۔ اس نے قومیت سے من حیث القوم ابھی تک اپنا رشتہ مضبوط نہیں کیا۔ یعنی قومیت اس کے ذہن، اس کے عقیدے، اس کی شخصیت کا ایک جزولاینفک نہیں ہے۔ قومیت کا جذبہ اسے گرماتا نہیں!

قومیت صرف جغرافیے کی مرہون منت نہیں۔ اس میں تاریخ، تہذیب، اقتصادی مفاد کی وحدت بھی ضروری ہے اور سب سے زیادہ یگانگت کے احساس کی۔ قومیں مذہب سے نہیں بنتیں، وطن اور اس کی مشترک تاریخ و تہذیب سے بنتی ہیں۔ عرب عیسائی اور عرب یہودی، باوجود اس کے کہ عرب مسلمانوں سے مختلف مذہب رکھتے ہیں، مگر ان کے ساتھ ایک عرب قوم

جڑے ہیں۔ ہندوستان کے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سکھ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہوئے ہندوستانی قوم کے افراد ہیں۔ مذہب قوم کے راستے میں حائل نہیں ہوتا، نہ قوم افراد کے مذہب سے کوئی علاقہ رکھتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کش مکش کے بہت سے مظاہر ملتے ہیں مگر اس سے کم مظاہر ان کے تعاون کے نہیں ہیں۔ یہ کش مکش اسلام اور دوسرے مذاہب کی نہیں ہے، بلکہ ان افراد کی سیاسی اقتدار کے لئے لڑائی ہے جو مختلف مذاہب رکھتے تھے۔ پھر ان میں تعاون اور اشتراک کے بھی ان گنت نمونے ملتے ہیں۔ یہاں پھر مولانا کے مشہور خطبے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کی جگہ نکالی۔ انھیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔"

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔"

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت

ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں چل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔

ہماری اس ہزاروں برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔"

کہا جا سکتا ہے کہ اس "ناقابلِ تقسیم" ہندوستانی قوم کے ۱۹۴۷ء میں دو ٹکڑے ہو گئے اور اس لئے یہ سارا استدلال غلط ثابت ہو گیا۔ حالانکہ اس عملِ جراحی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت اور پاکستان میں ہندوؤں کی اقلیت اب ہندوستانی اور پاکستانی قوم ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد ہندوستان کے ساتھ اور پاکستان کے ہندوؤں کا پاکستان کے ساتھ ہے۔ تقسیم یقیناً غلط تھی، مگر اب تو وہ ہو گئی، اب اُسے بُرا کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب دونوں ملکوں کو پرانے جھگڑوں کو بھلا کر آزاد اور خودمختار دوستوں کی طرح رہنا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے ہندوؤں کو اب پاکستان کے ہندوؤں سے کوئی سروکار نہیں اور اس طرح پاکستان کے مسلمانوں کو اب ہندوستان کے مسلمانوں سے

کوئی سروکار نہیں۔ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ اگر اب بھی کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تو یہ ان کی بھول ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے یہ حقیقت بھی اور زیادہ واضح ہوتی جائیگی

ہندوستان میں قومیت کا تصور نیا ہے۔ مذہب، ذات پات، علاقے سے وفاداریاں پرانی ہیں۔ قومیت کا تصور ابھی دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا ہے۔ صرف اوپر سے ان لیا گیا ہے یہاں اقرار باللسان ہے تصدیق بالقلب کی منزل تک ابھی بات نہیں پہنچی۔ اس لئے پرانے رشتے اب بھی اپنا زور دکھاتے ہیں اور ذرا سی سختی یا دباؤ پر ابھر آتے ہیں۔ پھر انگریز کے زمانے میں لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول پر جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو برسوں سبق دیئے گئے تھے وہ جلد بھلائے نہیں جا سکتے۔ سیاست والوں کی بہت بڑی تعداد اس ماحول میں پلی ہے۔ حکومت کے کارکن خلا میں پیدا نہیں ہوئے۔ اس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور ان میں سے بڑی تعداد کو اس بنا پر ملازمتیں ملی تھیں۔ اقلیت کے ذہن سے مراعات اور محفوظ نشستوں کی یاد محو نہیں ہوئی ہے، پرانی تاریخ کو جس طرح پیش کیا گیا تھا، اس کے اثرات بھی باقی ہیں تقسیم کے بعد ہولناک فسادات نے دونوں طرف اتنا زہر پھیلایا تھا کہ وہ جاتے جاتے جائے گا۔ ان باتوں کی وجہ سے آزادی کے بعد قومیت کے تصور کو وہ فضا نہ جو ملنی چاہیئے تھی۔ اگرچہ ان حالات میں اکثریت کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے، مگر صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلتا کہ جب تک اقلیت کو انصاف نہ ملے گا اس وقت تک وہ قومیت کے تجربے میں حصہ نہ لے گی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومیت کے تجربے کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں جو فرض ہے وہ صرف اس وجہ سے ڈھیل نہیں جاتا کہ ہندوستان کی اکثریت یا حکومت بہت سی باتیں جمہوریت کے خلاف کرتی ہے۔ خواب اور حقیقت نصب العین اور عمل میں خلیج ہمیشہ ہوتی ہے مگر جتنی ہی کوئی قوم پختہ ہوتی ہے اتنی ہی یہ خلا کم ہوتی ہے۔ ابھی قومیت ہمارے یہاں راسخ نہیں ہوئی ہے۔ ہاں یہ بات اہم ہے کہ چین کے ہماری سرحد پر در آنے سے ملک میں یکجہتی کی فضا خود بخود قائم ہوئی ہے

شر سے کبھی کبھی خیر بھی برآمد ہوتا ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل قومیت کے فروغ کی وجہ سے روشن نہیں ہو سکتا، ایک فریب ہے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں ایک عجیب بددلی اور مایوسی ہے۔ ہماری سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ ہے کہ یہ بددلی اور مایوسی ایک نفسیاتی مرض کی وجہ سے ہے۔ اکثریت کے قصور کم نہیں، مگر اکثریت کو الزام دے کر ہم کچھ کرنے کی ضرورت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ کچھ کرنے میں محنت پڑتی ہے، ذہن و دماغ کو اس کام میں لگانا پڑتا ہے۔ بددلی اور مایوسی میں بظاہر ہمارا کچھ نہیں جاتا۔ سب قصور دوسروں کا ٹھہرتا ہے۔ لوگ ہمیں موقع ہی نہیں دیتے۔ ہر جگہ ہمارے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے ہر دروازہ ہمارے لئے بند ہے۔ یہ غیر مذہبی ریاست محض ڈھونگ ہے یہاں ابوالکلام آزاد کی حیثیت محض جمہورے (شو بوائے) کی تھی۔ یہ الفاظ ۱۹۴۵ء میں دہلی میں ایک مسلم لیگی مسلمان نے کہے تھے۔ اب ذاکر حسین نائب صدر ہوئے تو اس خیال کے ایک بزرگ نے کہا کہ ہندو ان سے نہ معلوم کیا کام لینے والے ہیں۔ اس مریض ذہنیت کا کیا علاج ہے۔ نفسیات میں مظلومیت کے تخیل کی اصطلاح عام ہے۔ اس مرض کے شکار اب بھی بہت سے لوگ ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ آزادی کے بعد جو ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں ان سے ہم آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں مسلمانوں کی طرف سے پہل سمجھ میں آنے والی چیز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی غیر ذمہ دار آدمی نے کوئی نازیبا حرکت کی ہو اور یہ غیر ذمے دار آدمی اتفاق سے مسلمان ہو۔ غیر ذمہ دار آدمی ہر مذہبی گروہ میں مل جائیں گے اور ایک سیدھے سادے حساب کے مطابق اکثریت میں برے لوگوں اور اچھے لوگوں کی تعداد، ہمیشہ اقلیت کے برے اور اچھے لوگوں سے زیادہ ہوگی، اس لئے ان فسادات کی ذمہ داری سے اکثریت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مگر اقلیت اگر ان سے یہ اثر لیتی ہے کہ وہ کبھی اپنے خول میں سکڑ جاتی ہے، اور کبھی قومی زندگی سے ہٹ جاتی ہے، اور کبھی اپنی

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی تعمیر میں لگ جاتی ہے، اور کبھی اپنے زخموں کو کریدتی رہتی ہے اور ایک احساسِ مظلومیت اور جذبۂ شکست کے ماتحت نئے حالات، نئے میلانات، آنے دن کی تبدیلیوں اور امکانات کو نظر انداز کر دیتی ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اگر اکثریت کے کچھ ناسمجھ افراد، اقلیت سے بار بار وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ ہمیں وفاداری کا سرٹیفکٹ کسی سیاسی پارٹی یا کسی افسر سے حاصل کرنا نہیں ہے، ہاں اپنے ذہن کو ٹٹولنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ہمارے دل کے کسی گوشے میں ہندوستانی قوم کی کوئی تصویر ہے یا نہیں، ہندوستان کی یہ تصویر دھرتی کی محبت اور گھر کی محبت اور پڑوسیوں کی محبت سے بڑی چیز ہے۔ یہ ایک سیاسی مفاد، ایک مشترک نظامِ زندگی، ایک مشترک تہذیب اور ایک مشترک نصب العین سے محبت ہے۔ یہ زندگی، تہذیب اور نصب العین دنیاوی زندگی کے لئے ہے، روحانی غذا ہمیں اسلام سے ہی مل سکتی ہے۔ اور ملے گی۔ اسلام اتنا وسیع، جامع اور ہمہ گیر دائرہ رکھتا ہے کہ اس میں عرب کے مسلمانوں، انڈونیشیا کے مسلمانوں، ہندوستان کے مسلمانوں، سب کے لئے اپنی اپنی قومیت کا جزو لاینفک ہوتے ہوئے ذہنی آسودگی اور مادی خوش حالی کا امکان ہے۔ عرب، انڈونیشیا اور پاکستان میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ ان کے لئے سوال یہ ہے کہ وہ اسلام کے راستے پر چلتے ہوئے کس طرح موجودہ دور کی بھول بھلیاں سے نکل سکتے ہیں، کس طرح حال کے پیچ وخم کو ہموار کر سکتے ہیں، کس طرح اپنی اور انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے دوسرا سوال ہے اور یہ سوال پہلے سے کم اہم نہیں یہاں اکثریت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی جس کے پیچھے ایسی شاندار تاریخ ہے جس کا ہماری مشترک تہذیب اور قومی زندگی میں ایسا نمایاں حصہ رہا ہے جو کشمیر سے کیرالا تک اور کلکتے سے کچھ تک پھیلی ہوئی ہے، یہاں بھی ایک رول رکھتی ہے۔ ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ جس نے اسلام کا خاصا ہمدردی سے مطالعہ کیا ہے اور جو اسلام کے عمرانی کارنامے کا قائل ہے۔ اپنی کتاب "جدید تاریخ میں اسلام"

میں ہندوستان کے باب میں لکھتا ہے :-

"ہندوستان میں اسلام دوسروں سے رشتے قائم کرنے کی ضرورت کو ایک نقطے پر مرکوز کرتا ہے اور اس ضرورت کی ایک علامت ہے۔

" دوسروں کی طرح اسلام کو اس منزل پر اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیئے اور غالباً یہ سبق وہ ہندوستان میں سیکھے گا" (صفحہ ۲۹۱)

اسمتھ کے نزدیک ہندوستان کی غیر مذہبی ریاست میں اسلام کا جو مقام ہوگا اس کے مطابق اسلام اور ہندوستان دونوں کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اسی مضمون میں وہ دوسری جگہ لکھتا ہے :-

ہاں ہندوستان اور اسلام دونوں کی تاریخیں ایک حد تک اس جماعت کے (ہندوستانی مسلمانوں کے) اپنے موجودہ مسائل کے حل میں کامیاب ہونے یا ناکام رہنے پر اور آج کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں اس کی صلاحیت اور سوجھ بوجھ پر تشکیل پائیں گی۔

گویا ہندوستان کے مسلمانوں کے رویئے پر ایک حد تک ہندوستان اور اسلام دونوں کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان اگر ہندوستان کی قومی جمہوریت کو کامیاب بنانے میں تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں تو ایک طرف وہ اپنے لئے ایک مرکز، ایک محور پاتے ہیں۔ ہندوستانی قوم سے گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی انہیں اپنے آپ کو پانے کا موقع دے گی اور قوم ان کی وجہ سے قدیم ہند کے تخیل سے آزاد ہو کر، ہندوستان کی پوری تاریخ اور اس کی مشترک تہذیب سے لو لگانے میں فخر سمجھے گی۔ یہ کام ایک حد تک تو زمانہ کرائے گا، اور ہمارا بیدار طبقہ اس کے لئے کوشش بھی کر رہا ہے، اگر پھر پوری قوم کے یہاں قدیم و جدید کی ایسی شدید کشمکش نہ رہے گی جو اس کی ترقی کی رفتار پر برا اثر ڈال سکے۔ پھر اسلام کے عالمگیر مشن کے لئے بھی یہ ایک تجربہ ہوگا۔ دنیا کا نقشہ اب کچھ اس طرح کا بن رہا ہے کہ ایک ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے قابل لحاظ تعداد میں ملتے ہیں۔ ایسے بہت سے ملک ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوتے ہوئے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کے عمل سے پوری قوم کی رفتار پر اثر پڑتا ہے۔ ایسے ملکوں میں ہندوستان کی ایک

خاص اہمیت ہے۔ اس لئے ہندوستانی قوم اگر اپنے جمہوری نظام، قومی بنیاد، غیر مذہبی ریاست کے تصور کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری دیکھنا چاہتی ہے تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو خوش اور مطمئن رکھے اور ان کے روحانی سرمائے کو جو اسلام کے نام سے دنیا کے سامنے ہے، اپنالے اور اس سے حسب توفیق مدد لے۔ یہ مدد شراب بندی کے قوانین اور ہندو کوڈ بل کے سلسلے میں اب بھی لی جارہی ہے اور ابھی اس سلسلے میں بہت سے امکانات ہیں۔

سیاسی اعتبار سے ہندوستان دو بڑے گروہوں کے درمیان ناطرفداری کی پالیسی پر چل رہا ہے۔ امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود ہندوستان میں ہمیشہ نہیں نافذ کیا جا سکتا۔ اسی طرح کمیونزم کی فطری اپیل کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کمیونزم اختیار نہیں کرے گا۔ ہاں ہماری قومی جمہوریت نے سوشلزم کو اپنی منزل قرار دیا ہے اور اقبال تک یہ کہہ چکے ہیں کہ "اسلام بھی ایک قسم کا سوشلزم ہے"۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی قومیت کے جمہوری تصورات، غیر مذہبی حکومت اور سوشلزم کی منزل میں ایک مسلمان کے لئے نہ صرف ذہنی تسکین کا بلکہ حوصلے اور ولولے کا سامان بھی موجود ہے۔ مسلمان اگر ایسی جماعتوں کا ساتھ دیتے ہیں جن کی پالیسی ان مقاصد کے سلسلے میں واضح ہے تو وہ اس طرح ملک کی بھی خدمت کرتے ہیں اور اپنی بھی۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمان اسلام کے سچے پیرو ہوتے ہوئے ہندوستانی قومیت کے علم بردار رہ سکتے ہیں۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ حسن تدبیر سے دور کی جا سکتی ہیں۔ رکاوٹوں کی ذمہ داری میں سب شریک ہیں۔

۲۔ قومیت کا تصور جیسے جیسے فروغ پاتا جائے گا اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا جائے گا۔ اسی نسبت سے اکثریت میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کو متعین کرنے کا جذبہ کمزور ہوگا اور اگر اقلیت مذہبی بنیاد پر سیاست نہیں چلائے گی تو یہ عمل اور جلد ہوگا۔

۳۔ ہر گروہ کو علاوہ ایک روحانی مرکز کے ایک دیوی مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسا مرکز قومیت فراہم کر سکتی ہے۔ اس کا مذہب اس دینوی مرکز کے راستے میں حایل نہیں ہوتا۔

۴۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دینوی۔ سیاسی اور کاروباری مفادات دوسرے مذہب کے ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہیں۔ ایک مسلمان کلرک کا مفاد ایک ہندو کلرک کے ساتھ، ایک مسلمان اُستاد کا ہندو استاد کے ساتھ، ایک مسلمان سرمایہ دار کا ہندو سرمایہ دار کے ساتھ ہے۔ نظام حیدرآباد نواب رام پور یا بمبئی کے مسلمان سیٹھوں کے ساتھ نہیں۔

۵۔ جس طرح ہندو مہاسبھا، رام راجیہ پرشد اور جن سنگھ کی مذہبی بنیاد پر سیاست غلط ہے، اسی طرح مسلم لیگ یا جماعت اسلامی کی سیاست بھی غلط ہے بلکہ اقلیت میں مذہب کی بنیاد پر سیاسی جدوجہد، اکثریت میں غلط جذبات کو اور اشتعال دے سکتی ہے۔

۶۔ ہندوستان میں اسلام کی خدمت کے لئے غیر مذہبی ریاست نے راستہ کھول دیا ہے۔ آسے انہیں حقیقت بنانا چاہیے کہ ہر منزل پر اس پر عمل ہو۔ مسلمان ایسا کر سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کے لئے دوسروں میں میلان پیدا کر سکتے ہیں۔

۷۔ اقلیت کو اپنا جمہوری حق ضرور مانگنا چاہیئے، مگر قومی زندگی میں بھرپور شرکت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پہلے حق ملے تب مدد ہو۔ فرائض کے ادا کرنے میں سودے بازی نہیں چلتی۔

۸۔ مولانا آزاد نے سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اپنی تفسیر قرآن کے ذریعہ اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اپنی زندگی کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ قومی زندگی میں دل وجان سے شرکت ہی اقلیتوں کے لئے صحیح راہِ عمل ہے۔ ان کی یاد کافی نہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔

۹۔ وفاداری ریاست (اسٹیٹ) سے ہوتی ہے۔ حکومت سے نہیں، قوم سے ہوتی ہے کسی سیاسی

پارٹی سے نہیں۔

۱۰۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق خواہ کسی سیاسی پارٹی سے ہو انہیں ہر حال میں ریاست سے اپنا رشتہ مضبوط رکھنا چاہیئے۔ رشتے کا تعلق ذہن اور دل سے ہے، اسے کسی دکھاوے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ رشتہ موجود ہے تو اچھی بات ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اسے پیدا کرنا چاہیئے، مصلحت یا خوف سے نہیں اصولی طور پر۔ اقبال نے درست کہا ہے ؎

"پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

۱۱۔ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو قومی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بہت بڑی تحریک کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے کام میں دیر کی گئی تو نقصان ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں سرسید کی مثال مفید ہو سکتی ہے جس طرح سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے ایک ذہنی انقلاب برپا کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جذباتیت اور مشرقیت کے محدود تصور سے نکال کر عقلیت اور آفاقیت کی طرف لائے، اس طرح آج ایک اور تہذیب الاخلاق کی ضرورت ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف قومیت سے ہم آہنگ کرے، دوسری طرف عالمی افکار کو جذب کر کے، ان کو اس قابل بنائے کہ وہ موجودہ دور میں اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

۱۲۔ اس کام کے لئے ایسے مسلمان ہی آگے آسکتے ہیں جن کا حکومت سے تعلق نہ ہو۔ ان کے لئے قدیم وجدید دونوں علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ آج وہی لوگ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کر سکتے ہیں جو ایک طرف اسلام کی تعلیم سے اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں، دوسرے جو ہندوستان کی تاریخ کا اور اس کے ادبی سرمائے کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوں اور تیسرے جن کا ذہن جدید علوم کی روح تک پہنچے اور ان سے اپنے طور پر کسب فیض کرنے کے قابل ہو۔

۱۳- ہمارے یہاں ہر تحریک سے بہت جلد نتائج کی توقع ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہر جماعت سبز باغ دکھاتی ہے اور اس کے سامنے نتائج کی تصویر اس طرح آتی ہے جس طرح مشین میں اکنّی ڈالی اور ٹکٹ نکل آیا۔ قومی زندگی میں صالح رجحانات کی تعمیر بڑا خلوص، پیہم ریاض اور ناقابل شکست حوصلہ چاہتی ہے۔ اس لئے اس لائحہ عمل کو فوری سیاست کے خطوط پر نہیں ذہنی اور تہذیبی سطح پر چلانا چاہیئے۔ اس کے نتائج خواہ دیر میں نکلیں مگر وہ دیرپا ہوں گے۔ بقول ثاقب لکھنوی ؎

مکاں منعم کا سونے سے بہ خون دل ہی بنتا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

مولانا آزاد کی شخصیت کی چند جھلکیاں

مولانا غلام رسول مہر

مولانا آزاد مرحوم و مغفور کی وفات کو پانچ سال پورے ہو گئے، چھٹا شروع ہوا ہے جس طرح دن ہفتے اور ہفتے سال بنے، اسی طرح سال قرن اور قرن صدیاں بنتے جائیں گے۔ مولانا کے وجود گرامی کی بدولت جو مسندِ ارشاد و ہدایت جنت نگاہ اور فردوسِ قلب و روح تھی، وہ دوبارہ خدا جانے کب ویسی ہی ضیا باریوں اور جلوہ کاریوں سے مطلع انوار کی صورت اختیار کر سکے زمانے کے انداز بدل گئے۔ وہ سانچے ہی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے، جن میں دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں اور فکر و عمل کی نادرِ روزگار استعدادیں تربیت پا کر ابو الکلام آزاد بن سکتی تھیں۔ دین و سیاست، علم و تحقیق، فلسفہ و حکمت، ادب و شعر، دعوت و ارشاد، غرض کونسا دائرہ تھا، جس میں مولانا کے فضائل و کمالات سب سے جداگانہ انداز میں بصیرت افروز اور حقائق آزمونہ ہوئے؟ محاسن و مکارمِ عمل کا کون سا میدان ہے، جس میں انھوں نے متواتر چھیالیس برس تک علم برداری کی عظمت و شان کے ساتھ جہاد کی دعوتیں نہ دیں؟ کیا کہا جا سکتا ہے کہ کتنی مختلف النوع زندگیاں ایک وجود میں سمٹ آئی تھیں؟ کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کا جو بھی پہلو سامنے آجاتا تھا، وہ یگانگی یکتائی میں سراسر حیرت افزا نہ ہوتا تھا؟ ایسی شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں، وہ کہاں سے لائی جائیں اور اپنے مافی الضمیر کو مناسب سلیقے سے کیونکر معرضِ تحریر تک پہنچائیں۔

پھر بتانے کی خیرہ ذوقی و سلجھت دوستی کچھ کم حوصلہ فرسا نہیں کہ اس اعجوبۂ دہر وجود مبارک و مسعود کے چند نمایاں اوصاف کا سرسری ذکر بھی کرتے وقت دس مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔

بات کہاں سے شروع کی جائے اور کونسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے کہ جو کچھ کہنا مقصود ہے کہا جا سکے۔ وہی مرزا غالب والا معاملہ ہے ۔

نے فروشم در تموز و کلبہ دُود از چار سُو ست
مے رود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

نپولین کی اطالوی مہم

فرانس کی پہلی جمہوریت کے ڈائرکٹروں نے نپولین کو اطالوی مہم کا سالارِ اعظم بنایا تھا تو ایک ڈائرکٹر کی زبان سے بے اختیار نکل گیا : " جنرل! آپ کی عمر بہت کم ہے "۔ نپولین نے برجستہ جواب دیا : " ایک سال میں یا تو میں بوڑھا ہو جاؤں گا یا مر جاؤں گا "۔ یعنی یا تو ایک سال میں ایسے کارناموں کے انبار لگا دوں گا جو ہمیشہ درخشاں رہیں گے اور انھیں معمر و سن رسیدہ جرنیل بھی باعثِ فخر و مباہات سمجھیں گے یا کسی میدانِ کارزار میں گولی میری زندگی کا خاتمہ کر دے گی ۔

اس وقت نپولین ستائیس سال کا تھا اور واقعی ایک سال کی مدت میں وہ اپنے کارناموں کی بدولت سکندر، ہنی بال اور سیزر جیسے یگانہ سالاروں کی صف میں پہنچ گیا تھا اور فنِ حرب میں ایک یک قلم نئے دور کی بنیاد پڑ چکی تھی ۔

انجمن حمایت اسلام میں تقریریں

مولاناؒ نے پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی تھی تو وہ عمر کی سولھویں منزل میں تھے اور اس زمانے میں انجمن کے سٹیج پر ممتاز اصحاب علم و فضل کو بھی بہ مشکل بار ملتا تھا۔ یہ تقریر اتنی مسلسل، مربوط، مدلّل اور عام تقریروں سے بہ ہر لحاظ اتنی مختلف تھی کہ مولانا ثناء اللہ مرحوم و مغفور نے فرمایا : " ہم تو تھے پسنجر ٹرین، ہمارے بعد کلکتہ میل آ رہی ہے "۔ اس زمانے میں کلکتہ میل کو رفتار کی تیزی اور ہنگامہ خیزی کے باعث تمام ٹرینوں پر بدرجہا فوقیت حاصل تھی۔ مولانا آزادؒ کے وطن کی نسبت سے کلکتہ میل کے ساتھ تشبیہہ میں جو لطف تھا، وہ تشریح سے بے نیاز ہے۔

یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ تھا۔ آئندہ سال مولاناؒ دوسری مرتبہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے (منعقدہ اپریل ۱۹۰۵ء) ۲۲ اپریل کو انھوں نے تقریر فرمائی۔ اس کا موضوع تھا: اسلام زمانۂ آئندہ میں"۔ اس وقت مولاناؒ سترھویں سال میں تھے۔ یہ تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ صدر اجلاس نے حاضرین کو خوش خبری سنائی، آزاد صاحب کل پھر تقریر فرمائیں گے۔ چنانچہ ۲۳ اپریل کو مولاناؒ نے دوبارہ تقریر کی۔ انجمن کی روداد مظہر ہے کہ تقریر پر صدر اجلاس نے:

"لیکچرار کی خوش بیانی نہیں، جادو بیانی کی داد دی اور ان کی درازئ عمر کے لئے دعا کی"۔

مولاناؒ کے بڑے بھائی بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔ انھوں نے بھی تقریر نیز ایک نظم سنائی انجمن کی روئداد میں ان کا تعارف یوں کرایا گیا ہے: "آزاد صاحب کے بڑے بھائی مولوی غلام یسین صاحب آہ"۔

شہرت سے بے پروائی

سترہ سال کی عمر میں مولاناؒ کی سحر بیانی کے کرشمے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ اب شہرت واشاعت سے بے نیازی کی شان دیکھیے۔ انجمن کی روئداد میں ایک جگہ مرقوم ہے:

"افسوس ہے کہ باوجود متعدد تقاضوں کے آزاد صاحب نے لیکچر قلمبند کر کے نہیں دیا اور اس لئے شامل روئداد نہیں ہو سکا"۔

دوسری جگہ لکھا ہے:

"چونکہ یہ تقریر قلم بند ہو کر نہیں ملی، اس واسطے درج نہیں کی جاتی"۔

مگر مولانا کے بھائی ابوالنصر غلام یسین آہ کی تقریر اور نظم دونوں اس روئداد میں شامل ہیں۔

گویا عمر کے ابتدائی مراحل میں بھی مولاناؒ کی طبیعت کو صرف ضروری کاموں سے دل بستگی تھی۔ یہ خواہش نہ تھی کہ ان کا نام اچھلے اور ان کی تقریریں روئدادوں میں چھپیں، حالانکہ اس عمر میں اکثر نوجوانوں کی دلی آرزو یہی ہوتی ہے کہ ان کی کہی ہوئی ہر بات انتہائی اہتمام سے اشاعت

پاتے۔ مولاناؒ کے دوسرے اوصاف وخصائص کی طرح شہرت وناموری سے بے نیازی بھی قدرت کی ایک خاص بخشش تھی اور جن لوگوں کو مولاناؒ کی زندگی کے حالات سے واقفیت ہے، وہی اس بے نیازی کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مولانا کا عقیدہ

جو کچھ انھوں نے کہا یا لکھا یا کیا، اس کی حفاظت کے اہتمام سے بے پروائی میرے نزدیک ان کے اس عقیدے کا نتیجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہستی کے قیام واصلاح کے لئے بقائے انفع“ کا قانون ٹھہرا دیا ہے۔ یہاں وہی چیز باقی رہ سکتی ہے، جس میں نفع ہو۔ جس میں نفع نہیں وہ ٹھہر نہیں سکتی اور نابود ہو جائے گی۔ یہی حقیقت "حق" اور "باطل" کی ہے۔ "حق" وہ ہے جو نافع ہو۔ ٹکنا، ثابت ہونا اور باقی رہنا اس کا قدرتی خاصہ۔ باطل وہ ہے جو نافع نہیں، اس لئے اس کا قدرتی خاصہ ہی یہ ہوا کہ مٹ جائے اور محو ہو جائے۔ قرآن نے "اصلح" نہیں "انفع" کی اصطلاح استعمال کی، کیونکہ "صالح" وہی ہے جو نافع ہو۔ کارخانہ ہستی کی فطرت میں بناوٹ اور تکمیل ہے اور تکمیل جبھی ہو سکتی ہے کہ صرف نافع اشیاء باقی رکھی جائیں، غیر نافع چھانٹ دی جائیں۔

انھیں یقین تھا کہ اگر ان کے دل ودماغ کے نتائج نافع ہیں تو بہر حال محفوظ رہیں گے، اگرچہ ان کی حفاظت کے لئے کوئی خاص اہتمام وہ خود نہ کر سکیں۔ اگر نافع نہیں تو حفاظت وپاسبانی کے سینکڑوں سہارے مہیا کر دینے کے باوجود وہ چھانٹ دیئے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر علمی، ادبی، ثقافتی یا دینی ادارے کی حفاظت وترقی کے لئے ہر ممکن انتظام فرمادیا مگر اپنے افادات کی حفاظت کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ تاہم بقائے انفع کے قانون کی کارفرمائی دیکھئے کہ وہ افادات محفوظ ہوتے رہے، ہو رہے ہیں اور ہوتے جائیں گے، کیونکہ وہ نافع ہیں اور ان کا نفع وقتی نہیں، دوامی ہے۔

"الہلال" اور صحافت

انجمن حمایت اسلام کی جس تقریر کا ذکر میں نے پہلے کیا، اس سے تقریباً سات سال بعد

مولانا نے "الہلال" جاری کیا جس کی کوئی مثال تاریخ صحافت اردو میں نہ پہلے موجود تھی اور نہ اس کے بعد آج تک منظر عام پر آسکی، حالانکہ پہلے "الہلال" کے ظہور پر آج باون سال پورے ہو رہے ہیں اور دوسرے "الہلال" کی بندش پر بھی چھتیس سال گزر چکے ہیں۔ مولانا نے تنہا اس کے اجرا کی ذمہ داری قبول کی تھی اور وہ یقیناً علم وفضل کا تاور گنجینہ تھے، مگر ارباب ثروت میں شمار نہیں ہوتے تھے جو صرف صحیفہ نگاری کے شوق میں اپنا سرمایہ لٹا دینے پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ اس وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال کی تھی اور اخبار نویسی کی کل مدت کتنی ہوئی؟

۱۔ "الہلال" (دور اول) دو سال چار مہینے

۲۔ "البلاغ" (ایک سال کے وقفے کے بعد، صرف پونے پانچ مہینے

۳۔ "الہلال" (دورِ ثانی") چھ مہینے

کل زیادہ سے زیادہ سوا تین سال۔

وسعتِ نظر اور اصابت رائے

اگر اس مختصر سی مدت کے کارناموں پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ اس میں بتانا ہوگا کہ چوبیس سال کے اس نوجوان نے اچانک نمودار ہو کر علم وعمل اور فکر ونظر کے دوائر میں کیسے بنیادی انقلاب پیدا کر دیئے؟ ہر گوشے پر کتنے گہرے اثرات ڈالے کون سا معاملہ تھا جو مولانا کے سامنے آیا اور اس پر ایسی سیر حاصل، دل نشین اور یقین افروز بحث نہ کی گئی کہ اس بارے میں دوبارہ کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی۔ پھر ہر رائے پختہ، صائب محکم، اس قدر سوچی سمجھی ہوئی اور اس درجہ جچی تلی کہ دوسرے کے لئے معقول اختلاف کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فرد فریدنے پیش آنے والی ہر منزل کا پہلے ہی سے پورا جائزہ لے رکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں کام کیوں کر انجام پانا چاہیئے فلاں مرحلہ کس سروسامان کے ساتھ طے کرنا چاہیئے؟ فلاں گھاٹی سے گزرنے کی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ اگر میں یہ کہوں کہ مولانا نے ہر مسافت کے موڑ شمار کر لیتے تھے، ہر راستے کے

پتھر گن رکھے تھے اور ہر دشت پیمائی کے خارزاروں کا حساب لگالیا تھا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا، بلکہ اسے حقیقت کا ایک دھندلا سا خاکہ تصور کرنا چاہیئے۔

مختلف پہلو

پھر بعض اور پہلو بطور خاص وضاحت طلب ہیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کی ہر توضیح، ہر تبیین اور ہر تصریح مستفسر یا معترض کی محض دماغی خلش ہی دور نہ کر دیتی تھی، بلکہ دل و روح کے لئے بھی انتہائی تسکین و طمانیت کا پیغام ہوتی تھی۔ یہ دولت انھیں انبیائے کرام کے طریق دعوت و خطاب کے تتبع سے ملی۔ ان کی تحریریں محض علمی اعتبار ہی سے یگانہ نہیں ہوتی تھیں، بلکہ حد درجہ یقین افروز بھی تھیں اور ان سے ایمان میں تازگی و شگفتگی آتی تھیں۔

۲۔ وہ اپنے عقائد میں چٹان کی طرح ثابت و مستقیم تھے، مگر مقام دعوت میں کبھی کسی اسلامی فرقے سے انتساب قبول نہ کیا اور حق جس فرقے کی جس بات میں نظر آیا، اسے بے تکلف پیش کیا۔

۳۔ وہ ہر معاملے میں نیک کو بد سے اور حق کو باطل سے الگ کر لیتے تھے۔ اسی طرح اصول و فروع میں امتیاز قائم رکھتے تھے۔ اچھائی اور سچائی کو ان کے یہاں بہر حال تقدم حاصل تھا اور اس کی تائید و حمایت میں کبھی انھوں نے تامل نہ کیا، اگرچہ وہ ان کے سخت مخالفوں ہی میں ہوتی تھی۔ یہ خصوصیت ان سے پہلے بہت کم دیکھنے میں آئی۔

۴۔ ان سے پیشتر یہ دستور تھا کہ جب کسی پر ابتلاء کا دور آتا تو عموماً آہ و زاری و افسوس شروع ہو جاتا مگر مولانا نے ابتلاؤں کا خیر مقدم اس شانِ محبوبیت سے کیا کہ لوگوں کے دل سے ہر قسم کا ہراس کلیتہً زائل ہو گیا، بلکہ لوگ ابتلاؤں کی طرف مجاہدانہ پیش قدمی کرنے لگے، کیونکہ یہ سفر جہاد آزادی کی ناگزیر منزلیں تھیں۔ مولانا کا یہی نقطۂ نگاہ تھا

جس نے رفتہ رفتہ حکومت کو تدابیر تشدد میں ایک مدت تک متوقف کر دیا، کیونکہ وہ بے سود ثابت ہو رہی تھیں۔ خواجہ حالی کا یہ شعر تو سب پڑھتے تھے، مگر اسے رشحِ عوام بنا کر دلوں میں اتار دینے کا کام صرف مولانا آزادؔ کے ہاتھوں پورا ہوا:

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

"الہلال والبلاغ" کے متعلق متعدد غلط فہمیاں، مختلف اصحاب تحریرات میں نظر آئیں، لیکن اس موضوع پر رشتۂ بیان کھل جائے تو کوئی دوسرا معاملہ پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی، لہٰذا میں اس بحث کو کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

خلافت کانفرنس

اواخر مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا کے لئے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ اس وقت تک بعض دوسرے صوبوں میں بھی ان کا داخلہ ممنوع قرار پا چکا تھا۔ بہار کے سوا وہ کسی صوبے میں جا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ کلکتہ سے رانچی چلے گئے۔ اس وقت تک امید تھی کہ وہ رانچی سے مضمون بھیجتے رہیں گے اور "البلاغ" جاری رہے گا، مگر چند روز بعد رانچی میں انھیں نظر بند کر دیا گیا اور دعوت و تذکیر کے جاری رکھنے کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو وہ نظر بندی سے رہا ہوئے۔ چند روز رانچی میں بھی ٹھہرے رہے تاکہ اپنے کاغذات اور کتابیں سمیٹ سکیں۔ اور یہی ان کا سب سے قیمتی سامان تھا۔ اوائل جنوری ۱۹۲۰ء میں کلکتہ پہنچے۔ ۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا اور خود مولانا کو اس کانفرنس کا صدر چن لیا گیا۔ دو ماہ سے بھی کم مدت میں گوناگوں مصروفیت کے باوصف انھوں نے خطبۂ صدارت مرتب کیا، جو دو صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کی شرعی حیثیت انتہائی تفصیل سے مدلل و دلنشیں انداز میں واضح کی گئی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے سامنے تفصیل سے لائحۂ عمل پیش کر دیا گیا جس سے

اس شہرۂ آفاق تحریک کی بنیاد پڑی، جس نے یہاں "ترک موالات" اور "لاتعاون" کا نام پایا۔ واضح رہے کہ کانگریس نے لاتعاون کی قرارداد اگست ۱۹۲۰ء میں منظور کی تھی اور مولانا اس کی تحریک چھ مہینے پیشتر فرما چکے تھے۔ اس وقت تک لوگوں کے کان بھی لاتعاون اور ترک موالات کے ناموں سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مولانا کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال کی تھی۔

خطبے کی شانِ یگانگی

یہی خطبہ تھا، جو ترک موالات کی پوری تحریک میں مسلمانوں کے لئے روشنی کی قندیل بنا رہا۔ اسی سے خلافت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کے لئے شرعی، عقلی اور سیاسی دلیلیں حاصل کی گئیں۔ اسی سے مسلمانوں کو ملی قومی اور اجتماعی فرائض معلوم ہوئے۔ بعد ازاں طول و عرض ملک میں جتنے خطبے دیئے گئے، جتنی تقریریں ہوئیں، دعوت و ارشاد کی جتنی مسندیں آراستہ کی گئیں، اخباروں نے تحریک کی حمایت میں جو کچھ لکھا، ان سب کا سرچشمۂ معلومات مولانا کا یہی خطبہ صدارت بنا رہا۔ میں بلند آہنگیوں کا نہ عادی ہوں اور نہ انھیں پسندیدہ سمجھتا ہوں۔ تاہم یہ خطبہ آج بھی مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ آپ زیر غور موضوع کے متعلق پیشتر اور بعد کے ذخیرۂ کتب یا انبارِ مضامین دعوت و ارشاد پر ایک غائر نظر ڈال لیں اور فرمائیں کہ آیا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز میسر آتی ہے؟ ہدایت و رہنمائی کے مآخذ نئے نہ تھے اور ہو بھی نہیں سکتے تھے، کیونکہ مسلمانوں کے لئے کتاب و سنت سے باہر نورِ ہدایت کا وجود ہی نہیں۔ مولاناؒ نے خالصتہً کتاب و سنت کے نصوص سے سب کچھ پیش کیا، مگر وقت کے خاص ماحول، خاص تقاضوں اور خاص ضرورتوں کے پیش نظر جس کمالِ بلوغ نظر سے قوم و ملت کو کتاب و سنت کی روشنی دکھائی اور اس کے مطابق چلنے کی دعوت دی، اس کی کوئی مثال ذخیرۂ ماضی سے سامنے لانا مشکل ہے!

قومی زندگی کی پانچ چیزیں

مثالیں بے شمار ہیں، مگر میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو پانچ باتوں کا حکم دیا، یعنی: جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد۔ یہ حدیث آپ نے بارہا سنی ہوگی، لیکن اس کی تشریح جس طرح مولانا نے خطبہ صدارت میں فرمائی۔ اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ "جماعت" سے مقصود افراد کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔ پھر ایک ایک چیز کو کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اتحاد سے مقصود ہے کہ افراد جماعت اعمالِ حیات میں منتشر نہ ہوں، ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ائتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ایک صحیح اور مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ امتزاج میں کمیت سے زیادہ کیفیت پر زور دیا گیا ہے۔ نظم سے مقصود وہ ترتیبی و تنظیمی حالت ہے، جب جماعت کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائروں میں محدود اور اپنے اپنے اعمال و فرائض انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

۲۔ دوسری چیز سمع ہے یعنی امام جو حکم دے اسے سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔

۳۔ تیسری چیز اطاعت ہے، یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا۔ البتہ طاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں۔

۴۔ ہجرت کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا، لیکن سوچیے کہ کیا دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی ہجرت کی حقیقت سے خالی ہیں؟ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں انہیں چھوڑ دینا، آرام و راحت، مال و دولت، ملک و وطن، اہل و عیال سب اس

میں شامل ہیں۔

۵۔ جہاد کے معنی ہیں، دفع اعدا میں اپنی جان ومال سے کمال درجہ سعی ومحنت کرنا کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی گھر، کوئی وجود جہاد کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟ جس چیز کو ہزاروں ناموں اور لفظوں سے بولا جاتا ہے، اس کو اسلام نے ایک جامع لفظ جہاد سے تعبیر کیا ہے۔

عالم گیر صداقتیں

اس تشریح کے بعد جس کا خلاصہ میں نے چند فقروں میں پیش کر دیا، فرماتے ہیں:

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے قیام بقا کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، جس کی ہستی ان پانچ چیزوں سے مرکب نہ ہو۔ سعی وعمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے ممکن نہیں۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے، مگر کوئی چیز بغیر جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب انھیں پانچ سچائیوں کے ثمرات ونتائج نکلیں گے...... جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت اور جہاد دنیا کی وہ عالم گیر صداقتیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فرد وبشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے۔ ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے۔ ہر عامل جماعت شب وروز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے انھیں تعبیر کیا ہے، ان سے دنیا کو اختلاف ہے، لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایک خاص شرف یہ عطا کیا تھا کہ دینی حقائق کو زمانۂ حال کی زبان میں اس طرح پیش کرتے تھے کہ وہ دل میں پیوست ہو جاتے تھے۔ دیکھیے منبروں سے یہ الفاظ برابر سنائے جاتے رہے، مگر کہنے والوں کا احساس بھی غالباً یہی تھا کہ یہ پرانی باتیں ہیں اور سننے والوں کے نزدیک بھی ان میں مذہبی تقدس کے سوا کچھ نہ تھا، مگر مولانا نے ان کی تشریح کی تو واضح ہو گیا کہ یہ تو ابدی حقائق اور عالم گیر صداقتیں ہیں جن کے بغیر کوئی قوم، کوئی جماعت اور کوئی جمعیتہ بلکہ کوئی ہستی زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

خطاب بہ ملت

اس خطبے کے آخر میں کس درد و سوز سے ملت کو خطاب کیا ہے:

عزیزانِ ملت! اس طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ وہی افسانۂ کہن ہے، جو پچھلے دس سال سے برابر دہراتا رہا۔ اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظے میں فراموش نہیں ہو گئیں تو تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدا بلند کر رہا ہوں اور "صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے ...... تمہاری اطاعت جس قدر سہل اور تمہاری ارادت جتنی سستی ہے، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے ..... میری رائے میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی نہ میرے سفر میں یمین و یسار کا تذبذب پیش آیا۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ اور انسانوں اور قوتوں کا اتباع اس کا منبع ہے، لیکن ان عقاید میں کبھی تبدیلی

نہیں ہوسکتی، جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں۔ الحمدللہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا، وہ میرے معلومات تھے، آراء و مظنونات نہ تھے.....

تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کیا کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کرو، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا خوگر ہوں اور صرف بادلوں کو دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو، فستذکرون، ما اقول لکم وافوض امری الی اللہ، ان اللہ بصیر بالعباد۔

اعترافِ جرم

مولانا تقریباً پونے چار سال رانچی میں نظر بند رہنے کے بعد رہا ہوئے تھے، اس خطبۂ صدارت سے پونے دو سال بعد انھیں تحریک ترک موالات کے قائد و رہنما کی حیثیت میں گرفتار کر لیا گیا دفعہ ۱۲۴، الف کے تحت مقدمہ چلا اور انھوں نے وہ بیان دیا، جو "قول فیصل" کے نام سے مشہور ہوا۔ داعیانِ حق و انصاف کے خلاف جتنے مقدمے آج تک چلے، ان میں سے سب کے بیان محفوظ نہیں۔ آخری دور کے بیانوں میں سے میرے نزدیک آئرلینڈ کے محب وطن رابرٹ ایمٹ کا بیان بہ طور خاص قابلِ ذکر ہے، لیکن مولاناؒ کا بیان بے شائبہ مبالغہ اس سے بھی بدرجہا بہتر تھا۔ استغاثے میں کہا گیا تھا کہ مولانا نے دو جگہ ایسی تقریریں فرمائیں، جو دفعہ ۱۲۴۔ الف کی زد میں آتی ہیں۔ مولاناؒ نے اپنے بیان میں استغاثے کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا پھر فرمایا:

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے صرف انہی دو موقعوں پر نہیں بلکہ گزشتہ دو سال (۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء) کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴۔ الف کا جرم قرار دیا جائے گا میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا

اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مجرم سمجھوں۔

یقیناً میں نے کہا ہے کہ موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے، لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا، کیوں مجھ سے توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے ..... جو چیز بُری ہے، اسے یا تو درست ہو جانا چاہیئے یا مٹ جانا چاہیئے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟

آج یہ الفاظ محض ایک روح افروز خواندگی ہیں لیکن اپنے تصور کو آج سے ۳۲ سال پیشتر کے دور میں لے جائیے، جب حکومتِ برطانیہ نے وسیع اور ہمہ گیر قومی تحریک کو دبانے کے لئے پورے زور سے تشدد شروع کر رکھا تھا اور زخمی شیر کی طرح غیظ و غضب کی تلملاہٹ اس کے ہر اقدام میں نمایاں تھی۔

ظلم کے دلائل

پھر ایک ایک پہلو واضح کیا کہ گورنمنٹ کیوں ظالم ہے مثلاً اس لئے کہ:

۱۔ شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے۔

۲۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا، جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو، وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے،

۳۔ قومی اور مسلم بیوروکریسی بھی ظلم ہے۔

۴۔ بلاشبہ مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شاہنشاہی کے پُرشوکت افسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ، جو بسا اوقات پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح رہتا تھا، انہوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی۔ تاہم تاریخ اسلام کا کوئی

عہد بھی اپنے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا، جنھوں نے علانیہ حکام وقت کے استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو۔

۵۔ ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔

۶۔ قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے: "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے"۔

۷۔ قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے: ایمان، عمل صالح توحید حق، اور توجیہ صبر۔

درخشاں مثالیں

پھر فرمایا: اسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔الف نہیں اور تاریخ اسلام سے اس کی مثالیں پیش کیں۔ مثلاً:

الف:۔ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے طاؤسؒ یمانی کو بلایا تو انھوں نے ہشام کا نام لے کر سلام کیا "امیرالمومنین" نہ کہا۔ ہشام نے سبب پوچھا تو کہا: "قوم تیری حکومت سے راضی نہیں، اس لئے تجھے ان کا امیر کہنا جھوٹ ہے۔"

ب:۔ مالکؒ بن دینار بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کرتے تھے: "خدا نے ان ظالم بادشاہوں کو اپنے بندوں کا چرواہا بنایا تھا، مگر انھوں نے بکریوں کا گوشت کھا لیا، بالوں کا کپڑا بن لیا اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں۔"

ج:۔ ہارون الرشید نے سفیانؒ ثوری کو اپنے ہاتھ سے اشتیاق ملاقات کا خط لکھا انھوں نے خط لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "جس چیز کو ایک ظالم کے

نے بھجوایا ہے، میں اسے چھونا نہیں چاہتا۔" خط کا مضمون سنا تو اس کی پشت پر جواب لکھوا دیا، جس کی ابتدا یہ تھی: "خدا کے مغرور بندے ہاروں کے نام جس کا ذوق ایمان سلب ہو چکا ہے۔ اسے معلوم ہو کہ تو نے قوم کا مال بلا کسی حق کے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں لٹایا...... الخ

مجسٹریٹ، سرکاری وکیل اور خفیہ پولیس

غرض صاف صاف یہ اعتراف کر لیا کہ میری زندگی سرتاسر دفعہ ۱۲۴۔الف ہے۔ آخر میں فرمایا کہ میں اپنے ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں جو اس مقدمے میں میرے خلاف کام کرتے رہے۔ سی۔آئی۔ڈی کا کام شرارت اور جہالت دونوں سے مرکب ہوتا ہے، مگر میری جو تقریریں پیش کی گئیں، ان کے اغلاط و نقائص غالباً ناقابلیت کا نتیجہ ہیں۔ پبلک پروسیکوٹر بھی میرا ہم وطن بھائی ہے۔ اس کا ضمیر بالکل میرے سامنے نہیں، صرف مزدوری ہے جو وہ اس کام کے لئے گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے۔ مجسٹریٹ سے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں، جو زیادہ سے زیادہ سزا اس کے اختیار میں ہے، بلا تامل مجھے دے دے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں:

> زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے بلا تامل دے دو، میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے وقت جتنی جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر بھی اضطراب سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔

آخری فیصلہ

پھر فرمایا:

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں شریک ہیں

ہمارے حصے میں مجرموں کا یہ کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ، اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلے لکھتے جاؤ۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

یہ فیصلہ نہ صرف لکھا گیا، بلکہ مولاناؒ کی زندگی ہی میں نافذ بھی ہوگیا اور جس حکومت کی ایک عدالت نے ۱۹۲۱ء میں مولانا کے لئے سزائے قید تجویز کی تھی، وہ حکومت ایک قرن سے افسانۂ ماضی بن چکی ہے اور اس کی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریئے

عبداللہ ولی بخش قادری

مولانا ابوالکلام آزاد جنوری ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور بقیہ تادمِ حیات اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ مولانا کی وفات فروری ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال وطنِ عزیز کے تعلیمی نظام کی تشکیل و تنظیم کے مسائل کو حل کرنے میں صرف کئے۔ ان کی قیادت میں ہماری تعلیم پر بجا طور پر قومی رنگ چڑھنا شروع ہوا اور ایک آزاد ملک کے تقاضوں کے مطابق ذہنی و تہذیبی ترقی کی راہیں کھلیں۔ اس زمانے میں مولانا نے اپنے فرائضِ منصبی کے تحت تعلیمی مسائل پر سرکاری اور نیم سرکاری مجالس مباحث میں بارہا اظہارِ خیال فرمایا۔ ان کے یہ تعلیمی خطبات نہ صرف اپنے زمانے کی حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی کے آئینہ دار ہیں بلکہ مولانا کے ذاتی تاثرات و نظریات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ ان میں مولانا کے تبحرِ علمی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اور لہجے کی بلند آہنگی میں مولانا کی عظیم شخصیت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ بسا اوقات مولانا نے ایک ہی خطبے کے دوران میں اپنے ذاتی تاثرات بھی بیان فرمائے ہیں اور حکومت کی نمائندگی بھی کردی ہے۔ مگر یہاں چشم بینا مولانا کی ذات اور وزیر تعلیم کی حیثیت کا فرق دیکھ سکتی ہے۔ یوں تو عموماً ذاتی اور منصبی حیثیت میں اتحادِ فکر کا ثبوت ملتا ہے لیکن کہیں کہیں دیانت دارانہ اختلافِ رائے کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ گمان کہ مولانا حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی کے محض ایک نقیب کی حیثیت رکھتے تھے، نہ صرف مولانا کی سیاسی حیثیت اور علمی وقار کے منافی ہے بلکہ ان کے تعلیمی خطبات سے غلط تصور بھی ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد میں انھوں نے خود یہ فرمایا ہے کہ میں نے

خطباتِ ابو الکلام مرتبہ پروفیسر محمد مجیب۔

تعلیم کے میدان میں جس پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا وہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہوگا۔ ان مسائل پر میرے خیالات یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کئے جا چکے ہیں" مولانا کا یہ اشارہ اپنی تقاریر کے اُس مجموعے کی طرف ہے جسے حکومت کے شعبہ اشاعت نے جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع کیا اور جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک کی منتخب تقاریر شامل ہیں۔ مولانا کے اس بیان کے بعد ان کی تعلیمی تقاریر کے محض "فرمودات منصبی" ہونے کا شبہ کسی طور باقی نہیں رہتا۔ دراصل تعلیمی معاملات میں مولانا کی بصیرت سے متعلق غلط فہمی ان لوگوں کو ہوا کرتی ہے جنھوں نے مولانا کو نہایت ہی محدود معنی میں ایک عالم دین یا سیاسی لیڈر تصور کر رکھا ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ مولانا انگریزی زبان و ادب بلکہ پوری مغربی تہذیب سے یکسر نا آشنا تھے۔ اگرچہ مولانا حقیقی معنی میں ایک مفکر اور عالم تھے۔ ان کا دائرہ عمل نہایت وسیع تھا۔ خدا نے انھیں غیر معمولی طور پر ذہین اور پیش رس پیدا کیا تھا۔ وہ طباع بھی تھے اور علم کے شیدائی بھی۔ انھوں نے صرف عربی ادب ہی میں کامل دست گاہ حاصل نہیں کی تھی بلکہ جملہ علوم مشرقی سے شغف رکھتے تھے۔ انھیں انگریزی زبان و ادب سے بھی واقفیت تھی اور وہ مغربی تہذیب و فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا نے بحر معنی کی شناوری کے ساتھ ساتھ بساطِ سیاست پر اوائل عمری ہی میں قدم رکھا اور وہ بھی ایک صحافی کی حیثیت سے۔ اور پھر ساری عمر کاروبارِ سیاست کے مرد میدان بنے رہے۔ اس لئے ان کی نظریں زمانے کے پیچ و خم سے خوب واقف تھیں۔ وہ مصالح ملکی بھی سمجھتے تھے اور تعلیم کا منصب بھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی کی نگاہِ جوہر شناس نے انھیں آزاد ہندوستان کی تعلیمی کشتی کی ناخدائی کے لئے سب سے زیادہ موزوں ٹھہرایا۔

مولانا نے مسندِ وزارت پر جلوہ افروز ہونے سے قبل بھی جا بجا اپنی نگارشات میں اپنے تعلیمی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے موقع پرستی کے تحت قلم دانِ وزارت نہیں سنبھالا تھا بلکہ اپنے مزاج کی مناسبت و مطابقت کے لحاظ سے قومی خدمت کی یہ راہ اختیار کی تھی۔ انھیں اقتضائے وقت خالی الذہن نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ ذہنِ پختہ، کارِ دلِ حق نگر اور چشمِ بصیرت سب ہی کچھ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو عقائد کا استحکام بھی حاصل تھا اور بالغ نظری کی کشادگی بھی۔ وہ ایک نابغۂ عصر

انسان تھے اور ان کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر اجتہادِ فکر کی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۹ء میں تذکرہ* کے اندر انھوں نے لکھا تھا کہ "انسان کے لئے معیارِ شرف جوہرِ ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے سارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں" ان کا یہ عقیدہ تمام زندگی ان کے ساتھ رہا۔ غبارِ خاطر میں کئی خطوط کے اندر اُن کے اِن احساسات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں .... بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گردوپیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کرسکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا"...... تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ عقائد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیئے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو"۔ ان بیانات میں نہ صرف نسل و ماحول کی حیثیت کا واضح تعین موجود ہے بلکہ اُن سے مولانا کے ترقی پسندانہ رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی اس اجتہادِ فکر، اصابت رائے اور مستقل مزاجی پر اس لئے اور حیرت ہوتی ہے کہ مولانا خود ایک نہایت ہی مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان کا سارا بچپن خاندانی افتخار و روایات کے گہوارے میں گزرا تھا۔

مولانا نے اپنے زمانے کے عام دینی رہنماؤں کی طرح مذہب کو ایک جامد اور مافوق البشر تصور تک ہی محدود و پابند نہیں کر رکھا تھا اور نہ وہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر سطحی عقلیت کے سیلاب میں بہہ نکلے تھے۔ وہ دینِ فطرت اور سائنس کے مقام کا بیک وقت

---

* تذکرہ مرتبہ فضل الدین احمد صفحہ ۲ شائع کردہ انارکلی کتاب گھر لاہور۔

شک رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء میں فلسفے، سائنس اور مذہب کے بارے میں بڑی صفائی سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "یہ فلسفہ، بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سرتاسر سلبی تسکین ہوتی ہے، ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا لیکن سائنس بھی ان کے نزدیک کچھ زائد وقیع نظر نہیں آتی۔ اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے عقیدے کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا"۔ اس کے بعد خود ہی سوال کرتے ہیں کہ "پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لئے نظر اٹھائیں تو کس طرف اٹھائیں؟" اور اپنے سوال کا خود ہی یوں جواب دیتے ہیں کہ "ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے"۔ اس کے بعد وہ مذہب کے منصب کی یوں وضاحت کرتے ہیں کہ "فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا، لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے"۔ غرض، مولانا مذہب کا ایک صحت مند تصور رکھتے تھے۔ انھوں نے اس مذکورہ بالا خط میں صاف صاف کہا ہے کہ "بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی ماورائی الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لئے باقی نہیں رہی"۔ وہ مذہب کی رواجی حیثیت کے قائل نہ تھے۔ اسی جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "عام حالات میں مذہب کا نشاندہ

اس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا"۔ انھوں نے ایسے مذہب کو "تقلیدی ایمان" کہا ہے جسے وہ سراسر جمود اور گمراہی کا سبب گردانتے تھے۔ وہ "حقیقی مذہب" کے قائل تھے جو "تحقیقی" ہوتا ہے "تقلیدی" نہیں ایسا مذہب ان کے نزدیک علم کے منافی نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی مطابقت کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "علم اور مذہب[۵۱] کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ یہ مدعیان علم کی خامکاریوں اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ ملتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر"۔ مولانا، انسانی زندگی میں مذہب کو بہت بڑا منصب دیتے ہیں اور اس کی مثبت حیثیت کے قائل ہیں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "بہر حال[۵۲] زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیئے، ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیئے"۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد ۱۸ فروری کی پریس کانفرنس میں تعلیم اور قومی تشکیل کے سلسلے میں جن چند اہم اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں سے ایک مذہبی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا۔ اس موقع پر بھی انھوں نے اسی بات پر زور دیا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیئے۔ تقریباً ایک سال بعد ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے حصول آزادی کے بعد منعقد ہونے والے پہلے اجلاس میں بھی انھوں نے اپنی صدارتی تقریر طلبہ کی مذہبی تعلیم سے متعلق کی اندر ملک کے سامنے مذہب اور مذہبی تعلیم کے اسی ارفع و صالح تصور کو رکھا جو اب سے بہت پہلے ان کا مسلک قرار پا چکا تھا۔

۵۱، ۵۲ غبار خاطر، مکتبہ جدید لاہور۔ میری لائبریری ایڈیشن۔ صفحہ ۶۵۔

مولانا کا یہی دینی احساس تھا جس نے انھیں ایک مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ سچا محب وطن اور جاں نثار قوم بنایا اور ہمیشہ اُن کے ذہن کو ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے پاک رکھا۔ انھوں نے مذہب کی حقیقی روح کو پہچان لیا تھا اور چاہتے تھے کہ جملہ عزیزانِ وطن بالخصوص نونہالانِ وطن کے دلوں کو بھی اس حقیقت سے آشنا کرائیں تاکہ ان کی ذہنی فضا کسی طور مسموم نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ سچے دین کی پیروی میں پیدا ہونے والے "یقین و اعتقاد" کو وہ تعلیم کا ایک اساسی عنصر سمجھتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ تاریخی غیر جانبداری کے بھی پرجوش حامی تھے۔ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے جلسے میں تاریخ کا مقصد ماضی کے حقائق کا انکشاف ہی بتایا تھا۔ اور تین سال بعد اسی کمیشن کی نشست کے موقع پر پھر اپنے نظریئے کی وضاحت میں کہا تھا۔ کہ "انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخ قابل اعتبار نہیں کہی جا سکتی کیونکہ تاریخ داں خواہ غیر ملکی حکمراں طبقے کے حامی ہوں یا محبانِ وطن، دونوں جانبدار رہے ہیں۔ لہٰذا آزاد ہندوستان کے مورخ کا فرض ہے کہ اپنے فرائض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونے کی سعی کرے۔" (ترجمہ) ان کی بے لوث دینداری نے انھیں اس حد تک زیور انسانیت سے آراستہ کر دیا تھا کہ انھوں نے وطنیت کے محدود تصور کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ مولانا وطن پرستی کو نہ مذہب کا حریف مانتے تھے اور نہ انسان دوستی کا رقیب۔ انڈین ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے ۱۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو قومی تعلیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے بھی انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ علم کی دنیا میں تنگ و محدود حب الوطنی کا سوال نہیں اُٹھتا اور نہ یہ بات کسی طور واجب ہے کہ وطن کی تاریخ و تہذیب کو ترچھی نگاہ سے دیکھا جائے اور قومی روایات و اقدار کا جائز احترام نہ پیدا کرایا جائے۔

مولانا کی اس کشادگیٔ قلب و نظر کی بدولت ان کا تعلیمی تصور بھی عالم گیر انسانیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ایک ہم آہنگ سماج میں معقول و معتدل شخصیت کی تشکیل کو تعلیم کا منصب قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کرۂ ارض کے بسنے والوں کے جذبات بڑی حد تک یکسانیت

رکھتے ہیں اور فکر انسانی فی الحقیقت ایک ہی ہے۔ لہذا مقامی رنگ کی آمیزش اور طول کے امتیازات قبول کرنے کے باوجود فرزندِ آدم کی خلقت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہر انسان انسان ہی رہتا ہے۔ انھوں نے اپنے ان تاثرات کو مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور فلسفہ تعلیم کے عنوان کے تحت یونسکو کی طرف سے ۱۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو منعقد ہونے والے سیمنار میں افتتاحی تقریر کے دوران میں صراحت سے بیان کیا ہے انھوں نے مضامین البلاغ میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ" اخلاق[1] بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون ارواح میں چھپی ہوئی ہے" یہاں پر وہ کسی خاص خطۂ زمین یا رنگ و نسل کے انسان کی تخصیص نہیں کرتے، انھیں انسانی فطرت کی بوقلمونی میں اس کے خمیر کی یک رنگی کا یقین کامل ہے اور وہ انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتے مولانا اپنے اس فلسفۂ حیات کے پیش نظر بین الاقوامی مفاہمت کے لازمی طور پر علمبردار ہیں۔ وہ فنون لطیفہ کی تعلیمی اہمیت کے اس لئے اور زیادہ معترف تھے کہ ان کے نزدیک وہ مختلف ممالک کے مابین امن و آشتی کے پیغام بر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۵ مارچ ۱۹۵۲ء کو فنون لطیفہ کی ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی، کی بحث قطعی فضول ہے۔ دراصل دونوں مقولوں کے بطن میں ایک ہی حقیقت مخفی ہے حقیقی فن افراد کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا محتاج نہیں ہوا کرتا لیکن ایسی صورت میں وہ سب کے جذبات کی نمائندگی بھی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ معیاری فن ہمیشہ حقیقی تعلیم کا موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ جذبات کو سنوارتا ہے اور ادراک و تخیل کی تربیت کرتا ہے۔ سیاسی طور پر دنیا علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں تقسیم ہو سکتی ہے لیکن فلسفہ، ادب اور فن کے معاملے میں انسانی برادری کی سالمیت برقرار ہی رہتی ہے۔ اس میدان میں ایک ذہن کی تخلیق ساری نوعِ انسانی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی ان ہی صفات کی بنا پر مولانا کے نزدیک ایک سچے قومی نظامِ تعلیم میں فنون لطیفہ کا ایک خاص مقام ہے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر اپنے تعلیمی خطبات میں یہ بات دہرائی ہے، وہ کسی بھی ملک کی قومی تعلیم کو فنون لطیفہ کے بغیر مکمل ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۹ء کو فنونِ لطیفہ کی کل ہند کانفرنس میں خطبۂ افتتاحیہ پڑھتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ ایک سماج کی صحت مندی اور اعتدال پسندی کا اظہار اس کے افراد میں ذوقِ لطیف کی ترویج سے ہوا کرتا ہے۔

---

[1] مضامین البلاغ۔ شائع کردہ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس دہلی صفحہ ۱۱۶۔

شخصیت کی تعمیر میں مولانا مصوری، موسیقی، رقاصی، سنگ تراشی، ڈراما سب ہی فنون کو اہم خیال کرتے تھے۔ انھوں نے تعلیم کے منصب کی وضاحت کرتے ہوئے اکثر فرمایا ہے کہ شخصیت کے سب ہی پہلوؤں کی تربیت ضروری ہے تعلیم محض ذہنی قوا کی بیداری کا نام نہیں ہے بلکہ جذباتی آسودگی، جسمانی ترقی، تہذیب و شائستگی کا حصول، غرض، انسانی زندگی کے سب ہی رُخ اس میں شامل ہیں۔ مولانا کی اپنی زندگی میں فنونِ لطیفہ محض نظری حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ان کے شیدائی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی میں دو تین سال متواتر علمِ موسیقی کا مطالعہ کیا تھا اور باقاعدہ ریاض بھی کرتے رہے تھے۔ اگرچہ آئندہ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں نے انھیں اس ذوق کو جاری رکھنے کی مہلت نہ دی لیکن موسیقی سے انھیں دلچسپی ہمیشہ رہی۔ ان کی طبیعت کا یہ رجحان اُن کی نفاست پسندی، شاعرانہ فکر، اور صاف ستھرے مذاق سے بھی بہر طور ظاہر ہوتا ہے اس لئے یہ امر قطعی باعث تعجب نہیں ہے کہ مولانا نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے سب سے پہلے جو چند آئین ہوا نے میں پیش قدمی کی اُن میں سے ایک بیرونی ممالک میں نوادرات کی بے دریغ برآمد پر قیود عائد کرنے سے متعلق بھی تھا۔ ان کے اس احترامِ فن وادب کی ایک اور شہادت ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی کی صورت میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ ادارے دراصل مولانا کی فکر رسا کے برگ و بار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری قومی تعلیم میں مولانا کی بالغ نظری کے علامتی مینار کہے جا سکتے ہیں۔ مولانا نے ان اداروں کے قیام میں گہری دلچسپی ظاہر کی تھی اور انھوں نے بجا طور پر ان اداروں کے مقاصد میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی تھی کہ وہ عوام کے مذاق کو سنوارنے اور فنون و ادب کی توسیع و اشاعت کرنے کا ذریعہ بنیں۔

مولانا، تعلیم کو زندگی کی تیاری سے تعبیر کرتے تھے انھوں نے ۳ نومبر ۱۹۵۱ء کو ایک تقریر کے دوران میں زراعت کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم کا منصب سماجی ضرورتوں کے پیش نظر افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہی ٹھہرایا تھا۔ انھوں[۵] نے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ طلبہ کی قابلیت کی سطح کو بلند کیا جائے۔ مولانا نے تعلیم میں آزادی کے تصور کو سراہا۔ وہ ثانوی تعلیم میں

---

[۵] تقریر ۱۸ اپریل ۱۹۵۳ء

کچھ اس طور پر تبدیلی چاہتے تھے کہ وہ خود تکمیلِ علم[1] کی ایک منزل قرار پا جائے تاکہ بیشتر طلبہ اس منزل کو طے کرنے کے بعد زندگی میں داخل ہو سکیں۔ اسی غرض سے کثیر المقاصد ثانوی مدارس کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ آج ان کی یہ بات بڑے پُر زور طریقے سے دہرائی جا رہی ہے اور حکومت کی کوشش ہے[2] کہ کسی طور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نااہلوں کے داخلے کی روک تھام کی جائے۔ مولانا کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے جو اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے اور مکمل زندگی گذارنے کا اہل بنائے۔ ایسی تعلیم کو انھوں نے ہر شہری کا پیدائشی حق بتایا ہے۔

مولانا کے نظریۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم سے آزاد ہندوستان کا تعلیمی نظام پوری طرح متاثر ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے تدبر سے اسے ایک ایسا پس منظر عطا کر دیا جس میں سچی دین داری، عقائد کی پختگی، انسان دوستی، عدل و ضبط جیسی اقدارِ عالیہ کی پاسداری موجود ہے اور جو تعلیم کا صحت مندانہ نظریہ برتنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ ان کے ذہنِ رسا کا یہ بھی کمال ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کی تہذیبی روایات کو دوبارہ زندگی حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ روایات[3] کا استحکام ان کو حیات نو بخشنے ہی سے ممکن ہے۔ ان کے اپنے قول کی تائید خود ان کے عمل میں نظر آتی ہے۔ اس وقت تعلیمی ترقی کی جو راہیں نکل رہی ہیں ان سب سے تقریباً سب ہی کی داغ بیل مولانا کے عہد میں پڑ چکی تھی۔ وہ جنگ آزادی کے مردِ مجاہد تو تھے ہی لیکن انھوں نے آزاد وطن کے تعلیمی نظام کی تشکیل کے معمارِ اول کہلانے کا حق بھی ادا کر دیا۔

---

[1]، [2] نشری تقریر، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء [3] تقریر ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء

مولانا آزاد کے چند خطوط

مرتبہ: جناب ابوسلمان الہندی

بنام مولانا ظفر علی خاں مرحوم

(پیدائش ۱۸۷۳ء وفات ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خاں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سراج الدین احمد اور دادا کا نام کرم الٰہی خاں ابن محمد حسن خاں تھا۔ آپ کا خاندان کئی صدیوں سے دارا پور میں آباد تھا، پردادا نے سیال کوٹ کے سرکھا گاؤں میں سکونت اختیار کی، بعد میں وزیر آباد چلے آئے اور شہر سے کچھ فاصلے پر کریم آباد کی بنیاد رکھی۔ مولانا کے والد سراج الدین احمد محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اخبار "زمیندار" جاری کیا۔

مولانا ظفر علی خاں نے وزیر آباد مشن ہائی اسکول سے مڈل اور مہندر سنگھ کالج پٹیالہ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور بی اے کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔

حیدر آباد (دکن) میں ملازمت اختیار کی اور اسسٹنٹ ہوم سکریٹری اور لیجسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار کے بلند عہدوں پر مامور رہے۔ حیدر آباد میں ۱۲، ۱۳ سال قیام رہا۔ اس دوران میں کئی کتابوں کے ترجمے کیے مثلاً خیابان فارس، فسانۂ لندن، سیر ظلمات اور معرکۂ مذہب و سائنس اول الذکر ترجمہ پر پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے پانچ سو روپے اور مصنف (لارڈ کرزن) کی جانب سے طلائی دستہ کی ایک چھڑی انعام میں ملی۔

میر عثمان علی خاں کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں حیدر آباد چھوڑنا پڑا بمبئی پہنچے اور وہاں سے دکن ریویو جاری کیا۔

۹ نومبر ۱۹۰۹ء کو والد مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق "زمیندار" کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دوستوں کے مشورہ سے کرم آباد کی بجائے لاہور سے جاری کیا۔

مولانا ظفر علی خاں اس دور کے عظیم صحافی، بلند پایہ شاعر اور بہت بڑے عوامی خطیب تھے ان کی اصل سیاسی زندگی ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتی ہے، ملکی اور قومی زندگی کے بہت سے نشیب وفراز سے گذرے۔ انھوں نے ہر بڑے سیاسی لیڈر سے رشتۂ اتحاد باندھا، ہر جماعت کی تعمیر میں حصہ لیا، ہر تحریک کا ساتھ دیا اور اس دور کے کتنے ہی ہنگاموں کی رہنمائی فرمائی۔ شاعرانہ مزاج اور جذباتی طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے اشتراکِ فکروعمل کی بنیاد ہمیشہ وقتی حالات اور جذبات صادقہ رہے۔ ان کی حیثیت ایسے رہنما کی نہ تھی جو عوام کو اپنے پیچھے لے کر چلتا ہے بلکہ ان کی حیثیت ایسے لیڈر کی تھی جو عوام کے خیالات وجذبات کے مطابق ان کی رہنمائی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جوں جوں حالات میں تبدیلی ہوتی گئی، ان کے اشتراک فکروعمل کے انداز بدلتے گئے۔ تحریک خلافت، کانگریس، احرار، اتحاد ملت، اور مسلم لیگ وغیرہ کے ساتھ ان کا ایسا ہی تعلق رہا حضرت مولانا آزاد نے ان کی طبیعت کی اس بوقلمونی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"کوئی تحریک مہینوں کے بجائے ہفتوں میں اٹھانا چاہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام عمارت کھڑی کر دیں گے، لیکن عمارت تیار ہو جائے تو انھیں فوراً نکال لو، کیونکہ وہ بنانے کے بعد ڈھانے لگتے ہیں۔"

جب دن کا آفتاب نصف النہار پر تھا تو ایک ہنگامہ تھا، لیکن آخری دنوں میں ایک گم شدہ ورق تھے۔ کبھی ان کے جلو میں لاکھوں آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوتا تھا، لیکن آخری سفر پیش آیا تو ایک درجن آدمی بھی کاندھا دینے والے موجود نہ تھے۔ بقول شورش کاشمیری صاحب، ایک بیٹا دو پوتے، تین بھلائی اور چار ملازم تھے جن کے ہاتھوں آخری رسومات انجام پائیں۔

مولانا نے ۸۴ برس کی عمر پائی، جس میں سے تقریباً ۱۴ برس قید کی نذر ہوگئے۔ گویا عمر کا چھٹا حصہ جیل میں بسر ہوا۔

مولانا ظفر علی خاں کی زندگی میں مولانا آزاد سے اتحاد و اتفاق کے مختلف زاویے بنتے چلے گئے لیکن اس کے باوجود سیاسی زندگی کے بہت سے مسائل میں مثلاً تحریک خلافت، خلافت اور ترکی شاہ سعود اور مسئلہ حجاز، احرار کا قیام و انہدام وغیرہ بے شمار مسائل میں اصولی اور فکری اعتبار سے وہ حضرت مولانا آزاد سے سب سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے لیگ میں شمولیت اختیار کی اور کانگریس کی سخت مخالفت بھی کی لیکن حضرت مولانا ان کے ممدوح و محترم ہی رہے حضرت مولانا کے متعلق ان کے بلند ترین خیالات کا اندازہ ان کے ان اشعار سے بخوبی ہوسکتا ہے، جن میں انھوں نے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ دیکھئے! کس خوبی کے ساتھ حضرت مولانا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

جہاں اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو، تو پوچھ ابوالکلام سے

(۱)

(اگست سنہ ۲۵ء تک طائف، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے قبضہ میں آچکا تھا اور شریف حسین کا پوری طرح استیصال کیا جاچکا تھا۔ انگریزوں نے جو شریف کے سلیف و پشت پناہ تھے، سلطان کے خلاف نجدی اور وہابی ہونے کا اتنا شدید پروپیگنڈہ کیا تھا کہ تمام عالم اسلامی میں شدید بے چینی اور سلطان کے خلاف سخت بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان نے جب شریف کی فوجوں کو مار بھگایا اور حجاز میں اپنے قدم جمالئے تو حجاز کے مستقبل بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے ایک "موتمر اسلامی" کے انعقاد کی ضرورت و اہمیت کا خیال ظاہر کیا۔ ان حالات میں ۲۱، ۲۲ ستمبر سنہ ۲۵ء کو مرکزی جمعیۃ خلافۃ کی مجلس عاملہ کا جلسہ

میں ایک جلسہ ہوا اور طے پایا کہ حالات کا صحیح جائزہ لینے اور موتمر کے انعقاد میں سلطان کو مدد دینے کے لئے ایک وفد حجاز بھیجا جائے۔ اس وفد کے رئیس حضرت مولانا سید سلیمان ندوی منتخب ہوئے تھے اور اراکین، مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، سید خورشید حسین، مولانا عبدالماجد بدایونی اور شعیب قریشی تھے۔ لیکن بعض ذاتی موانع کی بنا پر حضرت سید صاحب مرحوم، مولانا بدایونی اور سید خورشید حسین حجاز نہ جا سکے، باقی تین ارکان ۲۶ را کتوبر ۱۹۲۵ء کو جہانگیر ثانی جہاز کے ذریعے بمبئی سے حجاز روانہ ہوئے۔

حجاز پہنچنے کے بعد، وفد کے ارکان میں، اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں تھے اور دوسری جانب مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی تھے دونوں فریق اپنی رائے اور عمل کی جمعیۃ خلافت کے فیصلہ اور حضرت مولانا کی مرتبہ یادداشت کے مطابق قرار دیتے تھے۔ فریق ثانی نے جمعیۃ خلافت کو مولانا ظفر علی خاں کے اختلاف سے مطلع کیا۔ جواب میں حضرت مولانا کا تار موصول ہوا۔ تار انگریزی میں تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔)

دہلی۔ ۲ر جون ۱۹۲۶ء

ظفر علی خاں!

میں امید کرتا ہوں کہ آپ تجاویز امور موتمر کے بارے میں کامل طور پر کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی ذاتی رائے بدل گئی ہے، تو شعیب اور عرفان کو وہاں چھوڑ کر تبادلہ خیالات کے لئے یہاں لوٹ آئیے۔ تار سے جواب دیجئے۔

ابوالکلام

صدر جمعیۃ خلافۃ (ہند)

(۲)

(مولانا ظفر علی خاں کو جب اس شکایت کا علم ہوا کہ ان کے بارے میں جمعیۃ خلافۃ

کو کئی تار دیئے گئے ہیں، تو انھیں خیال ہوا کہ مبادا ان کے متعلق لاعلمی کی بنا پر کوئی غلط رائے قائم کرلی جائے۔ اس لئے انھوں نے اپنے رویہ کے بارے میں جمعیۃ خلافت کو مطلع کیا کہ وہ اس کے فیصلہ کی حرفاً حرفاً تعمیل کر رہے ہیں، نیز ہدایات طلب کیں۔ جواب میں حضرت مولانا کا درج ذیل تار وصول ہوا لیکن مذکورہ یادداشت وفد کو نہیں مل سکی، حتیٰ کہ ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء کو وفد واپسی کے لئے روانہ ہوگیا۔

(ترجمہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم کا ہے۔)

دہلی، ۹ جنوری ۱۹۲۶ء

ظفر علی خاں!

ہمارے مقاصد وہی ہیں، جن کا سلطان اعلان کر چکے ہیں۔ آئندہ حج کے موقع پر انعقاد موتمر کے متعلق زور دو۔ مستقل کا فیصلہ صرف موتمر ہی کرسکتی ہے عربی یادداشت بھیج رہا ہوں موتمر کے متعلق گفت و شنید جاری کرو۔

ابوالکلام آزاد
صدر خلافت

بنام مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

(حضرت سید صاحب کے نام حضرت مولانا کے کچھ خطوط معارف اعظم گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط کو "مکاتیب ابوالکلام" مرتبہ ادبستان لاہور اور تبرکات آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر میں شامل کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ غیرمطبوعہ خطوط کا ایک کافی بڑا ذخیرہ، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ اس میں سے ایک خط تبرکاً نقل کیا جاتا ہے۔ مکاتیب کے ساتھ حضرت سید صاحب کا تذکرہ بھی ہے۔)

صدیقی العزیز! خط پہنچا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی!

آپ نے میرے دل کا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اعظم گڑھ میں بھی جلسہ اور وعظ کی مصیبت آلگے گی۔ یہ معاملہ میرے لئے ایک قطعاً ناقابل علاج ہو گیا ہے۔ میری کوئی سعی، کوئی فصاحت و بلاغت، کوئی بحث اس بارے میں سود مند نہیں ہوتی ہیں اگر لوگوں سے کہوں کہ تقریر کرنا میرے لئے مہلک ہے اور آدھ گھنٹے کے بعد مر جاؤں گا، جب بھی لوگ بخوشی آمادہ ہو جائیں گے کہ کم از کم آدھ گھنٹہ تک بکواس کرالیں، پھر ہجوم مصافحہ کی جگہ تجہیز و تکفین کا اہتمام کیوں نہ کرنا پڑے، کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اصل مقصد جس طرح میری زندہ لاش سے حاصل ہو سکتا ہے، مردہ لاش سے بھی حاصل کر لیا جا سکتا ہے۔ شاید بعض اعتبار سے دوسری حالت زیادہ نافع اور نتیجہ خیز سمجھی جاتی ہو۔

آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرے ان احساسات کو سمجھنے سے انکار نہیں کیا۔ یقین کیجئے آپ کا خط پڑھ کر بے حد شکر گذار ہوا ہوں۔

میں خود چاہتا ہوں دار المصنفین میں ٹھہروں اور بجز وہاں کے حلقہ کے اور کوئی دعوت التفات نہ دے۔ جب آپ نے اس طرف سے مطمئن کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں مستعجل ہوں تین دن تو نہیں، دو دن ضرور وہاں صرف کر دوں گا۔

مولوی رشید الدین صاحب[1] کہتے ہیں کہ جمعہ سرائے میر میں بسر ہو۔ پس یہ پروگرام مجھے کہ پہلے سرائے میر اور پھر دار المصنفین میں ایک دن پہنچا اور دوسرے دن روانہ ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ دونوں جگہ کا درمیانی فاصلہ بہت ہی کم ہے۔

مولوی مسعود علی[2] صاحب کی مسرت میں میری مسرت کا انعکاس ہے۔ معلوم نہیں مولوی عبد السلام صاحب[3] بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں؟ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ابوالکلام، ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۳۱ء

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی کے چھوٹے بھائی۔ [2] دار المصنفین کے ناظم اعلیٰ۔

[3] رفیق دار المصنفین۔ الہلال میں مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر چکے ہیں۔

بنام مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(مارچ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ جلسہ بریلی میں ہو رہا تھا۔ اس موقع پر جماعت "رضائے مصطفیٰ" کی جانب سے ایک کتابچہ شائع کیا گیا جس میں جمعیۃ العلماء اور جمعیۃ خلافۃ کے اس وقت کے مسلک پر شدید اعتراضات کئے گئے تھے۔

حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ نے رفع اختلافات کی غرض سے مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ کی خدمت میں یہ خط لکھا، جو پیش کیا جا رہا ہے۔ استقبالیہ کمیٹی نے حضرت مولانا کا یہ خط جو ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا، درج ذیل نوٹ کے ساتھ ایک اشتہار کی صورت میں شائع کر دیا:

"بجواب تحریر جماعت "رضائے مصطفیٰ" "موصولہ" امروزہ۔ مندرجہ بالا خط آج ۱۳ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۹۲۱ء کی شام کو جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب کی خدمت میں بھیج دیا گیا ہے، اب عام اطلاع کے لئے اس کی نقل شائع کی جاتی ہے۔"

حضرت مولانا کے اس چیلنج کو قبول کر لیا گیا اور سید سلیمان اشرف، مولوی حامد رضا خاں صاحب ابن مولانا احمد رضا خاں صاحب اور دیگر بریلوی مولوی شریک جلسہ ہوئے۔ مولانا سید سلیمان اشرفؒ نے بڑی زوردار تقریر کی اور سخت اعتراضات کئے، خیال ہوتا تھا کہ ان اعتراضات کا کوئی جواب نہ دیا جا سکے گا لیکن حضرت مولانا کھڑے ہوئے تو دلائل و براہین سے اعتراضات کا ایسا رد کیا کہ دل میں ادنیٰ خلش بھی باقی نہ رہی۔ حضرت مولانا کی ایک معرکۃ الآرا تقریر تھی جس نے سامعین کو مبہوت کر دیا۔ سید سلیمان اشرف نے اس جلسہ میں اپنے اطمینان کا اظہار اور جمعیۃ العلماء ہند کے مسلک کی صحت کا اعتراف کیا اور

ہر طرح امداد وتعاون کا یقین دلایا)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بریلی، ۱۳ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ

بخدمت جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مسئلہ تحفظ وصیانت خلافت اسلامیہ، ترک موالات واعانت اعدائے محاربین اسلام وغیرہ مسائل حاضرہ کی نسبت جناب کے اختلافات مشہور ہیں، چونکہ جمعیۃ العلماء کا جلسہ یہاں منعقد ہو رہا ہے اور یہی مسائل اس میں زیر نظر وبیان ہیں، اس لئے میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ رفع اختلافات اور مذاکرہ ونظر کا یہ مناسب بہتر موقع پیدا ہو گیا ہے جناب جلسہ میں تشریف لائیں اور ان مسائل کی نسبت بطریق اصحاب علم وفن گفتگو فرمائیں۔ میں ہر طرح عرض وگذارش کے لئے آمادہ ومستعد ہوں۔

فقیر ابو الکلام احمد کان اللہ لہٗ

امام الہند ایک جائزہ

جناب ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا ابوالکلام آزادؒ پر موافق و مخالف نقطۂ نظر سے جتنا لکھا گیا ہے ان کے معاصرین میں سے بہت کم پر لکھا گیا ہوگا خصوصاً ان کی وفات کے بعد سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، مولانا اتنی حیثیتوں کے جامع تھے کہ ان کی ہر حیثیت پر لکھنے کی بڑی گنجائش ہے پھر ان کی سیاسی زندگی جن موجہائے بلاخیز کے درمیان گزری انھوں نے ایک طرف انھیں اہل بصیرت کی نظر میں مخدوم و مقتدیٰ بنا دیا اور دوسری طرف بہت سے مخالف و معاند پیدا کر دئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مولانا کی عظمت ادھوری رہ جاتی۔ آپ کسی بھی صحیح معنی میں عظیم شخصیت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے ہر جگہ آپ کو یہی نقشہ دکھائی دے گا عقیدت و مخالفت کی اس کش مکش میں ایک نقصان ضرور ہوتا ہے، شخصیت کا تجزیہ نامکمل رہ جاتا ہے اور تحقیق و تجسس کا حق ادا نہیں ہو پاتا ہے۔ مولانا آزادؒ پر جو کتابیں اور مضامین اس عرصے میں شائع ہوئے ہیں ان میں سے بھی اکثر میں اس کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ مولانا ابھی کل تک ہمارے درمیان موجود تھے اور انھوں نے ملک کی سیاسی زندگی میں جو رول ادا کیا تھا وہ تاریخ کا جزو بننے سے زیادہ ابھی تک خود ہمارے اپنے تجربات و واردات کا حصہ ہے۔ امید ہے کہ وقت گزرنے پر ذاتی پسند یا ناپسند کی جگہ واقعی غیر جانب دارانہ اور تحقیقی نقطۂ نظر پیدا ہوسکے گا۔ اور اگر پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک ضرور جذبات سے ہٹ کر لکھا جا سکے گا۔

مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کا اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی اور کارناموں پر ہندوستان

ہی میں کام نہیں ہو رہا ہے، پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ اگر وہاں ان کے بارے میں کچھ ایسی تحریریں شائع ہوئی ہیں جو تعصب اور عناد سے بھرپور ہیں تو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھنے والوں اور کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ پھر چند لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے عقیدت و احترام کے ساتھ علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان میں سرفہرست مولانا غلام رسول مہرؔ کا نام نامی ہے، جنھوں نے تاثراتی مضامین کے علاوہ نقش آزاد، تبرکاتِ آزاد اور باقیاتِ ترجمان القرآن کی صورت میں ٹھوس علمی کام کے نمونے پیش کئے ہیں۔

حال میں مولانا پر کراچی سے ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "امام الہند (تعبیر افکار)" ہے اور اس کے مصنف ابوسلمان الہندی ہیں۔ اس کتاب کی ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحات اور قیمت ۶ روپے ہے۔ یہ ایک وسیع کام کا ابتدائی حصہ ہے جس میں مولانا کی سنہ ۱۹۱۲ء کی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی بعض اعزہ، اساتذہ اور متعلقین کے حالات شامل کر دئے گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ زندگی کا یہ دور شخصیت کی تعمیر میں بہت اہم ہوتا ہے اور اس عمر میں خیالات و افکار کی جو شکست و ریخت ہوتی ہے وہ اکثر آئندہ زندگی کا سانچہ ڈھال دیتی ہے جو بقول مولانا آزادؔ توڑا جا سکتا ہے، موڑا نہیں جا سکتا ہے۔

مولانا آزادؔ کی زندگی کے اس دور سے متعلق بعض ایسے مباحث کا بیان ناگزیر ہے جن کے بارے میں کچھ کرم فرماؤں نے غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی ہے مثلاً مولانا کا نسب، آبائی وطن اور بیرونی سفر۔ قدرتی طور پر ابوسلمان صاحب نے بھی ان سب مسائل سے بحث کی ہے اور ان حقائق کو پوری دیانت اور محنت سے ایک دفعہ پھر اجاگر کر دیا ہے جنھیں مولانا کے مخالف توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ مولانا کے نسب اور آبائی وطن کے تعین میں انھوں نے سب سے زیادہ مدد مولانا غلام رسول مہرؔ کی بعض تحریروں سے لی ہے

اس بارے میں خود مولانا آزادؔ کے بیانات بھی بہت واضح اور دو ٹوک ہیں اور غلط فہمی صرف اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب نیت صاف نہ ہو۔ مولانا نے "انڈیا ونس فریڈم" کے شروع میں تحریر فرمایا ہے "میرے اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے۔ پہلے انھوں نے آگرہ میں قیام کیا اور پھر دہلی منتقل ہو گئے۔" اس بیان سے دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔ مولانا کا تعلق ہندوستان کے کسی نو مسلم خاندان سے ہرگز نہیں تھا اور ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ ان کے اس بیان کو جب ہم ان خیالات سے ملا کر دیکھتے ہیں جو انھوں نے خاندانی شرف امتیاز کے بارے میں "تذکرہ" میں ظاہر فرمائے ہیں تو غلط بیانی کا شائبہ بالکل ہی رفع ہوجاتا ہے۔ ایک شخص جو کہتا ہے: "ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں۔ ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اس سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔" یا "الحمد للہ اس کی طلب ہے اور نہ اس پر اعتماد اور نہ نا اہلوں کے اس فریب عزت اور سراب شرف کی ضرورت" وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ خاندانی عظمت کے مصنوعی بت تراش کر ان کے ذریعہ شرف و امتیاز حاصل کرے اور پھر مولانا کو اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ان کے اپنے کارنامے کیا کم تھے جو وہ خود ساختہ بزرگوں کے کارناموں کی دکان سجا کر بیٹھتے اور ان کا کاروبار کرتے۔ یوں بھی جو شخص مولانا کو تھوڑا بہت جانتا ہے کہ ان جیسا خودشناس و خوددار انسان عظمت و رفعت کی بھیک بزرگوں سے مانگے گا اور وہ بھی اپنے نہیں، کسی اور کے۔ ان سب داخلی شہادتوں کے ساتھ سب سے بڑی خارجی شہادت یہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ "مولانا کے دادا کا نام عمر دین عرف عمرا چھیکڑی تھا، وہ کھیم کرن (تحصیل قصور ضلع لاہور) میں گائے بھینس کی کھالیں رنگنے کا کام کرتے تھے" یا "مولانا کے والد خیر دین (جو بعد میں صوفی پیر خیرالدین کے لقب سے مشہور ہوئے) دس، گیارہ سال کی عمر میں کھیم کرن سے بھاگ کر بمبئی چلے گئے تھے" یا "قصبہ قصور کے قریب موضع کھیم کرن میں جناب آزاد کی کھتری برادری کا سراغ" ملتا ہے وہ اپنے ان "انکشافات" کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکے ہیں اور بغیر ثبوت

اور ذلیل کے جوابات لکھی جلئے اس کا اہلِ علم کے نزدیک کیا مقام ہوتا ہے یہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مولانا آزادؒ کے نسب اور آبائی وطن سے کھیم کرن یا قصور کا کیا تعلق تھا یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس بارے میں ابوسلمان صاحب نے مہر صاحب کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"مولانا آزادؒ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا منورالدین (جو مولانا آزادؒ کے والد کے نانا تھے) کے دادا ہرات میں تھے۔ والد احمد شاہ ابدالی کی جانب سے لاہور کے قاضی القضاۃ اور نائب السلطنت کے مشیر مقرر ہوئے۔ جب پنجاب پٹھانوں کے قبضے سے نکلنے لگا تو غالب یہ ہے کہ یہ بزرگ لاہور کی سکونت چھوڑ کر قصور یا کھیم کرن میں مقیم ہو گئے ہوں۔" مہر صاحب کے اس خیال کی تصدیق "آزاد کی کہانی" مؤلفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی اس عبارت سے ہو جاتی ہے جو ابوسلمان صاحب نے حاشیے میں نقل کی ہے: "وہ (مولانا منورالدین کے والد) برابر اس ذمہ دار عہدے کے فرائض لاہور میں ادا کرتے رہے مگر مستقل سکونت قصور میں اختیار کی۔" اب یہ بھی سن لیجیے کہ جو بزرگ کھیم کرن سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے وہ مولانا خیرالدین نہیں تھے بلکہ مولانا منورالدین تھے جنھیں شوقِ علم کھیم کرن سے "بھگا" کر دہلی لے گیا تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس میں داخل کر دیا تھا۔ ابوسلمان صاحب نے یہ واقعہ "نقشِ آزاد" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر اور "آزاد کی کہانی" مؤلفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی دونوں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی بعض حضرات، خصوصاً مولانا محمد یونس خالدی، مولانا آزادؒ کے نسب اور آبائی وطن کے بارے میں تحقیق سے کام لے کر ہر طرح کے شکوک کا ازالہ کر چکے ہیں اور اب ابوسلمان صاحب نے خود مولانا آزاد کی تحریروں اور مہر صاحب اور ملیح آبادی صاحب کے حوالوں سے ایک دفعہ پھر دودھ اور پانی علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے لیکن برا ہو تعصب اور ہٹ دھرمی کا جو حقیقت پر برابر پردے ڈالے رہتی ہے اور اپنے شکار کو کسی طرح اس کا رخِ تاباں نہیں دیکھنے دیتی ہے۔

ایک اور مسئلہ جسے لوگوں نے بلاوجہ الجھانے اور غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش

کی ہے مولانا آزاد مرحوم کا بیرونی سفر ہے۔ یہ مسئلہ "کاروانِ خیال" کی اشاعت کے بعد سے موضوع بحث بنا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے ایک خط میں مولانا نے اپنے "صدیقِ مکرم نواب صدیار جنگ بہادر مرحوم کو لکھا تھا: "وقت کے تضادات کا کرشمہ دیکھیے بعینہٖ یہی غزل آج سے ۳۲ برس پہلے ایک بزم اُنس میں سنی تھی اور کہاں سنی تھی، بغداد کی شب ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر...... میری عمر ۲۰، ۲۱ برس کی ہوگی۔" اس کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "آپ نے بغداد کا ذکر چھیڑا، مجھ کو وہ وقت یاد آگیا جب دو نوجوان ابو الکلام آزاد اور ابو النصر آہ نمایاں ہوئے تھے... اسی سلسلے میں یہ سنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ بغداد کی روداد آپ نے اب سنائی۔" ان خطوط کی اشاعت کے بعد یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ مولانا نے یہ سفر کیا بھی تھا یا نہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ میں فلاں زمانے میں فلاں ملک کے سفر پر گیا تھا اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ نہیں، آپ نہیں گئے تھے! اس صورت میں ظاہر ہے کہ ثبوت کا بار منکرین پر ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں تماشا یہ ہے کہ ثبوت دینے کی تکلیف کوئی گوارا نہیں کرتا ہے بلکہ ہر شخص کا عمل "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" پر معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں مولانا کے سفر کے حق میں دلیلیں ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے بڑی دلیل تو خود مولانا کا بیان ہے جسے غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، پھر نواب صدر یار جنگ مرحوم کی وہ تصدیق ہے جو اوپر نقل ہوئی۔ علاوہ ازیں "تذکرہ" کے مرتب مرزا فضل الدین احمد نے "تذکرہ" کے مقدمے میں لکھا ہے: "خاکسار شاید ان معدودے چند لوگوں میں سے ہے جو ایڈیٹر "الہلال" سے "الہلال" کی اشاعت کے بعد نہیں بلکہ پیشتر سے واقفیت رکھنے کا فخر رکھتے ہیں۔ میری ان سے پہلے پہل ملاقات ۱۹۰۲ء میں ہوئی...... زمانے کے حالات و حوادث نے مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں اور پھر ہندوستان سے باہر پہنچا دیا۔ وہ کلکتہ سے بمبئی اور پھر حجاز و بغداد چلے گئے۔" اور سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ یہ کہ مولانا کی وفات کے بعد ہمایوں کبیر صاحب نے جو یادگار جلد انگریزی میں شائع کی اس میں ایک مضمون

مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینون کا بھی ہے۔ اس مضمون میں لوئی ماسینون نے لکھا ہے اور اب افسوس اور وفاداری کے ساتھ میرے ذہن میں ..... ہماری پہلی اور آخری ملاقاتوں کی یاد آرہی ہے (ہماری) پہلی ملاقات بغداد میں ٹھیک ۵۰ برس پہلے ۱۹۰۷ء (یا) ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ ہم مسجد مرجان میں اپنے عزیز اُستاد الحاج علی آلوسی کے شاگردوں کی حیثیت سے ملے تھے جو اب وہاں مدفون ہیں" یہ ایک ایسے چشم دید شاہد کی شہادت ہے جسے غالباً مضمون لکھتے وقت اس بحث کا اندازہ بھی نہیں تھا جو مولانا کے بیرونی سفر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان میں جاری تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوئی ماسینون کی اس شہادت کے بعد مولانا کے بیرونی سفر سے نیک نیتی کے ساتھ اِنکار ممکن نہیں ہے، مخالفت کی بات دوسری ہے۔

اسی سلسلے میں ایک ضمنی بحث یہ اُٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ مولانا نے یہ سفر کس سن میں فرمایا تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا: "کاروانِ خیال" کا خط ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مولانا نے دو باتیں ایسی تحریر فرمائی ہیں جن سے زمانۂ سفر کا تعین ہوتا ہے: "یہی غزل آج سے ۳۲ برس پہلے..... سنی تھی" اور "میری عمر ۲۰، ۲۱ برس کی ہوگی" ۱۹۴۲ء میں سے ۳۲ برس گھٹانے سے ۱۹۱۰ء نکلتا ہے مولانا کی پیدائش ۱۸۸۸ء کی تھی، اس میں ۲۰، ۲۱ برس کا اضافہ کیا جائے تب بھی ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء ہی حاصل ہوتا ہے۔ تقریباً یہی بات لوئی ماسینون نے اپنے مضمون میں لکھی ہے: "انڈیا ونس فریڈم" مولانا آزاد کی آخری تصنیف ہے اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ قابلِ اِعتماد ہے۔ اس میں بھی مولانا نے اپنے بیرونی سفر کا سال ۱۹۰۸ء ہی بیان فرمایا ہے۔ اِن شواہد کی موجودگی میں میرے خیال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کا یہ سفر کب ہوا تھا اور بحث کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی" میں مولانا کا سفر ۱۹۰۵ء میں بیان کیا ہے اور یہیں سے زمانۂ سفر کے بارے میں شکوک کی بنیاد پڑی ہے: "آزاد کی کہانی" کے مرتب مولانا ملیح آبادی نے ۱۹۴۲ء میں جیل میں مولانا آزاد سے ان کے حالات سن کر تیار کیے تھے اور کتاب شائع ہوئی اپریل

میں ہوئی۔ اس صورت میں مولانا ملیح آبادی کو تسامح ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے اور ۱۹۰۶ء یوں بھی ۱۹۰۵ء میں بہ آسانی بدل جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کے سوانح پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ۱۹۰۵ء میں وہ ہندوستان ہی میں تھے۔ ۱۹۰۵ء کے تقریباً وسط تک لسان الصدق" شائع ہو رہا تھا۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور اکتوبر ۱۹۰۵ء میں" الندوہ" کی ادارت کے سلسلے میں ندوہ پہنچ گئے تھے۔ ابو سلمان صاحب نے مولانا ملیح آبادی کی روایت اور کاروانِ خیال، انڈیا ونس فریڈم اور لوئی ماسینون کے بیانوں میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ صورت نکالی ہے کہ دونوں کو صحیح تسلیم کر لیا ہے اور مولانا کے بجائے ایک کے تین سفر بیان کئے ہیں۔ پھر بھی ایک معما باقی رہ جاتا ہے، مطابقت تو دو سفروں سے بھی پیدا ہو جاتی تھی، تین کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی ضرورت انھیں یوں پیش آئی کہ مولانا ملیح آبادی نے" آزاد کی کہانی" میں ص ۱۴۴ پر مولانا آزادؒ کے مکہ معظمہ حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے اور پھر ص ۱۴۵ پر بڑے بھائی کے ہمراہ عراق جانے کا۔ ابو سلمان صاحب نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سفر تصور کر لیا ہے۔ بہر حال میری ناچیز رائے یہ ہے کہ مولانا آزاد نے اس زمانے میں بیرونی سفر ایک ہی فرمایا تھا اور وہ ۱۹۰۸ء میں تھا۔ مولانا کے بعض اور معتبر سوانح نگاروں مثلاً مولانا غلام رسول مہر اور مولانا محمد یونس خالدی کی بھی یہی رائے ہے اور نہ خود مولانا آزاد کی کسی تحریر یا بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء میں دو یا تین مرتبہ باہر تشریف لے گئے تھے۔

کتاب کا اصلی موضوع یعنی" تعمیر افکار" داستانِ شک و انکار کے زیر عنوان ۲۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مولانا آزاد رح نے اپنی زندگی کے اس دور کا ذکر مختلف موقعوں پر فرمایا ہے، کہیں تشبیہات و استعارات کے پردوں میں اور کہیں صاف صاف لفظوں میں۔ جبقری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے بہ آسانی مطمئن نہیں ہوتا ہے اور اسے ہمیشہ خوب سے

خوب تر کی جستجو رہتی ہے۔ مولانا کے عبقری ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ انھیں مذہب کا جو تصور ورثے میں ملا تھا وہ ان کے متجسس ذہن اور بے چین روح کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لئے وہ مذہب کی ضرورت اور افادیت ہی سے منکر ہو گئے۔ لیکن یہ انکار بھی روح کی پیاس نہ بجھا سکا اور لیلائے مقصد کی تلاش میں دل و دماغ برابر سرگرداں رہے چونکہ مبدئے فیاض سے طبع رسا اور فہم سلیم ودیعت ہوئی تھی اس لئے بالآخر متاع گم گشتہ کا سراغ مل کر رہا۔ ان آزمائشوں سے گزرنے میں دل و دماغ کو جو جھٹکے لگے انھوں نے بلاشبہ تعمیر افکار میں بہت اہم رول ادا کیا، طبیعت میں مشکل پسندی آ گئی اور نظر کسی اعلیٰ مقصد کی متلاشی رہنے لگی۔ مولانا سے کم تر درجے کا انسان اول تو مذہب کے موروثی تصور ہی سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہتا اور بہ آسانی والد کی گدی سنبھال کر پیری مریدی کے دھندے میں لگ جاتا اور اگر اس کی طبیعت ایسی ہی باغی اور بے چین ہوتی تو کفر و الحاد کا راستہ ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیتا مولانا کی عظمت یہ ہے کہ ان کے قدم اٹھے بھی اور منزل مقصود سے پہلے کہیں رکے بھی نہیں اور یہ سب وادیاں ۲۲ یا ۲۴ برس کی مختصر عمر میں قطع کر ڈالیں! بقول خود مولانا آزادؒ:

"۲۴ برس کی عمر میں جبکہ لوگ عشرتِ شباب کی سرگرمیوں کا سفر شروع کرتے ہیں میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔" ان کا زندگی بھر یہی طریقہ رہا، ناحق کی حمایت پر کبھی اپنے کو راضی نہ کر سکے اور حق کا سراغ مل جانے پر اس کی حمایت و نصرت سے باز نہ رہ سکے۔ میرے خیال سے یہ موضوع اس سے زیادہ وضاحت کا خواستگار تھا جتنی وضاحت سے ابوسلمان صاحب نے اپنی تصنیف میں کام لیا ہے کیونکہ اگر وہ کوشش کرتے تو مولانا کی آئندہ زندگی کے بہت سے افکار و رجحانات کی جڑیں انھیں یہیں پیوست ملتیں۔

مولانا کے بعض قریبی اعزہ، اساتذہ اور دوسرے متعلقین کے حالات ایک جگہ مہیا کر کے ابوسلمان صاحب نے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اور الحاج ملی آویؒ سے مولانا کے تعلق کی نوعیت بھی واضح کر دی ہے یعنی ان دونوں بزرگوں سے مولانا کا علاقہ

خلوص و موقت یا زیادہ سے زیادہ عقیدت و نیاز کا تھا، باقاعدہ اُستادی شاگردی کا نہ تھا۔ کتاب کے آخر میں مولانا کے اس دور کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین اور تصانیف کی جامع فہرست دے دی ہے اور یہ بھی ایک مفید کام ہے۔

کسی عظیم اور بقول قاضی عبدالغفار مرحوم مشکل شخصیت کی سوانح نگاری کے دو مناسب طریقے ہوسکتے ہیں۔ یا تو سوانح نگار کو اپنے ہیرو سے قرب کی عزت حاصل رہی ہو اور وہ اس کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو بے نقاب کرسکتا ہو جو اس وقت تک لوگوں کی نظروں سے مخفی ہوں اور یا اس میں یہ صلاحیت ہو کہ صاحبِ سوانح کی تحریروں کے آئینے میں اس کی شخصیت کا جلوہ دیکھ اور دکھا سکے۔ مولانا آزاد کی سوانح عمری دونوں طریقوں کے مطابق لکھی جا چکی ہے۔ پہلا طریقہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے "ذکرِ آزاد" میں اختیار کیا ہے اگرچہ اس میں یہ کمی ضرور رہ گئی ہے کہ وہ مولانا آزاد کی مکمل سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کے صرف اس حصّے کا احاطہ کرتی ہے جس میں مولانا ملیح آبادی کو ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا اور دوسرے طریقے کے مطابق میرے خیال سے اب تک سب سے اچھی سوانح عمری قاضی عبدالغفار کی "آثارِ ابوالکلام" ہے۔ مہادیو ڈیسائی کی انگریزی تصنیف "مولانا ابوالکلام آزاد" میں ان دونوں طریقوں سے بیک وقت کام لیا گیا ہے اور اس لئے میری ناچیز رائے میں اس پر ابھی تک کوئی خاص اضافہ نہیں ہوسکا ہے اگرچہ مولانا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اس میں بعض واقعاتی غلطیاں یقیناً رہ گئی ہیں۔ "امام الہند (تعمیرِ افکار)" ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر لکھی گئی ہے۔ اسے اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس کے مطالعے سے مولانا کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوسکیں گی یا ان کی شخصیت کے نئے پہلو روشنی میں آسکیں گے بلکہ اس کی اہمیت اور افادیت یہ ہے کہ مولانا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جو معلومات مختلف جگہ بکھری ہوئی تھیں انھیں مصنف نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اپنی اس کوشش میں انھوں نے خود مولانا کی تحریروں کے علاوہ "آزاد کی کہانی" پر سب سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ان کے سامنے آئندہ کام کا جو نقشہ ہے امید ہے اس کی تکمیل میں وہ مولانا پر شائع شدہ دوسرے مواد سے بھی پورا استفادہ کریں گے۔

مولانا آزاد
اپنے معاصرین کے خطوط کی روشنی میں

مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

مکاتیب کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان کی بہت سی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ لکھنے والے کے خلوص دل کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ان سے لکھنے والے کی سیرت اور شخصیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنے دور کے سماجی شعور کے صحیح عکاس ہوتے ہیں۔ مگر میں نے اردو کے خطوط کا مطالعہ ایک اور نقطۂ نظر سے کیا ہے، وہ یہ کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان خطوط کے ذریعہ جو گفتگو ہوئی ہے، اس میں دوسروں خصوصاً اپنے معاصرین کا کس انداز سے ذکر آیا ہے۔ اس ذکر کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس گفتگو کی حیثیت کچھ اس قسم کی ہے جو بند کرے میں ہوتی ہے، اس لئے یہ گفتگو مکتوب نگار کے صحیح جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میں نے اپنے اس مطالعہ میں بہت سی مشہور شخصیتوں کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں، آج کی صحبت میں مولانا ابو الکلام آزاد کے متعلق پیش کرتا ہوں۔ یہ معلومات ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد اپنے دور کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے تھے اور ساتھ ہی ان کی شخصیت بہت ہی متنازعہ فیہ رہی ہے۔ اس لئے مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق تھا کہ مولانا آزاد کے ان معاصرین نے جن سے ان کے معرکے رہ چکے ہیں یا جن کو ان کے سیاسی موقف سے اختلاف تھا۔ اپنے نجی خطوط میں، جن کو میں نے بند کمرے کی گفتگو سے تعبیر کیا ہے، کس پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میری سب سے پہلے نگاہ مولانا محمد علی پر پڑی۔ کیونکہ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کا میدانِ عمل مشترک تھا ـــــ دونوں پرجوش اور بیباک

جرنلسٹ اور تحریک آزادی کے نڈر سپاہی تھے ــــ اس کی وجہ سے جہاں دونوں کے درمیان گہرے روابط تھے، وہاں بہت سے مسائل میں شدید اختلاف بھی تھا۔ مولانا محمد علی کے رفیق کار اور مخلص ترین دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں "مشہور تھا کہ محمد علی اور مولانا آزاد میں صفائی نہیں، اُن بَن کے چرچے ایک ایک کی زبان پر تھے"[1] اس لئے مجھے امید تھی کہ مولانا محمد علی کے خطوط میں مولانا آزاد کا یقیناً ذکر آیا ہوگا، اس لئے بھی یقین تھا کہ بقول مولانا دریابادی مولانا محمد علی کے "آخر کے خطوط زیادہ تر اختلافی اور نزاعی مسئلوں سے لبریز ہیں"[2]۔ مگر مجھے اپنی کوشش میں سخت ناکامی ہوئی۔ مولانا محمد علی کے خطوط کا سب سے بڑا مجموعہ وہ ہے جسے محمد سرور صاحب نے مرتب کیا ہے اور جو جامعہ ملیہ سے شائع ہوا ہے، کتابی سائز کے کچھ زائد تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس میں مولانا آزاد کا کہیں ضمناً بھی ذکر نہیں آیا ہے، کچھ خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "ذاتی ڈائری کے چند ورق میں شائع ہوئے، مولانا دریابادی سے مرحوم کے جیسے تکلفانہ تعلقات تھے، اس سے دنیا واقف ہے، ان کے خطوط میں مولانا نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے، مگر ان میں بھی مولانا آزاد کا کسی طور بھی ذکر نہیں۔ البتہ پروفیسر محمد سرور صاحب کی مرتبہ کتاب "محمد علی۔ بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے" میں ایک خط ہے، جو ۲۸ء میں یورپ سے لکھا گیا ہے، اس میں ضمناً ذکر آیا ہے۔ مرکزی خلافت کے سکریٹری مولانا محمد عرفان مرحوم کے خط میں لکھتے ہیں: "البتہ ایک صاحب "ابو النصر" جن کا خط مولانا ابوالکلام سے ہو بہو ملتا ہے۔ ان بے چارے نے ایک کاپی ارسال کی ہے"[3]۔

مولانا محمد علی کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی گرامی شخصیت ہے، جنھوں نے مولانا آزاد کی معیت میں کام کیا ہے، ساتھ ہی جنھیں مولانا آزاد کے موقف سے شدید اختلاف بھی رہا ہے، ان

---

[1] محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اول صفحہ ۳۳۳۔

[2] ایضاً حصہ دوم صفحہ ۲۷۶۔ [3] صفحہ ۳۶۵۔

وجہ سے میرا گمان ہے کہ سید صاحب کے خطوط میں یقیناً مولانا کا ذکر آیا ہوگا، مگر اب تک سید صاحب کے صرف وہ خطوط شائع ہوئے ہیں، جو مولانا سید مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھے گئے تھے۔ ان میں صرف دو جگہ ذکر آیا ہے، ایک ذکر غیر اہم ہے، لکھتے ہیں۔

"میں آج مولوی ابوالکلام صاحب کی مجلس اصلاح عربی و فارسی کی کمیٹی کی شرکت کے لئے لکھنؤ جا رہا ہوں۔" (مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء۔ مکاتیب سلیمان صفحہ ۲۱)

لیکن دوسرا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے علامہ سید سلیمان ندوی کے صحیح خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے سلسلے میں ہے۔ فرماتے ہیں:

"ادعائی لوگوں سے میں چوکنا رہتا ہوں۔ ابوالکلام کے ساتھ بھی میرا یہی معاملہ رہا۔" (مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ مکاتیب سلیمان صفحہ ۱۶۵)

سنا ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی سید صاحب کے ان خطوط کو جو ان کو لکھے گئے تھے مرتب فرما رہے ہیں۔ سید صاحب اور مولانا دریا بادی میں جس قدر بے تکلفی اور خیالات میں ہم آہنگی ہے، اس کی بنا پر مجھے امید، بلکہ یقین ہے کہ ان میں ضرور مولانا آزاد کا ذکر آیا ہوگا، اگر مولانا دریا بادی نے "سنسر" سے کام نہ لیا تو توقع ہے کہ ان کی اشاعت سے بہت سی نئی باتیں منظر عام پر آئیں گی۔

اب وہ تذکرے ملاحظہ ہوں جو مولانا آزاد کے بارے میں ان کے معاصرین کے خطوط میں کسی نہ کسی سلسلے میں آئے ہیں۔ مولانا گوناں گوں خصوصیات کے حامل تھے، مذہب، صحافت، ادب اور سیاست ان کے مخصوص میدان تھے، اس لئے جن لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان میں عالم دین، صحافت نگار، ادیب اور سیاست داں سبھی قسم کے لوگ نظر آئیں گے، مگر ان کی خدمات جلیلہ کا بڑا حصہ سیاست سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر سیاست دانوں سے ان کے تعلقات زیادہ رہے ہیں، اس زمانے کے خطوط ابھی بہت کم منظر عام پر آئے ہیں، یہ سب جب شائع ہوں گے اس وقت مولانا آزاد کے بارے میں ان کے ساتھیوں اور ہم عصروں کی رائیں بڑی تعداد میں سامنے آئیں گی اور یہ فیصلہ کتنا آسان ہوگا کہ ان کے معاصر ان کی شخصیت سے کس قدر متاثر تھے، ان کے

خیالات و افکار سے کس قدر متفق تھے اور ان کی خدمات اور علمی قابلیت کے کہاں تک معترف تھے میں سب سے پہلے میدان سیاست کے رفیقوں کے خطوط کے اقتباسات نقل کرتا ہوں۔ مہاتما گاندھی اپنی عظیم الشان شخصیت کی بنا پر جہاں مولانا آزاد کے بزرگ تھے، وہاں ان کے رفیق کار بھی تھے۔ ان ہی کے تذکروں سے ابتدا کرتا ہوں۔

مہاتما گاندھی

مولانا صاحب ایک دن کے لئے واردھا میں ٹھہر گئے اور ہم نے ایک طویل گفتگو کی۔ انھوں نے مجھے اس سمجھوتے کا مسودہ دکھایا جو اسمبلی کے مسلم لیگی اور کانگریسی ممبروں کے درمیان ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک عمدہ دستاویز تھی۔ مگر انھوں نے مجھے بتایا کہ تم تو اسے پسند کرتے ہو، مگر ٹنڈن جی پسند نہیں کرتے۔ میں نے مولانا کی تجویز کے مطابق اس سلسلے میں موخرالذکر کو ایک خط لکھا ہے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟

(بنام پنڈت جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء چند پرانے خطوط صفحہ ۲۸۲-۲۸۳)

یہ لو مہادیو کی یادداشتوں کی نقل جو انھوں نے اپنی سیاحت صوبہ سرحد پر لکھی تھیں .....
میں یہ یادداشتیں تمام ممبروں کے پاس گشت نہیں کرا رہا ہوں، بلکہ ان کی نقلیں صرف مولانا اور سبھاش کو بھیج رہا ہوں۔

(ایضاً۔ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۳۸ء حصہ دوم صفحہ ۵)

میرے اُس تار کے جواب میں جس میں میں نے سبھاش کو مشورہ دیا تھا کہ جناح سے باضابطہ گفت و شنید کا آغاز کر دیں، انھوں نے مجھے تار دیا ہے کہ وہ دسویں کو بمبئی میں ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی وہاں پہلے ہی پہنچ جاتے۔ میں مولانا صاحب کو بھی اسی انداز کا ایک خط لکھ رہا ہوں اور اس خط کی نقل ان کو بھیج رہا ہوں۔

(ایضاً۔ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء حصہ دوم صفحہ ۶۱)

عزیزی جواہر لال

اگر تم تیار ہو تو اب تم ضابطے کے ساتھ سول نافرمانی کا اعلان کر سکتے ہو..... مولانا صاحب

نے ٹیلی فون پر مجھ سے فرمایا کہ دوسری ستیہ گرہ کے لئے کسی دوسرے شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے
میں نے جواب دیا کہ اگر تم (یعنی جواہر لال۔ اعظمی) آنے پر تیار ہو تو میں کسی دوسرے شخص کا انتخاب
نہیں کر سکتا۔ (ایضاً۔ مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۰ء۔ حصہ دوم صفحہ ۳۳۴)

مولانا صاحب مصر تھے کہ مجھے الہ آباد جانا چاہیئے۔ میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ آج کل میرے لئے سفر کرنا دشوار ہے۔ علاوہ بریں میں نے اسی زمانے میں تین میٹنگیں طلب کی ہیں اس لئے مولانا سے میں نے معافی مانگ لی اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اپنی رائیں ایک قرارداد کی شکل میں بھیج دوں گا۔ (ایضاً۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۴۲ء۔ حصہ دوم صفحہ ۳۸۳)

پنڈت موتی لال نہرو

... شیفیع مسلک کے چند کٹر قسم کے رجعت پسندوں کے سوا مسلمانانِ پنجاب کی اکثریت نے لکھنؤ کی قراردادوں سے اتفاق کا ابھی سے اعلان کر دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو شملہ والی میٹنگ میں شریک تھے، ہمیں یقین دلایا ہے کہ پنجاب سے بھی بہتر نتائج بنگال میں ہمارے سامنے آئیں گے اور مجھے ان کی کامیابی کا یقین ہے بہ شرطیکہ سرمایہ کافی رہا۔

(بنام ڈاکٹر بیسنٹ۔ مورخہ ۳ر ستمبر ۱۹۲۸ء۔ کچھ پرانے خط حصہ اول صفحہ ۱۰۶)

پنڈت جواہر لال نہرو

میں نے (مہادیو کی صوبہ سرحد سے متعلق) یادداشت کو پڑھ لیا ہے اور اب میں خان صاحب کو اور خان عبدالغفار خاں کو خط لکھوں گا...... آپ کے علاوہ اگر کوئی شخص اس کام کو موثر طریقے پر انجام دے سکتا ہے، تو وہ مولانا ابوالکلام ہیں۔ میرے خیال میں ان کا صوبہ سرحد جانا نہایت ضروری ہے۔ (بنام مہاتما گاندھی مورخہ ۲۸ر اپریل ۱۹۳۸ء۔ ایضاً حصہ دوم صفحہ ۵۸)

گاندھی جی مولانا آزاد کو دیکھنے کی غرض سے آج الہ آباد پہنچے۔

(بنام سروجنی نائیڈو۔ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۳۹ء۔ ایضاً صفحہ ۱۲)

بالعموم میں شاذ و نادر ہی ایا دہ ہے تھا کہ میں نے، گاندھی نے اور دوسرے لوگوں نے

مولانا آزاد پر دباؤ ڈالا کہ وہ صدارت کے لئے اپنا نام پیش کرنے کی اجازت دے دیں۔ مولانا اس پر آمادہ نہیں تھے۔ جس روز میں باردولی سے روانہ ہو رہا تھا (تمہارے جانے کے بعد دوسرے دن) میں گاندھی جی اور دوسرے لوگوں کو خدا حافظ کہنے گیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ گاندھی جی کی جھونپڑی کے برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ولبھ بھائی اور مولانا کے سوا اور کون لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا نے پھر کہا کہ ان کو اس ذمے داری کے قبول کر لینے میں پس و پیش ہے۔ اس پر ولبھ بھائی نے کہا کہ اگر مولانا انکار کردیں تو ڈاکٹر پٹابھی سے کہا جائے کہ وہ کھڑے ہوں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر پٹابھی کا نام میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ولبھ بھائی کی تردید کئے بغیر کہا کہ مولانا کو اس پر ضرور رضامند کیا جائے۔ اس کے بعد فوراً ہی میں باردولی سے روانہ ہوگیا۔ الہ آباد پہنچنے پر مجھے ایک تار اس مضمون کا ملا کہ مولانا رضامند ہو گئے۔

(بنام سبھاش چندر بوس۔ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۳۹ء۔ ایضاً صفحہ ۷۸-۱۷۹)

میں نہیں جانتا کہ تمہارے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن کی حیثیت سے جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ ان خطوط پر جن کی تم تصریح کرتے ہو، کسی سمجھوتے یا مفاہمت کی تجویز پیش کرنا کہاں تک درست ہوگا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس تجویز سے انتشار اور غلط فہمی پیدا ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم مولانا آزاد سے مشورہ کر لو؟ وہ کل یہاں آرہے ہیں اور تین چار دن ٹھہریں گے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہارا ٹائپ کیا ہوا مسودہ ان کو دے دوں۔ (بنام سید محمود۔ مورخہ ۲ فروری ۱۹۴۱ء۔ ایضاً صفحہ ۳۶۷)

سید وزیر حسن

میری یہ قطعی رائے ہے کہ تا حدِ امکان بڑے سے بڑے پیمانہ پر ایک عام جلسہ ایسے تمام مسلمان طبقوں اور عوام کا جو کانگریس کا نصب العین قبول کر چکے ہیں، نیز ان مسلمانوں کا جن کو میں کانگریسی خیال کا کہہ سکتا ہوں، کسی مرکزی جگہ جلد ہی مارچ کے اخیر تک یا اپریل کے

شروع میں منعقد کیا جائے اور ضروری تجویزیں منظور کر کے مسلم لیگی پروپیگنڈے کی تردید میں ایک عام بیان جاری کیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس جلسے کے داعی ہوں۔

(بنام جواہر لال نہرو - مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۳۸ء۔ ایضاً صفحہ ۴۸)

سبھاش چندر بوس

مجھے بتایا گیا ہے کہ جب تم دہلی میں تھے تب تم نے مہاتما گاندھی تک یہ پیغام پہنچایا کہ مولانا آزاد سے ملنے کے لئے انھیں الہ آباد جانا چاہیئے۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء۔ ایضاً صفحہ ۱۵۳)

خان عبدالغفار خاں

آتے وقت میں مولانا صاحب سے بھی ملا تھا اور میں نے ان سے ایک بات عرض کی تھی، جس کے متعلق انھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ٹیلی فون پر آپ سے باتیں کریں گے۔ ممکن ہے انھوں نے آپ سے باتیں کی ہوں۔ دراصل یہ بات میں نے سیگاؤں میں مہاتما جی سے سنی تھی وہ اس خیال سے کسی قدر پریشان تھے کہ جواہر لعل ان کی رائے سے قطعاً اتفاق نہیں رکھتے یہ قصہ دونوں کی گفتگو کے بعد کا ہے اور وہ اُس وقت پس و پیش میں تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ میں پنڈت جی سے اسٹیشن پر ملا تھا اور ان سے بات چیت بھی کی تھی جو بالکل اطمینان بخش تھی۔ کچھ لوگوں کو (کچھ شکوک؟) تھے۔ اس لئے پہنچنے پر میں نے مولانا صاحب سے اپنے خیالات عرض کئے اور انھوں نے مجھ سے اتفاق فرمایا۔ یہ طے پایا کہ ٹیلی فون سے آپ کو مطلع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مہاتما جی کو لکھ دیں گے تاکہ معاملات کی صورت ہی ہو جائے جو مہاتما جی چاہتے تھے۔ مولانا صاحب اور میں یہی چاہتے ہیں۔

(بنام جواہر لال نہرو - مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۰ء۔ ایضاً صفحہ ۳۲۹-۳۰)

رینا بنرجی

چونکہ الہ آباد سے رخصت ہونے سے پہلے مولانا سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہوں، مجھ کو یقین ہے

گروی ادھیکاری کی زندگی ان کے سکون میں خلل انداز ہونے یا زندگی سے متعلق ان کا جو عام انداز ہے، اس سے اُن کو برگشتہ و منحرف کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی کامیاب نہ ہوسکی۔

(بنام جواہر لال نہرو - مورخہ ۷ مئی ۱۹۴۱ء - ایضاً صفحہ ۲۳۹)

جی - ادھیکاری (کمیونسٹ پارٹی کے ایک سربرآوردہ ممبر)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے...... سردست قوم کے اندر برطانیہ دشمن جذبات کی حرارت بھر دی ہے۔ جب یہ حرارت ٹھنڈی پڑ جائے گی تب قوم اس سے شدید تر ہزیمت خوردگی اور جاپان دوستی کے جذبات کے آغوش میں جا پڑے گی۔ مولانا نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا تھا جو چھپ چھپ کر حملہ آور کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

(بنام پنڈت جواہر لال نہرو - مورخہ ۳ مئی ۱۹۴۲ء - ایضاً صفحہ ۸۷-۳۸۶)

آصف علی

یہاں (قلعہ احمد نگر) سے تمہارا جانا مجھے اور مولانا کو فراق کا ایک صدمہ عظیم پہنچا گیا شام تک تو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا، مگر دوسرے دن صبح کو یہ فراق بہت کھلا۔ میری روانگی تک مولانا نمایاں طور پر دل گرفتہ سے دکھائی دے رہے تھے...... برسبیل تذکرہ چلتے چلتے دو ہفتے کی شکر کا کوٹا مجھ پر لاد دیا گیا اور مجھے اس کو بھی اپنے آخری وصیت نامے میں اس کی فیاضانہ تقسیم کے لئے شامل کر لینا پڑا۔ اس وصیت نامے کو نافذ کرنے والے تنہا مولانا ہوں گے۔ (بنام جواہر لال نہرو - مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء - ایضاً صفحہ ۴۰۷)

ایم - این - ساہا (یونیورسٹی سائنس کالج - کلکتہ)

کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو اور مولانا آزاد کو کملا لیکچرر مقرر کیا ہے۔ باوجودیکہ مسلم لیگیوں نے اس سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ مولانا آزاد اپنا مافی الضمیر انگریزی میں ادا نہیں کر سکتے۔

(بنام جواہر لال نہرو - مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۴۵ء - ایضاً صفحہ ۱۳-۴۱۲)

ایس۔ اے کے شین (سفیر جمہوریہ چین متعینہ نئی دہلی)

حالیہ واقعات اور حالات کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب[1] نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں ان کی بہترین تمنائیں آپ کو اور مولانا آزاد کو پہنچا دوں۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء۔ ایضاً صفحہ ۱۴۲)

ڈاکٹر اقبال

الحمدللہ کہ مولانا آزاد کو آزادی[2] ملی۔ .... مولانا آزاد اب کہاں ہیں، پتہ لکھئے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔

(بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء اقبال نامہ صفحہ ۱۰۰)

مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں"۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر سنہ ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر و انگریزی وغیرہ موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہیں بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت سے ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اوروں کی دل آزادی کی جائے۔[3]

(ایضاً صفحہ ۱۱۱)

---

[1] ڈاکٹر تائی چیاؤ؛ صدر ممتحان یوان ایک خیر سگالی مشن کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ [2] رانچی کی نظر بندی سے جنگ عظیم اول کے بعد رہائی ملی تھی۔ [3] اگلے صفحے پر حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

بحمد اللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۱۹۹)

باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر ہے یا ہونا چاہیئے، اس کے متعلق کیا عرض کروں مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں، لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی ہے، لیکن کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملہ میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔

(بنام عشرت رحمانی۔ مورخہ ۳۰ راگست ۱۹۲۱ء۔ اقبال نامہ

(فٹ نوٹ صفحہ ۱) ، غالباً سید صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے شکوہ کی مولانا آزاد کو اطلاع کردی تھی۔ چنانچہ مولانا آزاد مرحوم اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں: "ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی، اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ دراصل اس کمبخت "تذکرہ" کی ساری باتیں میرے لئے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا، میں نے واپس نہیں بھیجا اس لئے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کرکے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کردی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا اور درجہ ضمنی مطولات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہوگیا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا، شاعت میں روک ہوگا، لیکن انھوں نے بجنسہٖ چھاپ کر جلد باندھ کر یکایک ایک نسخہ بھیجدیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاج سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال کے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرز تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔ لطف یہ کہ اس مرتبہ جب وہ جلسے کے موقع پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی کی، تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا، حالانکہ میں نے جو بات کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامۃ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور دونوں نظموں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔

([illegible])

اکبرالٰہ آبادی

..... اسی ضمن میں پین و پلیثرز اور چند دیگر الفاظ کے متعلق کچھ نوٹ لئے تھے۔ الہلال میں یہ بحث دیکھ کر میں نے بغیر زیادہ غور کئے ایک خط اڈیٹر صاحب کو لکھ دیا، جس کو انھوں نے چھاپ دیا ..... میں اپنے خط کو واپس لیتا ہوں۔

(بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۱۳ء خطوط مشاہیر، ۱۴، ۲۴)

میں نے ابھی الہلال کو لکھ بھیجا ہے کہ میں اس تحریر کو واپس لیتا ہوں۔ آپ کو بھی اجازت دیتا ہوں کہ ان الفاظ کی بحث میں (جس غرض سے وہ پیش ہی) مجھ کو اپنے خلاف نہ سمجھئے۔ آپ کی کل تحریر سے مجھ کو اتفاق ہی بجز اس کے کہ ہیپینس (HAPPINESS) کا ترجمہ لذت میں ابھی نہیں سمجھا۔

(ایضاً۔ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۱۳ء)

میں نے الہلال کے آرٹیکل نہیں دیکھے تھے۔ صرف اسی پر نظر پڑی تھی کہ حظ و کرب ۱؎ لذت والم میں کس کو ترجیح ہے۔ پچھلے دونوں لفظ بہت مانوس تھے، میں نے الہلال کو دو سطریں لکھ بھیجیں۔ اس کے بعد میں نے آرٹیکل پڑھے، آپ کی مشکلات کا خیال آیا، لہذا میں نے دست برداری کی ؎

نہ گفتہ نہ دارد کسے با تو کار ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

۱؎ (PAIN - PLEASURE) اس وقت یعنی ۱۹۱۳ء میں میں فلسفۂ جذبات لکھ رہا تھا۔ نفسیات کی بہت سی اصطلاحیں اردو میں گویا پہلی بار آرہی تھیں۔ نو عمری کا زمانہ ایک تو یوں ہی جوشش کا ہوتا ہے (میرا سن اس وقت ۲۱ سال کا تھا) پھر پہلی تصنیف، جوش دُہرا دُہرا تھا۔ مولانا ابوالکلام صاحب الہلال کی فرمائش پر کتاب کا ایک باب الہلال میں اشاعت کے لئے گیا۔ ان دو انگریزی لفظوں کے ترجمے حظ و کرب تجویز کئے تھے۔ الہلال نے اس پر نوٹ دیا کہ ان کے بجائے لذت والم مناسب ہیں اور اس پر ایک طویل و سرگرم بلکہ تلخ و تند سلسلۂ بحث الہلال ہی میں چل نکلا۔ الہلال نے اپنی تائید میں ایک مکتوب حضرت اکبر کا شائع کیا تھا۔ اس خط اور اس کے بعد والے خطوط میں اشارے اسی بحث سے متعلق ہیں۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

.... ہاں جناب الہلال صاحب نے میرا خط نہیں چھاپا۔ لکھا کہ میرے دوسرے آرٹیکل کے منتظر رہیئے۔ آپ کی فلسفہ دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ میں نے ان کو بھی مشورہ دیا کہ جب جملہ امور متعلقہ پر لحاظ کرنا منظور و ممکن نہیں تو اعتراض سے اعراض اولیٰ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۹، ۵۲ مورخہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء)

... خط کا ٹھیک اپوزٹ ٹرم مجھ کو سوائے حرمان کے کوئی نہیں ملتا۔ لیکن حرمان میں جو معنی ہیں خط کا آئیڈیا اس میں بھی نہیں ہے۔ اردو میں مایوسی کے معنوں میں شعراء کی زبان پر ہے۔ یاس و حرمان غالباً کہہ سکتے ہیں۔ وہ محظوظ ہوئے، میں محروم رہا۔ لذت و الم میں کچھ حرج نہیں لیکن واضع مصطلحات کو اختیار ہے۔ آپکے دوست الہلال کا زرِ ضمانت ضبط ہو گیا ؎

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر | دورِ فلک ہلال کو لایا صلیب پر[1]

(ایضاً۔ مورخہ ۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء ص ۵۵)

میں نے الہلال کی گواہی اسی سبب سے واپس لی تھی کہ ایک لفظ پر کسی ایک پہلو کے لحاظ سے ٹوک دینا آسان ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی نظر میں مفہومات فلسفہ ہیں۔ آپ سسٹم چاہتے ہیں، ہسٹری چاہتے ہیں، نہایت بلند اور مشکل کام ہے، اعتراض بیجا ہے، بجز اس کے کہ آپ ہی کی طرح آپکے ساتھ اس کام میں دن رات غرق رہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۸)

۳ر ستمبر کے پرچہ الہلال میں جو فہرست علوم کے نام کی شائع ہوئی ہے، کاش ہر ایک علم کے ساتھ اس علم کے دو ایک مسئلہ بھی لکھ دیئے جاتے تو یہ فہرست بہت مفید ہو جاتی۔ کیونکہ نہ صاحب مضمون سے درخواست کی جائے۔ آپنے فرمایا تھا کہ الہلال نے موجودہ مضمون شائع کر دیا ہے کس تاریخ کے پرچے میں شائع کیا ہے؟ (ایضاً مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۶۱، ۶۲)

.... کوشش کیجیے کہ بیان صاف ہو۔ ابو الکلامی نہ ہو۔ (ایضاً، مورخہ ۴ر جون ۱۹۱۷ء ص ۱۰۱)

---

[1] اکبر صنعتوں کے بھی بادشاہ تھے۔ مغرب اور غریب کی اور مغرب اور الہلال کی اور برق، ہلال اور فلک کی مناسبتیں بالکل ظاہر ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریا بادی)

مولانا عبدالحق بابائے اردو

بڑی فکر یہ ہے کہ دلّی میں جاکر ٹھہروں کہاں۔ سوا ابوالکلام آزاد یا رفیع احمد قدوائی دوسری کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔

(بنام مولوی سید ہاشمی فریدآبادی۔ تاریخ درج نہیں۔ اردو نے مصفیٰ صفحہ ۱۵۴)

اب غور طلب مسئلہ انجمن کی منتقلی کا ہے۔ اس پر غور کر رہا ہوں۔ دریا گنج جانے سے سب منع کرتے ہیں۔ اب رہے وہ مکانات جو ہماری زمین پر بنا لئے گئے ہیں، اس بارے میں مولانا اور پنڈت نہرو سے گفتگو کرنی باقی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۵)

مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور میرے ساتھ رفیق اور شبر بھی ہیں مجھے وہاں کے قیام سے بہت شرم معلوم ہوتی ہے۔ سچ مچ ایک پناہ گزیں کی حیثیت ہے.... ہم مولانا کے ہاں ناخواندہ مہمان یا پناہ گزینوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ مجھے آئے چوتھا روز ہے، لیکن وہاں ایک ایک دن بھاری ہے اور جب آدمی چائے یا کھانے کے لئے بلانے آتا ہے تو مجھے بے حد شرم معلوم ہوتی ہے.... آج جب ہم چائے پی رہے تھے تو دفعتہً قاضی عبدالغفار خاں نازل ہوئے اور چائے میں شریک ہوئے۔ رفیق اور شبر سے کچھ علیک سلیک ہوئی۔ وہ بھی مولانا کے مہمان ہیں۔ پہلے مولانا کو جو مکان ملا تھا (شاید پرتھوی راج روڈ پر) وہ بہت وسیع اور عالی شان اور اس کا چمن بہت ہی پربہار تھا۔ یہ مکان بہت چھوٹا ہے اور مہمانوں کے لئے صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اس میں ہم تین اور ایک اور صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب نے اجمل خاں سے کہا کہ میں ان کے ساتھ نہیں ٹھہروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اتنے میں غدارملت.... پہنچے انھوں نے مولانا سے جاکر کہا تو مولانا نے اوپر کی منزل میں اپنے پاس کا کمرہ ان کو دے دیا۔ مولانا ہمارے ساتھ چائے یا کھانا نہیں کھاتے۔ (ایضاً صفحہ ۵۷-۱۵۶)

مولانا کے ہاں قیام سے مجھے بہت شرم معلوم ہوتی تھی اور وہاں زیادہ ٹھہرنا مجھے گوارا نہ تھا اس لئے نظام پیلس میں آگیا ہوں۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۸)

قاضی محمد عبدالغفار

آپ کی اخبارات اور رسائل کی فہرست میں میں نے دیکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" اور رسالہ "لسان الصدق" کی چند جلدیں آپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں: "آثار ابوالکلام آزاد" کا نیا اڈیشن تیار کر رہا ہوں اور اس سلسلہ میں ان دونوں جرائد کو دیکھنا چاہتا ہوں...... یہ فائل خود مولانا آزاد کے پاس بھی نہیں ہیں۔

(بنام عبدالقوی دسنوی۔ مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۵۴ء

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر فلم "مرزا غالب" کے متعلق کوئی اطمینان بخش فیصلہ نہ ہوا تو یہ معاملہ بہت آگے بڑھے گا اور وزیر اعظم اور مولانا آزاد تک جائے گا۔

(بنام شہاب الدین دسنوی۔ مورخہ ۶ نومبر ۱۹۵۴ء نقوش۔ مکاتیب نمبر)

یہ غور کرنے کی بات ہے اگر مرکزی انجمن یا اس کے سکریٹری کی طرف سے کوئی آواز اٹھائی بھی جائے تو اس آواز کو ٹھوس اور ہر طرح مستند مواد پر مبنی ہونا چاہیئے، تاکہ جب پنڈت جی یا مولانا سے بات کریں تو ان کے سوالات کا پوری طرح جواب دے سکیں۔

(بنام حمیدہ سلطان۔ مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۵۴ء۔ ایضاً)

نواب وقار الدولہ وقار الملک مشتاق حسین خاں

(مسلم یونیورسٹی کے) ڈیپوٹیشن کے ممبروں کے نئے انتخاب کے وقت ایک تو اس بات کا ضرور لحاظ ہے کہ موزوں نام کافی تعداد میں منتخب ہوں، خواہ ان کی تعداد میں پہلے سے کمی کر دینا ضروری نہیں اور پھر جو لوگ اہل الرائے اور قوم کے ہمدرد ہوں ان کے انتخاب کی کوشش کی جائے، مثلاً حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب، مولوی ظفر علی خاں صاحب اڈیٹر زمیندار، مولوی وحیدالدین سلیم، مولوی ابوالکلام صاحب آزاد،....

(بنام حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس آتاؤلی۔ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء۔ مکاتیب نواب محسن الملک ووقار الملک۔ صفحہ ۱۳۰۔۱۳۱)

مہدی الافادی

ایک صاحب (ابوالکلام) "مستی"[1] کے پیچھے پڑے ہیں کہ بے لگاؤ اس کا استعمال سنجیدگی کے خلاف ہے۔ ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

پینے کا اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن اس خوش کیف شخص نے مخمور آنکھیں (رسیلی بینیاں لڑنا بھری) تو دیکھی ہوں گی، پھر یہ "تقدس ربانی" کیا "کفر" نہیں ہے؟

(بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ مورخہ ۸ر اگست ۱۹۱۹ء مکاتیب مہدی[11])

کلکتہ سے "تذکرہ" (ابوالکلام) کی ایک جلد ہدیتہً ملی۔ رانچی کے بعد یہ دوسری رجسٹری تھی۔ جو میرے نام بھی گئی۔ اس امتیاز سے بہت خوش ہوں کیا اب بھی میرے بڑے آدمی ہونے میں شک ہے؟۔ (ایضاً مورخہ ۳۰ر ستمبر ۱۹۱۹ء۔ صفحہ ۸۵ - ۸۶)

"تذکرہ" ابوالکلام کی ایک جلد ہدیتہً ملی۔ ظاہری حیثیت سے لائق رشک ہے اور کیوں نہ ہو مسٹر احمد کی مشاطہ گری نے حسن کا غذی کو خوب نکھارا ہے، لیکن سوال یہ ہے کتاب کہاں تک اپنے موضوع کے حدود میں ہے۔ اب تک جس قدر دیکھ سکا، "اسماء الرجال" کا خاکہ ہے، خودرو ریمارکس ہیں، بے ترتیب فصلوں میں جمع کر دئے گئے ہیں، لیکن خاتمہ جان دے دینے کے لائق ہے۔ ذرا اچھی طرح کھلنے گا۔ اظہار خیال محفوظ رہے گا۔ الہلالی تبلیغ کو میں پسند تو کرتا ہوں لیکن افسوس ہے کہ مرض کا یہ اصلی علاج نہیں۔۔

(بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۱۹ء ایضاً صفحہ ۹۰)

مولانا سیماب اکبر آبادی

یہ آپ بار بار کہتے ہیں کہ تاج کو الہلال ہونا چاہیے اور میں بار بار کہہ دیتا ہوں کہ "

---

[1] "سامنے آئینہ تھا مستی تھی"۔ عزیز لکھنوی کے اس استعمال "مستی" پر مولوی ابوالکلام آزاد کو اعتراض تھا۔ ہمدم میں اسی پر مباحثہ رہا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی۔

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔" الہلال ایک مذہبی رسالہ تھا، تاج ایک سیاسی اخبار ہے الہلال ایک رہنمائے ملک کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، تاج ایک شاعر کی اڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے، پھر میں جانتا ہوں کہ سیاست میں مجھے کمال حاصل نہیں، نہ ایک سیاسی شخص کی حیثیت سے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

(بنام ساغر نظامی۔ مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۳۱ء۔ روح مکاتیب حصہ اول صفحہ ۱۹۶)

"خطوط رموزی" کے نام سے اردو کے مقبول مزاحیہ نگار ملا رموزی کے کچھ خطوط شائع ہوئے ہیں۔ غالباً یہ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین ہیں جو خطوط کی شکل میں لکھے گئے ہیں، مگر چونکہ اس مجموعہ کو خطوط کی صنف میں شمار کیا جاتا ہے، اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کے اقتباسات بھی یہاں پیش کئے جائیں۔

"خیام" لاہور کے سالنامہ میں غالباً مولانا آزاد کی کوئی غزل شائع ہوئی تھی۔ ملا رموزی اڈیٹر خیام شبلی بی کام کو لکھتے ہیں: "مشہور لوگوں کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے، تو جب ابوالکلام آزاد ایسے رئیس المشاہیر شاعر کی غزل تک اس میں موجود ہے تو اب اس کے بعد گاندھی جی کی غزل ہی اور رہ جاتی ہے، ورنہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک اردو کا اخبار اپنے سالنامہ میں کیا ستارہ مشتری اور ناہید لے آئے؟" (صفحہ ۲۷-۲۸) اڈیٹر رسالہ "ارمغان" دہلی کو اردو صحافت کا ذکر کرتے ہوئے الہلال کے بارے میں لکھتے ہیں: "صحافت اردو میں "الفاظ کا ذخیرہ" بہت خاصا جمع کیا جا رہا ہے، بہت علوم [illegible] تحقیق تو اس کا وجود نہ اخبارات اردو میں نہ رسائل اردو میں، مگر اس کے اسباب ہیں۔ چنانچہ نمبر ایک یہ کہ اخبار الہلال اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کو ملک میں سب سے سوا اعتبار، اور وقعت کیوں حاصل ہے؟ بس اس لئے کہ ان پرچوں نے جو بلند مضامین پیش کئے؟ محض اس لئے کہ ان کے اڈیٹروں نے واقعی معنی کے علوم حاصل کئے اور اس طرح کہ ان علوم کی باقاعدہ تکمیل کی، پھر مطالعہ کو وسعت دی، نتیجہ یہ کہ نام پایا۔" (صفحہ ۱۶۸)

مولانا سید سلیمان ندوی

(مضمون کی کتابت ہو چکی تھی اور رسالہ پریس کے لئے تیار تھا کہ عین وقت پر معلوم ہوا کہ سید صاحب کے کچھ خطوط معارف میں چھپے ہیں ان میں مولانا آزاد کے متعلق جو تذکرے ملے ہیں، یہاں پیش کرتا ہوں۔

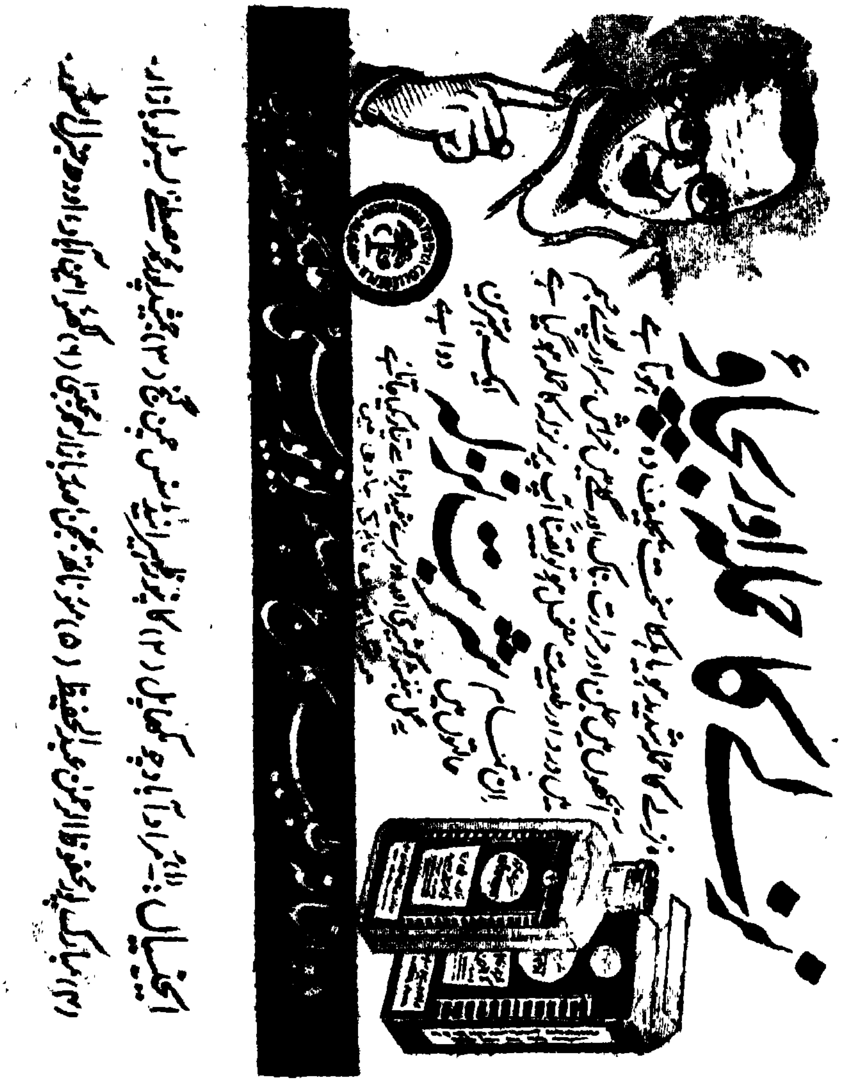
اسی اثنائے نظر بندی میں مولانا ابوالکلام سے ملاقات باوجود اشتیاق نہ ہو سکی، اس کا افسوس اور حسرت ہے۔ (بنام مولوی ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی۔ مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۸ء معارف ستمبر ۶۶ ص ۲۲۴)

مولانا شیروانی اور مولانا ابوالکلام کی چھیڑ چھاڑ اخبارات میں آپ پڑھ چکے ہیں حالانکہ دونوں مولانا شبلی کے واسطہ سے باہمدگر علمی دوست تھے، مگر اختلافِ نظر دونوں کو حق کا منظر دوجگہ دکھا رہا ہے۔ (ایضاً ۲۲۵، ۲۲۶)

یہاں آکر (ناگپور بہ سلسلہ اجلاس کانگریس اعظمی) میری طبیعت کچھ اچھی نہیں رہی، اکثر لوگ مبتلائے بخار ہیں، ایک کمرہ میں مولوی ابوالکلام تپ کا شکار پڑے ہیں، دوسرے کمرے میں محمد علی صاحب کی بیوی انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۸)

بیچارہ مولوی مسعود علی صاحب نے ضلع بھر میں (اعظم گڑھ میں بہ سلسلہ خلافت اعظمی) جلسہ کا پروگرام شائع کیا تھا، تین چار جگہ کے جلسوں کا پروگرام تھا، سب گڑبڑ ہو گیا، آج وہ ڈرتے ہوئے شاہ گنج گئے ہیں، بنارس گئے تھے کہ گاندھی جی، محمد علی اور ابوالکلام کو لے آئیں گے۔ گاندھی جی تو صاف نکل گئے، محمد علی صاحب اور ابوالکلام نے ۲۸ کا وعدہ کیا ہے۔ محمد علی صاحب کا خط آیا ہے کہ وہ تاریخ بھی نہ رہی، ۱۶ مارچ کو وہ آسکتے ہیں، بشرطیکہ اس کے معاوضہ میں ایک مہینہ قومی یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اعظمی) میں ترتیب نصاب کے لئے قیام کروں۔ دیکھیں مولانا ابوالکلام کیا گل کھلائیں۔ مجھے تو وہ تاریخ بھی ٹلتی نظر آتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۹)

شوکت صاحب کے چھ سات تار آئے اور بڑی لجاجت کے، انصاری صاحب کے آئے، ابوالکلام صاحب اور ظفر علی خاں کی طرف سے آئے، میں نے دل پر جبر کرکے سب کو جواب دیا ہے ..... تیسری کو صبح ۱۰ بجے شاید کلکتہ میں داخلہ ہو، اگر ابوالکلام صاحب نے نہ روکا تو اسی شب کو پٹنہ روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے اعظم گڑھ۔ (ایضاً معارف اکتوبر ۶۰ صفحہ ۳۱۰)



بیان بابتہ ملکیت رسالہ و دیگر تفصیلات

فارم نمبر ۴

مقام اشاعت: جامعہ نگر۔ نئی دہلی نمبر ۲۵

وقفۂ اشاعت: ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اور اڈیٹر کا نام: عبداللطیف اعظمی

قومیت: ہندوستانی

پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ملکیت: جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔ دستخط پبلشر: عبداللطیف اعظمی

۲۵ فروری سنہ ۱۹۶۳ء

مطبوعہ ... پرنٹنگ پریس دہلی ۔ ۱۹۶۳ ۔ صرف ٹائیٹل ...

Regd. No. D - 768 March 1963

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

38-(4)

اپریل ۶۳

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۸	بابت ماہ اپریل ۱۹۶۳ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

دور کے اندیشے

پروفیسر محمد مجیب

بچے اپنی طبیعت سے ماں باپ کی عزت کریں تو یہ ایک پیاری اخلاقی صفت ہو جاتی ہے، وہ خوف سے یا لالچ سے یا بار بار کہنے سے ان کی عزت کریں تو اس سے تربیت اور تعلیم کی ایک ضروری شرط پوری ہو جاتی ہے، مگر ماں باپ اولاد کے قدرتی رشتہ میں ایک بناوٹ بھی آجاتی ہے جس میں ایک شائبہ لگاڑ کا بھی ہوتا ہے۔ دوست ایک دوسرے پر احسان کرتے ہیں تو اس سے دوستی میں استقلال اور لطف پیدا ہوتا ہے، لیکن ان میں سے کسی کو کہنا پڑے کہ میرا یہ کام دوستی کی خاطر کر دو تو دوستی میں لین دین کی بو آجاتی ہے۔ دوسری طرف غالب کا یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ کثافت کے بغیر لطافت کا جلوہ نظر نہیں آسکتا۔ قدرت کے حسن کو ظاہر ہونے کے لئے چمن اور سبزہ کی ضرورت ہے۔ اسی اصول پر انسانی زندگی کے حسن کو نمایاں کرنے کے لئے قاعدہ قانون، دستور اور رواج درکار ہوتا ہے۔ جمہوریت مروت ہے، شرافت ہے، احسان ہے، آزادی انسانیت کی آبرو، اخلاق کی جان ہے، مگر جمہوریت اور آزادی کو وجود میں لانے اور قائم رکھنے کے لئے ایسے جتن کرنے پڑتے ہیں کہ سختی اور جبر کا شدید احساس ہوتا ہے اور ان کے بدلے جو کچھ ملنا چاہیئے، اس کی حیثیت وعدہ اور امید کی سی ہی رہتی ہے۔ آزادی ہمارا حق ہے، جمہوری حکومت اس حق کو محفوظ رکھنے اور زندگی کا معمول بنانے کی سب سے اچھی تدبیر، آزادی خریدا ہوا مال نہیں ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ کم یا زیادہ، ناقص یا اچھا۔ جمہوری حکومت ہم نے خود اپنے لئے پسند کی ہے، آزادی اور جمہوریت نے ہم میں رشتے قائم کر دئے ہیں، جنھیں مضبوط کرنا اور مضبوط رکھنا ہمارا

فرض ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس فرض کو بہتر سے بہتر طریقے پر انجام دیں۔ یہ بات سب کی سمجھ میں آجاتی ہے اور سب اسے مان بھی لیتے ہیں، لیکن سمجھ لینے اور مان لینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ بات ہر دم نظر میں رہے اور جو فیصلہ اور خواہش ہو وہ اسی کے مطابق ہو۔ لوگ خدا کو مانتے ہیں، دل سے نہیں تو زبان سے ضرور کہتے ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کرتے وہی ہیں جو ان کے جی میں آتا ہے، وجہ یہ ہے کہ جو نسبت مادی چیزوں کی ہے وہ عقیدے اور اصول کی دنیا میں نہیں ہے۔ پہاڑ بڑا ہوتا ہے اور بڑا معلوم ہوتا ہے، پتھر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا۔ آزادی کا اصول بہت بڑا ہے، ہمارے روزمرہ کے مسائل بہت چھوٹے، مگر بڑی چیز چھوٹی چیز کے آڑ میں چھپ جاتی ہے، ہمارا دیس جس سے ہم سب محبت کرتے ہیں بہت بڑا ہے، ہمارا گاؤں، یا شہر یا علاقہ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے، مگر ہم ملک کے معاملات کا اتنا خیال نہیں کرپاتے جتنا کہ اپنی بستی یا علاقہ کا۔ اور اس کے فائدے کے لئے اس طرح جھگڑتے ہیں کہ جیسے ملک سے ہم کو کوئی خاص واسطہ نہیں۔ ہماری آزادی اور ہماری جمہوری حکومت کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ ہم خیالات کی دنیا میں چیزوں کی صحیح نسبت قائم رکھیں اور چھوٹی چیز کے پیچھے بڑی کو بھول نہ جائیں۔

انسانی زندگی ہمیشہ اور ہر جگہ خطروں سے گھری رہتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کے لئے بھی طرح طرح کے خطرے پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن سے بچنے کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ لوگ ان سے واقف ہوں اور بچاؤ کی تدبیریں کرتے رہیں۔ ہندوستان کے لئے ان اندیشوں کے علاوہ جو ہر ملک کو ہوتے ہیں یہاں کی زبانوں اور مذہبوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہونا چاہیئے، جو سرکاری زبان بھی ہو، لیکن ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں سے چودہ کا دستور میں باقاعدہ ذکر ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے قدرتی طور پر ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کی ترقی

چاہتے ہیں۔ پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں یہ زبانیں ذریعہ تعلیم بن چکی ہیں اور اب انھیں یونیورسٹیوں میں بھی ذریعہ تعلیم بنایا جا رہا ہے۔ اصولاً یہ بالکل صحیح ہے، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی پوری تعلیم ان کی علاقائی زبان میں ہوگی ان کا دوسری زبانیں بولنے والوں سے رشتہ کیسے قائم رہ سکے گا۔ قومی زبان سب سیکھیں گے، لیکن اس میں بے تکلفی سے گفتگو اور پڑھنا لکھنا انھیں کے لئے ممکن ہوگا جن کی مادری زبان بھی ہو، اس طرح علاقائی زبانوں کی وجہ سے اس کا اندیشہ ہے کہ آبادی کے بڑے بڑے بڑے حصوں کے درمیان ایک اجنبیت سی پیدا ہو جائے گی، جو قومی یکجہتی کے لئے بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔

مذہبی اختلافات کی وجہ سے ہندوستان کو بہت نقصان پہنچ چکا ہے اور بہت سے لوگ انھیں کو دور کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم یہ قانون بنا سکتے ہیں کہ اسکولوں میں مادری زبان کے علاوہ دو یا تین ہندوستانی زبانیں سکھائی جائیں۔ اس سے تعلیم میں بے شک دشواری پیدا ہوگی، مگر کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ اس سے دستور کا دیا ہوا حق چھینا جا رہا ہے۔ یہ حکم دینا کہ ہر ہندوستانی اپنے مذہب کے علاوہ ہندوستان کے ایک یا دو اور مذہبوں کی تعلیم حاصل کرے ممکن نہیں اور ممکن ہوتا بھی تو اس کا بھی بھروسہ نہیں کہ اس طریقے سے اختلافات کم ہوں گے یا بڑھیں گے لیکن دراصل زبانوں کا اختلاف مذہبی اختلافات سے زیادہ خطرناک ہے، لوگ چاہیں تو مذہب کے اختلاف کو نظر انداز کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کی وجہ سے مخالفت صرف کبھی کبھی اور خاص معاملوں میں پیدا ہوتی ہے۔ زبان کا اختلاف ہر وقت موجود رہتا ہے اور ہزاروں طریقوں سے سامنے آتا ہے۔ مسلمان اقبال کی طرح یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا، مگر کہنے کے لئے اس کے پاس کوئی سند ہے کہ ہندی اور تامل یا اردو اور تلگو کا فرق مٹایا جا سکتا ہے

ایسے ہی ہندی زبان اور مذہب کے اختلاف سے جو خطرے پیدا ہوتے ہیں انھیں مثال سمجھ کر سوچیے کہ آزادی اور جمہوریت کی حفاظت کے لئے کیا کرنا چاہیے آزادی ایک کیفیت کا نام ہے اور ہر کیفیت بدلتی رہتی ہے ہمارے سب کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی وقت محسوس کریں کہ آزاد ہیں اور کسی وقت یقین ہو جائے کہ آزاد صرف وہ ہیں جس کے ہاتھ میں طاقت اور اختیار ہے۔ آزادی کے احساس کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم جتنی شدت سے اپنے لئے آزادی کا مطالبہ کریں، اتنے ہی شوق سے ہر دوسرے شخص کو ایسی ہی آزادی دینے پر تیار ہوں۔ جمہوریت کی روح رائے دینے اور بحث کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کی خواہش اور ضرورت کا لحاظ۔ آپ کہیں گے کہ یہ ممکن نہیں ہے لوگوں کو صحیح رستے پر چلنے کے لئے مجبور نہ کیا گیا تو وہ بھٹک جائیں گے۔ آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے، خود غرضی پر متفق ہو کر جمہوریت کا نام بدنام کریں گے۔ یہ اندیشہ بھی بے جا نہیں۔ اسی وجہ سے آزاد جمہوری حکومت کو بھی قانون اور عدالت کی ضرورت رہتی ہے۔ قانون۔ عدالت۔ ٹیکس اور مختلف قسم کی پابندی وہ کثافت ہیں جس کے بغیر آزادی اور جمہوریت کی لطافت ظاہر نہیں ہو سکتی لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اپنی نظر کہاں جمائیں۔ قاعدے قانون اور کثرت رائے پر یا مروت شرافت اور احسان پر۔ اس کا فیصلہ کوئی ایک شخص یا کوئی ایک سیاسی پارٹی سارے ملک کے لئے نہیں کر سکتی۔ یہ فیصلہ صرف ہر شہری اپنے لئے کر سکتا ہے تعلیم تربیت کی پوری کوشش ہونا چاہیئے کہ وہ اس فیصلے کی طرف مائل ہو، مروت، شرافت اور احسان کی ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی مثالیں قائم کرے جس سے یقین ہو کہ یہ صفتیں ملک کی فضا میں ہیں صرف چند یادگار تاریخی شخصیتوں میں نہیں ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کو انسانیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مدار انھیں صفتوں پر ہے جو آدمی کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا حامل بناتی ہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

غزل

حضرت غلام ربانی تاباں

فراغ دل کو کہاں غم کے مشغلے کے سوا
سکون کچھ بھی نہیں ایک واہمے کے سوا

حرم بھی دیر بھی ہنگامہ زار سود و زیاں
مقام امن نہیں کوئی میکدے کے سوا

نہ کوئی راہ سے نسبت بجز خرابیٔ راہ
نہ کوئی ربط ہے منزل سے فاصلے کے سوا

ہم اہلِ شوق پہ سب آسرے حرام ہوئے
تری جفائے فراواں کے آسرے کے سوا

کرے ہے درد تمنا گلوں کے ساتھ نمو
بہار کیا ہے غم دل کے مرحلے کے سوا

وہ کشمکش جسے آسودگی کی جان کہیں
کہاں نصیب دل و دل کے رابطے کے سوا

بہت دنوں میں یہ جانا کہ کچھ نہیں تاباںؔ
حیات شوق شکستوں کے سلسلے کے سوا

مولانا آزاد کی ایک آرزو

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہے ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم اس زمانہ میں جامعہ کے امیر (چانسلر) تھے ان کی خواہش تھی کہ جامعہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ جاری کیا جائے جس میں ایسے اصحاب کو لکچر دینے کی دعوت دی جائے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوں یہ جامعہ کی شدید عسرت کا دور تھا مگر ڈاکٹر انصاری مرحوم کی توجہ نے کارکنوں کی ہمت بندھائی اور خطبات کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ٹرکی کے سابق امیر البحر حسین رؤف بے کو دعوت دی گئی۔ طرابلس و بلقان کے معرکوں اور جنگ عظیم میں رؤف بے نے ہمت و جرأت کے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دئے تھے ان کی بنا پر انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں یہ کارنامے الہلال کے ذریعہ لوگوں کے علم میں آئے تھے۔ ایک طرف ہمت و جرأت اور سرفروشی و جاں بازی کے یہ واقعات، دوسری طرف الہلال کا پر زور قلم نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والوں کے دل جوش و ولولہ سے بھر جاتے تھے، اس بنا پر جلسوں کی صدارت کا سوال ہوا تو سب سے پہلے مولانا ابوالکلام کا نام سامنے آیا۔ لوگوں کو بڑی خوشی تھی کہ ایک طرف رؤف بے کو دیکھنے اور ان کے خیالات سننے کا موقع ملے گا اور دوسری طرف مولانا آزاد کے عالمانہ تبصرہ سے استفادہ اور ان کی بے نظیر خطابت سے جوش عمل اور ولولہ کار میں اضافہ کا موقع ملے گا لیکن افسوس کہ مولانا کی صحت عین وقت پر خراب ہو گئی اور تشریف نہ لا سکے۔

چند دنوں کے بعد مولانا کی تندرستی بحال ہوئی تو آپ دہلی تشریف لائے۔ دریا گنج میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی، اس میں قیام ہوا۔ میں اس زمانہ میں جامعہ میں پڑھتا تھا چند دوستوں نے

طے کیا کہ مولانا سے ملنے چلا جائے۔ چنانچہ ہم لوگ دریا گنج پہنچے، اطلاع کرائی کہ جامعہ کے چند طلبہ حاضر ہوئے ہیں۔ سکریٹری نے اطلاع کی اور مولانا نے کمرہ کے اندر بلا لیا۔ رؤف بے کی تقریروں کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ذہنوں میں جنگ عظیم کے بعد ٹرکی کے انقلابی حالات اور کمالی اصلاحات تازہ تھیں۔ الفاروق، خلافت کے سلسلے میں مولانا آزاد کا مشہور سلسلہ مضامین پڑھ چکا تھا جو زمیندار کے چالیس کالموں میں شائع ہوا تھا اس طرح کچھ اس کی توجیہہ سمجھ میں آتی تھی اور دل کو یوں بھی اطمینان دلا لیا تھا کہ

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند   می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے۔ قصر خلافت کے بوسیدہ کھنڈر مسمار ہو چکے ہیں ممکن ہے ان پر نئے در و بام تعمیر ہوں۔ لیکن اسلامی قوانین کو منسوخ کر کے یورپی قوانین جاری کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور اس قسم کی اصلاحات مذہبی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض محسوس ہو رہی تھیں۔ مولانا سے ملاقات ہوئی تو رؤف بے کی تقریروں کا ذکر آیا اور اس سلسلہ میں ٹرکی کے موجودہ حالات پر گفتگو نکل آئی ہم میں سے کسی نے عرض کیا یہ مصطفےٰ کمال کی لامذہبیت کا نتیجہ ہے لیکن مولانا نے فرمایا،

"نہیں یہ اس عقیم نصاب تعلیم کا نتیجہ ہے جس نے نئے انداز نظر کو نظر انداز کیا اور ان علماء کا قصور ہے جو ہنوز ارسطو و افلاطون کے درکی جاروب کشی میں مصروف ہیں دنیا بدل گئی ہے علوم فنون کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں فکر و نظر کا معیار کچھ سے کچھ ہو گیا ہے ذہنوں کے سانچے یکسر بدل گئے ہیں لیکن ہمارے علماء ہیں کہ یونانیوں کے پس خوردہ ہی پر قناعت کئے ہوئے ہیں وہ عصر حاضر کے مسائل علم کلام کی فرسودہ کتابوں سے حل کرنا چاہتے ہیں اور نئے سوالات کے جواب پرانی کتابوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ اس طرز عمل کا یہی نتیجہ نکلنا تھا جو نکلا لیکن اب بھی ہمارے غور و فکر کا انداز نہیں بدلا ہم مصطفےٰ کمال کو گالی دے کر اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد بہت دیر تک دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر تبصرہ کرتے رہے اور اس کی کوتاہیوں اور خرابیوں کی تفصیل بیان فرماتے رہے پھر بڑے درد سے فرمایا کہ:

"اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم مصطفےٰ کمال یا کسی اور کو برا بھلا کہیں اور بڑھتی ہوئی لادینی پر صف ماتم بچھائیں بلکہ اصل خرابی کو سمجھیں زمانہ کے تقاضوں سے آشنا ہوں، نئے انداز نظر سے واقفیت حاصل کریں۔ جدید علوم وفنون کو نصاب میں شامل کریں، مذہب کے اصل سرچشموں تک رسائی حاصل کریں، تقلید جامد کے شیوۂ قدیم کو ترک کریں، کتاب وسنت کے اصل نصوص کو غور وفکر کا مرکز بنائیں، نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا کریں، خود ساختہ رسم ورواج کی بندشوں سے آزاد ہوں اگر ہم نے ایسا کرلیا تو ہم عصر حاضر کی مشکلات حل کرسکیں گے اور لادینی کے سیلاب کو روک سکیں گے ورنہ ہماری کہنہ دیواروں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ وقت کے اس تیز وتند دھارے کو روک سکیں"۔

اس وقت مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری تھی بڑے درد کے ساتھ فرمایا

"مدتوں غور کیا ہے دین وملت کی فلاح کی اور کوئی راہ نہیں ہے جی چاہتا ہے کہ اس خیال کو کہیں عمل میں لانے کا موقع ملتا لیکن بدقسمتی سے کہیں آزمائش کا موقع نہیں ملتا"۔

واقعی یہ مولانا کی سوچی سمجھی رائے تھی الہلال کی اشاعت سے پہلے ہی یہ خیالات ذہن میں جاگزیں ہوگئے تھے، الوکیل وغیرہ رسائل واخبارات میں ان کے یہ خیالات شائع ہو چکے ہیں الہلال نکلا تو مختلف انداز میں اس جانب توجہ دلاتے رہے۔ چوتھی جلد تو ان مضامین سے پر ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ قدامت پسندوں نے مولانا شبلی کو ندوۃ العلماء سے علیحدگی پر مجبور کردیا تھا، ندوہ کی تحریک قدیم نصاب ونظام تعلیم کے خلاف ایک زبردست چیلنج تھی یہ مولانا شبلی کے دل کی آواز تھی وہ اور ان کے اصلاح پسند دوست اس تحریک میں شامل ہوگئے تھے، مولانا شبلی کی کوششوں سے

ندوہ کا دار العلوم جدید و قدیم کا سنگم بنتا جا رہا تھا اور امید ہونے لگی تھی کہ جس اصلاح کا خواب مصلحین ملت مدتوں سے دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر دار العلوم ندوۃ العلماء کے قالب میں نگاہوں کے سامنے آرہی ہے مگر جمود پسند طبیعتیں اس انقلاب کی متحمل نہ ہو سکیں قدامت پسند علماء نے مخالفت کا ایسا طوفان برپا کیا کہ ندوہ کی کشتی ساحل مراد تک آتے آتے رہ گئی مولانا شبلی کی علیحدگی نے اصلاح پسندوں کی تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ مولانا آزاد اس انقلاب حالت سے بہت متاثر ہوئے اس تاثر کے نتیجہ میں وہ طویل مضامین لکھے جو الہلال کی جلدوں میں اب تک محفوظ ہیں۔ اور جنھیں پڑھ کر ملت کی محرومی پر آج بھی دل خون ہوتا ہے۔

لیکن ندوہ کے اس دل دوز سانحہ کے بعد بھی مولانا آزاد کے دل سے یہ خیال نکلا نہیں بلکہ اس کی ضرورت کا احساس اور بھی شدید ہو گیا اصلاح ملت کے سلسلہ کے مضامین میں ان خیالات کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ الہلال کے صفحات میں ایک نئے طرز کی درسگاہ کی ضرورت کا بار بار اظہار ہوتا رہا اس وقت الہلال و البلاغ کی جلدیں سامنے نہیں ہیں لیکن مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار کلکتہ میں ایک درسگاہ کے قیام کا اعلان تھا بلکہ اس کی عمارت کی تصویر بھی شائع کی تھی لیکن پھر انگریزی حکومت نے مولانا کی جد و جہد کو خطرناک سمجھ کر الہلال بند کر دیا مولانا نے الہلال کے بعد البلاغ جاری کیا لیکن اس کے سترہ ہی پرچے نکل پائے تھے کہ وہ بھی بند ہو گیا اور ۱۹۱۶ء میں مولانا رانچی میں نظر بند کر دئے گئے۔

جنگ عظیم کے بعد جب سیاسی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی تو مولانا بھی نظر بندی سے رہا ہوئے لیکن باہر آئے تو ملک میں انگریزوں کے خلاف ایک ہیجان برپا تھا خلافت کے حوادث اور جلیانوالا باغ کے مظالم نے ہندو مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا تھا اور کانگریس و خلافت کانفرنس کے ذریعہ سارا ملک متحد ہو کر انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کی جد و جہد میں مصروف تھا مولانا نے ان حالات پر غور کیا اور ایک مرد مجاہد کی طرح ہر سمت سے یکسو ہو کر تحریک آزادی کی جد و جہد میں مصروف ہو گئے۔ اس مصروفیت میں کسی اور کام کا موقعہ تھا مگر مولانا نے اس ہنگامہ کے زمانہ میں بھی

کلکتہ میں ایک عربی اور دینی درسگاہ قائم کی مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی مولانا عبداللہ مصری مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا عثمان ندوی جیسے ذی علم اور صاحب نظر اساتذہ کے ذریعہ اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کی کوشش کی لیکن قید و بند کے اس دور میں کسی تعمیری کام کا چلانا سخت دشوار تھا مولانا آزاد پھر گرفتار ہو گئے۔ مولانا عبدالرزاق صاحب بھی جیل بھیج دیے گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم نے اس زمانہ میں بڑی کڑیاں جھیلیں فاقہ پر فاقے کئے لیکن ساری قربانیوں کے باوجود کلکتہ کی یہ اسلامی درسگاہ نہ چل سکی۔ اس وقت کی تکلیفوں کا اندازہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی کے مضمون "الجوع و مافی الجوع" سے ہو سکتا ہے۔ جو الجامعہ کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد آزادی کی تحریک میں برسوں ایسی مصروفیت رہی کہ کسی دوسرے کام کی جانب توجہ کا موقع نہ ملا مگر مولانا کے دل میں یہ خیال برابر جاری رہا۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس قیصر باغ کی بارہ دری میں ہو رہا تھا اس زمانے میں مجھے چند دوستوں کے ساتھ برلنگٹن ہوٹل میں ان سے ملنے کا موقع ملا اور وہاں سے مولانا کی ہمراہی میں نواب علی حسن خاں صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کوٹھی تک جانے کا موقع ملا۔ اس موقع پر ندوہ کی گزشتہ تاریخ کا ذکر کرتے رہے اور اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ ملت کی درماندگی کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں کہ "جدید و قدیم کا ایک سنگم بنایا جائے۔"

۱۹۳۷ء میں جب صوبہ جاتی خود مختاری حاصل ہوئی اور اکثر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں اور مولانا پنجاب، یوپی، بہار اور بنگال کے نگراں مقرر ہوئے تو آپ کو اس دیرینہ خیال کو پھر بروئے کار لانے کا خیال ہوا، عربی مدارس کو نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح پر آمادہ کرنے کے لئے لکھنؤ میں مدارس عربیہ کے منتظمین اور اساتذہ کا ایک جلسہ اپنی قیام گاہ پر کیا اس کے لئے ایک کمیٹی بھی بنائی جس کے کئی بار ان کی رہنمائی میں جلسے ہوئے مگر سیاسی حالات اس طرح کے تھے کہ مولانا زیادہ وقت اس کام میں صرف نہ کر سکے اور مدارس عربیہ کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور مولانا مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے

تو پھر اس دیرینہ آرزو کو جامۂ عمل پہنانے کا خیال آیا سرکاری طور پر ایک معیاری عربی درسگاہ قائم کی جاسکتی تھی مگر سرکاری درسگاہ کا مسلمانوں پر خاطر خواہ اثر نہیں ہو سکتا تھا پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی اصلاح کا خیال آیا لیکن اس کی جو سرکاری حیثیت اس سے پہلے رہ چکی تھی اور انگریزوں کے ساتھ اس کا جو تعلق تھا اس کی بنا پر اس سے بھی مطلوبہ مقصد حاصل کرنا ممکن نہ تھا اس زمانہ میں مولانا کو خیال آیا کہ کیوں نہ ندوہ کے دارالعلوم کی طرف پھر توجہ کی جائے جدید علوم کی تعلیم کے لئے بڑے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ لاکھوں روپے سالانہ کے مصارف برداشت کر سکیں اس لئے آپ نے ندوہ کے ارباب حل وعقد سے گفتگو کی اور فرمایا کہ حکومت ہند کی طرف سے دارالعلوم کے پورے مصارف کا انتظام کر دیا جائے اور بڑے پیمانے پر دارالعلوم کو چلایا جائے مگر ندوہ کے منتظمین اس پر راضی نہ ہوئے اور حکومت کے اثرات سے اپنی درسگاہ کو الگ رکھنا چاہا۔ مولانا کے اصرار پر ان لوگوں نے کہا کہ

"مولانا آپ ندوہ کو خوب سمجھتے ہیں آپ ہی کی سربراہی ہمیشہ حاصل رہتی تو ہمیں اس پیشکش کو قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا مگر آئندہ معلوم نہیں کن لوگوں سے سابقہ پڑے اور ندوہ کیا سے کیا ہو جائے اس لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ حکومت کی سرپرستی میں اس درسگاہ کو چلایا جائے۔"

اس جواب پر مولانا خاموش ہو گئے اور دل کی آرزو عمل کی شکل نہ اختیار کر سکی لیکن ہر صاحب فکر آج بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ ملت کی درماندگی کا یہ ایک بہترین علاج ہے۔ دیکھئے کب اور کہاں مولانا کی یہ آرزو بروئے کار آسکے۔

کج نگاہی

عبداللہ ولی بخش قادری

کچھ بھلے مانس ہمیشہ روٹھے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی گم سم، کبھی غرّاتے ہوئے۔ انھیں زمانے کی ایک بھی کل سیدھی نظر نہیں آتی۔ جہاں دیکھتے ہیں، چولیں ڈھیلی ہی پاتے ہیں۔ کوئی بھی چیز کس نہیں معلوم ہوتا۔ قدم قدم پر ان کا دل کڑھا کرتا ہے۔ ناگواری بڑھتی رہتی ہے اور جذبات کا ٹھہراؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ زرا سی زحمت بھی ان کے لئے ایک آفت بن جاتی ہے۔ ہر بات پر چڑتے ہیں، ہر کام پر جھیلاتے۔ تمام خوبیاں ان کے لئے ناپید ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جب بھی کسی طرف توجہ فرماتے ہیں، خرابی ہی دیکھتے ہیں۔ دوسروں کے عیب ٹٹولنے میں مزا آتا ہے اور مخالفت ان کی شریعت بن جاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہر صبح کا استقبال ایک جھنجلاہٹ کے ساتھ کرتے ہیں۔ بستر سے اٹھتے اٹھتے ماحول کی گرانی کا بوجھ انھیں محسوس ہونے لگتا ہے۔ چاہتے ہیں کہ ناک پر مکھی تک نہ بیٹھے۔ بلاوجہ تاؤ کھاتے ہیں۔ ذرا جو تانہ ملا، گرم ہو گئے۔ ناشتے میں کچھ دیر ہوئی، برس پڑے۔ کبھی متعلقین یا ملازمین کی شامت آتی ہے، کبھی موسم پر لعن طعن ہونے لگتی ہے۔ اللہ اللہ کرکے زندگی کا دھندا شروع ہوتا ہے لیکن سارا کاروبار چوپٹ دکھائی دیتا ہے۔ افسر ہیں تو کم نظر، ماتحت ہیں تو بے خبر۔ باقی بچے ساتھی۔ ان کی رائے میں سب کے سب ابن الوقت اور جہل مرکب۔ ہر ایک نالائق و نامعقول، مطلبی اور مکار۔ اگر ان کے منصب میں ترقی ہوتی ہے تو محض اس لئے کہ اقربا پروری اور احباب نوازی کا دور دورہ ہے۔ اگر وہ عزت و شہرت پاتے ہیں تو اس وجہ سے کہ سازش اور خوشامد کا زمانہ ہے۔ پڑوسیوں سے یہ خوش نہیں رہتے کیونکہ ان کے بچے شور مچاتے ہیں، بے ادب اور بد تمیز ہیں۔ کسی دعوت میں شریک ہوں تو انتظام و طعام کی شکایت

کرتے ہوئے یہ لوٹیں۔ کسی راہ گیر پر اگر نظر پڑ جائے تو ناک بیکیڑیں۔ کوئی صورت کا خراب نکل آتاہے تو کوئی جامہ زیب نہیں معلوم ہوتا۔ بازار جائیں تو کوفت انھیں ہو۔ اگر کوئی چیز پسند آتی ہے تو اس کی قیمت مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگر قیمت ٹھیک ہوتی ہے تو چیز اچھی نہیں لگتی۔ اگر اتفاقاً قیمت اور چیز دونوں قابل قبول ہوں تو دکان کا ڈھچر یا دکان دار کا رویہ قابلِ اعتراض ہو جاتاہے۔ جب بھی ان کے سامنے کسی ملاقاتی یا واقف کار کا تذکرہ ہوا اس کی ذات پر عمل جراحی یہ فرمائیں۔ معقول سے معقول آدمی کے ٹلنگے ان سے ادھڑوا لیجیے۔ طنزیہ قہقہے ان سے سنئے اور سرد آہیں یہ بھریں۔ غرضیکہ یہ بندۂ دو عالم کو خفا اپنے لئے ہے۔

اسی طرح جذبات کے مدّوجزر میں کبھی آنکھ بھول چڑھائے، منہ پھلائے اور کبھی منہ لٹکائے یہ آپ کو نظر آئیں گے۔ بچارے دل کا کانٹا، زبان سے نکالا کرتے ہیں اور دوسروں کی کجی دور کرنے کی فکر میں اپنی نگاہ کا زاویہ بگاڑ بیٹھے ہیں۔ پھر انھیں کوئی اتنا نظر نہیں آتا جسے یہ اپنی نظر میں رکھ سکیں اور ان کی نگاہ اپنے ہی توہمات میں الجھ کر رہ جاتی ہے، وہ اپنے آپ کو اطمینان کی لذّت سے محروم کر لیتے ہیں۔ اگر وہی بھات بھیترا ہو بھی تاہم کھانے کو منہ ٹیڑھا ہی رہتاہے۔ جب بھی انھیں دیکھیے، "بدلی ہوئی نگاہ ہے" بدلا ہوا مزاج! ان کی باتیں عموماً کوفت کا باعث ہوتی ہے جنھیں سن کر یہی کہا جاسکتاہے کہ:

سب تو کچھ نہیں معلوم لیکن نظر آتے ہیں وہ کچھ خفا سے

لیکن ان کچھ کچھ خفا رہنے والوں کی طبیعت میں یہ بات بھی داخل ہو جاتی ہے کہ قواعد و ضوابط کا احترام نہ کریں۔ اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند رکھیں۔ آپ کو ادبی دنیا میں ایسے ناقد ملیں گے جو قطعی ناقص ہیں یعنی صرف نقص نکالتے ہیں۔ آپ ایسے سیاست دانوں کو بہ آسانی شمار کر سکتے ہیں جو حکومت کی ہر بات پر معترض رہتے ہیں۔ وہ بات کو صرف اس حد تک سنتے اور سمجھتے ہیں کہ اس کی مخالفت کر سکیں۔ انھیں اپنے اگلے ہوئے نوالے چباتے ہوئے بھی ندامت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اعتراض میں نہ اعتدال کا خیال کرتے ہیں

اور نہ تضاد کا۔ آج کل کے ہنگامی حالات میں ایسے لوگ صاف پہچانے جا سکتے ہیں، جن کی غلط نگاہی نے اُن سے معقولیت چھین رکھی ہے انھیں آپ حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ فرماتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، سرکاری اقدامات میں یہ کیڑے ڈالیں۔ لوگوں کے جوش وخروش میں انھیں شبہ نظر آئے۔ سیاست کی خامیاں اِن سے سُن لیجئے۔ حفاظتی تدابیر کی بے اثری ان پر عیاں ہو۔ الغرض کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ان کی نظر ترچھی نہ پڑے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کا دل طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا، دیکھ کر جل گیا ہے اور یہ فی سبیل اللہ اعتراض واختلاف کا بازار گرم کر بیٹھے ہیں۔ ایسے بد نفس بالآخر اپنی ترچھی نظر کی بدولت قطعی طور پر خود غلط ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مدرسوں میں ایسے بچے اکثر ملتے ہیں جو ساتھیوں کے فیصلے سے ہٹ کر ضرور قدم رکھتے ہیں انھیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے میں مزا آتا ہے۔ کہنا یہ نہیں مانتے، پابندی انھیں گوارا نہیں ہوتی۔ گھروں کے اندر بھی بال ہٹ کا تماشہ ہوا کرتا ہے۔ بھولے بھالے معصوم بھی خوب ستاتے ہیں۔ پاس بلاؤ تو بھاگیں۔ خاموش رہنے کو کہا جائے تو شور مچائیں۔ لیکن بچوں کا یہ منفی رجحان اپنا وجود تسلیم کرانے کے لئے ہوا کرتا ہے۔ اولاً انھیں بات بنانی نہیں آتی اور وہ حُسنِ تدبیر سے اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ لہٰذا جب اقرار نہیں کرنا چاہتے تو انکار ہی کرتے ہیں جب اتفاق نہیں کر سکتے تو اختلاف ہی کرتے بنتی ہے بیچ کی راہ ان کے بس میں نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کی نیت بالکل صاف ہوتی ہے۔ ان کے دل میں کوئی چور نہیں ہوا کرتا اس لئے وہ بے دھڑک کہتے ہیں، لگی لپٹی کچھ نہیں رکھتے۔ تاہم بچوں کا یہ رویہ ان کی بے اطمینانی اور بددلی کا نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ استاد اور سرپرست اپنی توجہ سے اُن کے سوچنے کا غلط انداز بلاشبہ درست کر سکتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اختلافی معاملات سے حتی الامکان بچوں کو بچایا جائے تاکہ انھیں کسی قسم کے تصادم کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان کے ساتھ معمولی معمولی باتوں کو مسئلہ نہ بنایا جائے۔ ان کی معقول بات کو سراہا جائے اور مناسب عمل کی تعریف کی جائے ساتھ

ہی ساتھ اپنے عمل پر بھی نگاہ رکھی جائے۔ کبھی کبھی ہماری ترچھی نظر، بچوں کو ترچھا بنا دیتی ہے۔ بڑوں کے اپنے نقطۂ نگاہ سے بچوں کی زندگی بہت کچھ متاثر ہوتی ہے۔ جب ایک بچہ اپنا کام نہیں کرتا یا بات نہیں سنتا تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کس حد تک وہ بات اور کام بچے کی زندگی اور اس کی صلاحیت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بچپن کی طرح لڑکپن میں بھی ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی خواہش زور مارتی رہتی ہے۔ پابندی یہاں بھی کھلتی ہے۔ بزرگوں کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر گستاخانہ رویہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت بھی بے روک ہوتی ہے اور مصلحت بینی کا پاس یہ بھی نہیں کر پاتے لیکن یہ ترچھی نظر والی بات پھر بھی نہیں ہے۔ یہ تو نوجوان دل کی امنگ اور آزادی کی تڑپ ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک آدابِ مجلس کو پورے طور پر برت نہیں پاتے ہیں۔ اس لئے ان کے برتاؤ میں منفی رجحان کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ نگران کی نظر بھی اس وقت سے ترچھی ہونے لگتی ہے جبکہ سرپرست سخت گیری پر اتر آتے ہیں اور ان کے طرزِ عمل میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ کالج کے طالب علم کا احتجاجی انداز اور تخریبی نظریہ یقیناً اس کے غیر آسودہ ذہن کی غمازی کیا کرتے ہیں اور جس بے باکی سے وہ اقدار کی ناقدری کرتا ہے، اس کے اندر اس کی اپنی بے قدری کا احساس ضرور کارفرما ہوتا ہے۔

اگر یہ ترچھی نظر نوجوانی کے جاتے جاتے سیدھی نہیں ہو جاتی تو اسے زندگی کے کچے پن کی علامت سمجھنا چاہیے۔ سماجی زندگی کے تقاضوں سے آنکھیں چار نہ کرنے والے ہمیشہ اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں اور انھیں ہر وقت اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ ترچھی نظر بھی منفی نظریۂ حیات کا ایک حربہ ہے۔ نکتہ چینی اور عیب بینی پر محض اس لئے کمر باندھ لی جاتی ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا غم نہ ستائے۔ انھیں اپنے اختلاف ہی میں شانِ امتیاز نظر آتی ہے۔ انھیں کاروانِ حیات کے رہروانِ تیز گام کے ساتھ چلتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور اپنے گم ہو جانے کا خطرہ اس حد تک لاحق ہو جاتا ہے کہ چیخ چیخ کر نشانِ منزل اور سمتِ کارواں ہی غلط بتانے لگتے ہیں۔ یہ بددماغ بات چیت میں بھی اپنے آپ کو بڑا ذہین اور طباع ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں بلکہ اپنی خام خیالی میں خود کو

استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی بوکھلاہٹ، شدت جذبات اور بے جا توجہ سے دوسروں پر اثر ہی الٹا پڑتا ہے۔ جتنا یہ تنتے ہیں اسی قدر اصلی خدوخال ابھرتے ہیں۔ ایسی صورت میں عزت گرتی ہے، وقار کم ہوتا ہے۔ اس رسوائی پر دل کچھ اور کڑھتا ہے اور خود غرضی کی بدولت ترچھی نظر کیا دتر بھی ہوجاتی ہے۔ یہی وہ خوش فہم لوگ ہیں جو بدقسمتی خود ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر زندگی کی بازی جیتنا چاہتے ہیں عالات کی سختی اور واقعات کی تلخی انھیں حقائق سے آنکھیں چرانے پر آمادہ کردیتی ہے تاہم طبیعت، خودنمائی کے لئے مجبور کرتی رہتی ہے لیکن خود کچھ کرتے نہیں، محض پینترے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اپنے اوپر اعتبار و اعتماد نہ ہونے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں اور خود کو ہمیشہ غیر محفوظ خیال کیا کرتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس ترچھی نظر کی اوٹ میں ان کی دادِ طلب نگاہیں پہچان میں آسکتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو زمانے کے ظلم و ستم کا شکار سمجھتے ہیں۔ یہ تو در حقیقت حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ان پر کوئی ترس نہیں کھاتا اور نہ وہ شکایت کے نہیں، عنایت کے مستحق ہیں۔ لیکن ان کے کچھن مار کھانے کے ہی ہوتے ہیں، اس لئے زمانہ عموماً معاف نہیں کرتا۔ یہ اپنی گمراہی اور غفلت کے سبب دنیا کو بہکاتے ہیں لیکن درامل خود بہک کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں نرمی کے ساتھ دھیرے دھیرے راہ پر لگانے کی ضرورت ہے۔ جب وہ یہ سمجھ لیں گے کہ دل کا چین اپنے آپ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے بے چین رہنا پڑتا ہے۔ شہرت، رحمت چاہتی ہے اسے پکڑیے تو بھاگتی ہے۔ اس کے خیال میں رہیے تو خوار ہوجائیے۔ لیکن جوہر دکھائیے تو اس کی چمک دمک کے ساتھ تعلق پیدا کرلیتی ہے۔ پھر اس سے بچئے تب بھی پیچھا نہیں چھوڑتی کبھی نہ کبھی ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نام کے لئے کام چاہیئے۔ زندگی کے باغ میں خون پسینہ ایک کرنے سے بہار آتی ہے۔ لگن کا سچا اور دھن کا پکا ہی پھل پاتا ہے۔

"نئی کویتا"

جناب مجیب رضوی

نئی کویتا سے زمانۂ حال کی شاعری مراد لینا درست نہیں ہے کیونکہ ایک خاص قسم کی ادبی تحریک کو اس نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ یہاں "نئی" کا مطلب جدید نہیں ہے بلکہ اس لفظ کا مطلب انوکھی یا عجیب زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ اس کا خمیر ٹی ایس ایلیٹ، ہربرٹ ریڈ، ازرا پاؤنڈ، ہنری لارنس، جیمس جوائز اور سارتر کے جدت پسند خیالات اور ادبی تجربات سے بنا ہے۔ یہ تحریک ادب کے ہر پہلو میں نیا پن چاہتی ہے۔ اسے نئے طرز بیان کی تلاش ہے۔ اسے نئے خیالات، نئے جذبات و احساسات، اور نئے تصورات کی جستجو ہے۔ اس "نئے پن" کو ہندی شاعری میں سمونے کے لئے یہ تحریک ایک نئی زبان، نئی ترکیب، نئی علامت، نئی تشبیہہ، نئے استعارے اور نئی ہیئت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کو ابھی تک اس میدان میں کسی خاص کامیابی کا دعویٰ نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اپنی کوشش میں مستقل مزاج ہیں۔ اسی حد سے تجاوز کرنے والی جدت پسندی کی بدولت یہ "نئی" ہے۔ لیکن چونکہ ہندی زبان و ادب کا مزاج اور ہندی عوام کا ادبی مذاق اس نئے پن کے لئے سازگار نہیں ہے اس لئے اس تحریک نے اس ادب کو جنم دیا ہے جو انوکھا بھی ہے اور عجیب بھی۔

جس طرح اردو میں لفظ "ادب" کے ساتھ بے ادبی کی گئی ہے، اسی طرح ہندی میں لفظ "واد" کی مٹی پلید ہوئی ہے۔ اردو میں اگر کلاسکی ادب، ترقی پسند ادب، تنزل پسند ادب، تعمیری ادب، انسانیت پسند ادب وغیرہ کی گرم بازاری ہے تو ہندی میں چھایا واد، پرگتی واد، مانوتا واد، پھر تیک واد، پریوگ واد کا ایک کناٹ پلیس سجا نظر آتا ہے، انھیں ادیبوں اور واعظوں سے چڑھ کر

"منجیرز" کی تمہید میں نرالا مرحوم نے لکھا تھا:-

"ایک سے ایک بڑھ کر کرکش (سخت)، شبد (لفظ)، بھاو کا پتہ نہیں .... جو قلم کی نوک سے نکل گیا وہی بھاؤ۔ کلا؟ جس طرح بھی کہئے کلا ہے۔ دوسری طرف سے پرگتی شیل، (ترقی پسند) آگئے گاندھی وادی جہاں ناک سکوڑ کر دیا، پریم، کرونا کا پاٹھ پڑھا رہے تھے، وہیں سماج وادی بنا ہچک کے ٹاٹ الٹنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ہندی ساہتیہ میں اور اس طرح کا بیہ ساہتیہ میں بھی اکال تانڈو شروع ہو گیا"

ادیوں اور وادوں کے اس سیلاب کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں نئی کویتا کا جنم ہوا ہے۔ اس پس منظر کو جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ خود کو ایلیٹ، ساتر اور ازرا پاؤنڈ کی ہندی کاربن کاپی تسلیم کرنے میں یہ تحریک شرم محسوس کرتی ہے اور اس کے حامی رسائل "لہر"، "نئی کویتا"، "نکش"، "کسوٹی" وغیرہ کوشاں ہیں کہ ہندوستانی سرزمین، اس کے سیاسی، اقتصادی، سماجی، تہذیبی ادبی اور لسانی تقاضوں سے اس تحریک کی ہم آہنگی ثابت ہو جائے تاکہ ہندی ادب کے گاؤں میں یہ یورپی اونٹ اجنبی نہ رہ جائے اسی لئے اس تحریک کے حامیوں میں شعرا اور تخلیقی ادیبوں سے دوگنی تگنی تعداد نقادوں کی ہے۔ "نئی کویتا" کی تحریک اس نام سے ۱۹۵۳ء میں دوسرے تار سپتک کی اشاعت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ لیکن وادوں کا یہ طوفان ۱۹۳۶ء سے ہندی ادب پر منڈلاتا دکھائی پڑتا ہے، یہ وہ دور ہے جب چھایا واد انحطاط پذیر ہو چکا تھا اور کچھ نقادوں کی رائے میں "کل چھایا وادیوں کے مکان" وادوں کے طوفان میں اڑ گئے تھے۔ اس لئے اسی انیس بیس سال کی شاعری کا سرسری تجزیہ اس چھوٹے سے مضمون میں مناسب ہوگا:

چھایا واد کے بعد خاص طور پر چار رجحانات ہندی شاعری میں دکھائی پڑتے ہیں پہلے زمرے میں وہ ادب پارے آتے ہیں جن میں ملکی اور غیر ملکی سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی تبدیلیوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ حقیقت نگاری کی طرف مائل ہیں، ان میں طبقاتی شعور کا دھندلا سا

نقش پایا جاتا ہے۔ ان کا رجحان خارجیت پسندی کی طرف ہے، حالانکہ چھایا وادی رومانیت سے یہ بالکل پاک نہیں ہے۔ یہی وہ ادیب ہیں جنھوں نے ۱۹۳۶ء میں متحد ہو کر ہندی میں ترقی پسند ادب کی داغ بیل ڈالی۔ دوسرے زمرے میں وہ تخلیقی ادب آتا ہے جس میں ذاتی حسرت و یاس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی الجھن کو جگہ دی گئی ہے۔ ان میں بے اطمینانی ہے، ناامیدی ہے، مکوک ہیں۔ اس ادب میں داخلیت کو زیادہ دخل ہے، خارجیت سے یہ بچنا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی بچ نہیں پاتے۔ یہی ادیب ۱۹۴۲ء میں خود کو "پریوگ واد" کے پرچم کے نیچے متحد کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے ہندی ادب کی تاریخ انھیں دو گروہوں کے ذہنی مہابھارت کی داستان ہے جسے پڑھ کر نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کورو کون ہے اور پانڈو کون ہے، حق کی طرف کون ہے اور باطل کی طرف کون ہے۔

تیسرے قسم کے ادب پارے وہ ہیں جو زندگی کی الجھنوں سے دور ہیں لیکن ان میں زندگی کا موہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ زندگی کی رنگینی کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں لیکن اس کے لئے کسی طرح کی جدوجہد سے گھبراتے ہیں۔ اپنے کلام میں رنگینی بھرنے کے موہ میں یہ اس قدر منہمک دکھائی پڑتے ہیں کہ کوئی بھی تفصیل چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس طرح یہ فوٹوگرافک حقیقت نگار بن جاتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کو اوپر کے دونوں گروہ فراریت پسند کہہ کر چڑھاتے ہیں۔ چوتھے زمرے میں وہ ادیب آتے ہیں جو ہلکی پھلکی چیزیں لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا۔ یہ صرف عوام کی واہ واہ لوٹنا چاہتے تھے۔ ان کے کلام میں مقامی رنگ دکھائی پڑتا ہے، بول چال کی زبان اور بولیوں کی ترکیبوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کے شاہکار وہ ہیں جن میں نوجوانوں کے گھٹے جذبات کو تسکین ملتی ہے اور نیچر میں رومانی رنگینیت بھرنے کی کوشش دکھائی پڑتی ہے۔ یہ لوگ زیادہ ترگیت لکھنے کی طرف مائل تھے۔

تیسرے اور چوتھے زمرے کے ادیب کبھی ترقی پسندوں کے خیمے میں دکھائی پڑتے ہیں اور

کبھی پریوگ وادیوں کے۔ ان میں سے کچھ ایک ہی وقت میں دونوں طرف دکھائی پڑتے ہیں۔

۱۹۴۳ء میں پہلے تار سپتک کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس ایک کتاب میں سات شعرا کا کلام اگیے جی نے جمع کیا تھا۔ اس میں تین رجحانات صاف دکھائی پڑتے ہیں۔ پہلا رجحان سماجی حقیقت نگاری کا ہے۔ سات میں سے پانچ ادیب —— رام بلاس شرما، پربھاکر ماچوے، بھارت بھوشن اگروال، گجانن مکتی بودھ اور نیمی چند جین اسی کے علمبردار ہیں۔ داخلیت کی علمبردار اگیے ہیں اور گرجا کمار ماتھر زندگی میں رنگینی بھرنے کی کوشش کرتے ہوئے تیسرے رجحان کے علمبردار دکھائی پڑتے ہیں۔ چوتھے زمرے کے ادیبوں کی تمام تر خصوصیات کو ان سب نے اپنا لیا ہے۔ اسی لئے شاید اس کا کوئی نمائندہ تار سپتک میں نظر نہیں پڑتا۔ ان شعرا نے شاعری کے نئے موضوع تلاش کئے، ساتھ ہی ساتھ نئے نئے مشبہ بہ ڈھونڈ نکالے، یہ مشبہ بہ زندہ جاوید زندگی سے لئے گئے اور نیچر سے ادھار لی ہوئی پرانی علامتوں اور پرانے مشبہ بہ کو ان لوگوں نے ٹھکرا دیا۔ موجودہ زمانے کی حقیقی تصویر اتارنے کی کوشش کی گئی۔ بول چال کے محاورے، بولیوں کے ہلکے پھلکے لفظ، اردو انگریزی کے رائج الوقت الفاظ کو ہندی شاعری میں جگہ دی گئی اور کوشش کی گئی کہ ہندی کویتا کامینڈک نہ رہ کر بہتے نیر کا روپ لے لے۔ ان لوگوں نے آزاد شاعری بھی کی اور معرا شاعری بھی، رباعی اور غزل لکھنے کی کوشش کی، لوک گیتوں کی بحروں پر تجربے کئے، ہیئت کے میدان میں سانیٹ، بیلے، مونولاگ وغیرہ لکھنے کی کوشش بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔

پہلے تار سپتک کی بہورنگی میں یک رنگی جھلکتی ہے۔ مختلف خیالات اور رجحانات کے حامل ہوتے ہوئے بھی یہ سب مجموعی طور پر ہندی شاعری کو مالا مال کرنے اور روایات کے بندھن سے آزاد کرنے کی دھن میں لگے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن پہلے سپتک کی اشاعت کے بعد ہی یہ اتحاد عمل ختم ہو جاتا ہے اور کشور ادب کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ نئی ادبی کاوشوں کی مرکزیت ختم ہو جاتی ہے اور ہر طرف چھوٹی چھوٹی جاگیریں اور طرح طرح کے "واد" یعنی دکانیں نظر پڑتی ہیں۔ ان میں دو اہم ہیں۔ ایک پرگتی واد (ترقی پسند) کا بورڈ لٹکائے ہے اور دوسری پریوگ واد

(تجرباتی) کا بورڈ آویزاں ہے۔ لیکن شخصیتوں کے علاوہ دونوں میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ صرف فرق اتنا ہے کہ پریوگ وادیوں نے صرف تجربات پر ہی دھیان دیا ہے اور مواد سخن کو بالکل غیر ضروری قرار دے دیا ہے جبکہ پرگتی وادی مواد سخن پر بھی زور دیتے ہیں۔

چونکہ کسی فلسفہ اور کسی نظریہ کے بغیر پریوگ واد بحیثیت تحریک کے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے ۱۹۵۳ء میں اگیئے جی نے پریوگ واد کا بورڈ اتار کر اس دکان پر "نئی کویتا" کا بورڈ لٹکا دیا۔ نئی کویتا اصل میں اسی جدت پسندی کا ایک اڈیشن ہے جس میں ضرورت کے تحت "صحت مند انسان کی تلاش" کا باب بڑھا دیا گیا ہے۔ اسی صحت مند انسان اور سنک کا ٹھپہ لگا کر اگیئے جی نے دوسرے تار سپتک کی تالیف کی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی کوششوں میں ایک نظریاتی پہلو پیدا کرنے کی جرأت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ پرانی روایات اور قدروں سے ہم بیزار ہیں۔ ایک ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں یقین کی منزل گم ہو چکی ہے، ہر چیز کی حقیقت اور ہر ضمنی حقیقت کا وجود مشکوک ہے۔ زندگی کے کسی پہلو میں بھی ٹھہراؤ نہیں ہے، جامعیت نہیں ہے، ایک بحرانی دور ہے۔ اس بحران میں فرد بحیثیت انسان کھو گیا ہے۔ اس شخص کو پہچاننا اور اُسے خود کی اصلیت سے روشناس کرانا، اس میں جذبۂ انسانیت پیدا کرنا ہی "نئی کویتا" کا نصب العین ہے۔ چونکہ ترقی پسندوں نے کمیونزم کے میکانکی آدرش کے نیچے فرد کو دبا کر پامال کر ڈالا ہے اس لئے فرد کو اوپر اٹھانے، اس میں خودی پیدا کرنے، اس کی انا کو جگانے کی ضرورت کے تحت ہی نئی کویتا کا جنم ہوا۔

'نئی کویتا' کے حامی سماجی گندگیوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی گندگی سے بھی انسان کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی حقیقت نگاری کے خبط میں ہوسناکی کے مناظر پیش کرنا ہی ان کا لائحہ عمل بن گیا ہے۔

اس فلسفیانہ موشگافی کے باوجود اپنی اصل شکل میں نئی کویتا "پریوگ وادی" ہے۔ اس میں ایسی ہی نئی تشبیہوں، علامتوں، ترکیبوں، استعاروں اور امیج (IMAGE) کی تلاش ہے۔

اس میں وہی پرانی یاسیت، زندگی سے دور بھاگنے کی کوشش، جذبات کی گھٹن، خواہشات کا طوفان، درد دکھ بے یقینی، شخصیت پرستی، خیال اور بیان کی گنجلک موجود ہے۔ اس شاعری میں طنز ہے۔ اس طنز میں مزاح نہیں ہے بلکہ جھلاہٹ ہے اور یہ تلوار کی دھار بن کر پرانی قدروں پر وار کرتا ہے۔ اصل میں طنز طنز نہ رہ کر ان شاعروں کے لئے زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا چشمہ بن گیا ہے۔ اپنی جھنجلاہٹ میں یہ مجذوب کی طرح بڑبڑاتے ہیں چونکہ یہ حقیقت نگار بھی بنتے ہیں اس لئے مجذوب کی بڑ کو جوں کا توں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی بڑ میں گالیاں بھی ہوں گی، بھونڈے اور غیر شاعرانہ الفاظ بھی ہوں گے، خیالات میں بھی بھونڈا پن ہوگا، جذبات بھی اکثر حسن سے عاری ہوں گے۔ ان اوصاف سے نئی کویتا بھری پڑی ہے۔ اسی لئے ان شعراء کے کلام میں شاعری کی زبان، اشاریت اور نزاکت ناپید ہے۔ نئی نئی علامتوں، دور از کار تصورات اور امیج کا استعمال ہی ان شعراء کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں ان کا سرسری جائزہ لینے کی کوشش ہی کی جا سکتی ہے۔

نئی کویتا کی زبان

مجذوب کی بڑ بول چال کی زبان ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس لئے بول چال کی بھاشا پر نئی کویتا کا بے حد زور رہا ہے۔ دوسرے سپتک میں بھوانی پرشاد مشر نے اس پر کافی زور دیا ہے:

جس طرح ہم بولتے ہیں اس طرح تو لکھ
اور اس کے بعد بھی ہم سب سے بڑا تو دکھ

دوسرے تار سپتک میں دو ایک پرانے پر لوگ دادی ہیں اور زیادہ تر نئی نسل کے شاعر ہیں۔ اس میں زبان کا ارتقا صاف دکھائی پڑتا ہے۔ یہ شاعر شاعری کی زبان کو زیادہ سے زیادہ بول چال کی زبان کے نزدیک لانے میں کوشاں ہیں ان کی زبان سیدھی سادی ہے اور روزمرہ استعمال میں آنے والی چیزوں سے علامتیں، تشبیہیں، استعارے اور

[illegible]

جی ہاں حضور میں گیت بیچتا ہوں،
میں طرح طرح کے
قسم قسم کے
گیت بیچتا ہوں
جو بہت ڈھیر لگ گیا ہٹاتا ہوں
گاہک کی مرضی... اچھا، جاتا ہوں
میں بالکل انتم اور دکھاتا ہوں
یا بھیتر جا کر پوچھ آئے آپ،

بھوانی مشر

موٹے اوٹھوں میں چرُوٹ جل رہا
آسمان کی چھاتی میں انجن کا سارا شور بھر رہا
جانے کس راکشس کی آنکھوں جیسی لال ہری لائیٹس چمک رہیں
سگنل کھمبوں کی

نریش مہتا

ہر گھر میں صرف چراغ نہیں، چولھے سلگے
لیکن پھر بھی
رہ رہ کر دھندھواتا ہے
چھپر سے چھنتا ہوا دھواں
ہر اور

....

دفتر کے تھکے ہوئے کلرکوں کی ڈانٹ ڈپٹ

بچوں کی چیخ پکاریں
پتنی کی بھن بھن   دھرم ویر بھارتی

نئی کویتا کا شاعر اصل میں کسی چیز پر یقین نہیں رکھتا۔ خود اعتمادی کھو چکا ہے اگیہ جی کا کہنا ہے کہ یہ زمانہ ہی عدم یقین کا ہے اور اگر شاعر حقیقت پسند ہے تو اُس کو متلون مزاج بھی ہونا پڑے گا۔ اسی کی ایک اچھی مثال دھرم ویر بھارتی کے کلام سے ملاحظہ کیجیے۔

ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو ہم آتے ہیں
ہم نئی چیتنا کے بڑھتے اَدِرام چرن
ہم مٹی کی آپرا جت گتی مے سنتانیں
ہم ابھی شاپوں سے مکت کریں گے کوی کامن

لیکن شاعر کو ذہنی آزادی دلانے والے یہی مہارتھی اسی نظم میں لکھتے ہیں :

ہم سب کے دامن پر داغ
ہم سب کی آتما میں جھوٹ
ہم سب کے ماتھے پر شرم
ہم سب کے ہاتھوں ٹوٹی تلواروں کی مُوٹھ
دو ہم کو پھر چھوٹے یدھ
دو ہم کو پھر چھوٹے دھیئے
ہاریں گے پھر یہ ہے طے

نئی کویتا کے شاعر نے لوک گیتوں کی دھنوں، لفظوں اور محاوروں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ بنشی دھر، نریش کمار مہتا، ڈاکٹر دو ند بھر مُر، رام ناتھ مشرا اور مہندر بھٹنا گر نے اس سلسلے میں کافی کامیابی حاصل کی ہے، اس کی بہترین مثال یہ گیت ہے :

بمھ چھپا ڈولے

جھینگر دبولے
بن بن جھنکے رے
بن بن جھنکے رے
نجریا پھولن گمکے رے
پون جھکورے
برچھن جھورے
مُومَن ہرسے رے
نگریا کنچن برسے رے

وَنشی دھر نے بھی لوک گیت کو اپنایا ہے۔

نین کھلے
بھور بھئی
نیندیا نے گیل گہی
بگیا میں ہنسن لگی
کلی نئی
بھور بھئی

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئی کویتا کے شاعر چھایا وادی زبان اور تراکیب سے آزاد ہو چکے ہیں اور سنسکرت کے موٹے موٹے لفظوں سے انھیں چھٹکارا مل گیا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے صرف کوشش کی ہے۔ یہ کوشش قابل ستائش ہے کیونکہ ایسی ہی کوششیں ہندی کو وہ شکل دے سکتی ہیں جس سے وہ قومی زبان کے درجے پر فائز ہو سکے۔

نئی کویتا والوں کا کہنا ہے کہ ہم کہتے کم ہیں اور اشارے کرنے میں سمجھاتے زیادہ ہیں۔ ان کی زبان صرف لفظی اور علامتوں کے ذریعہ بولتی ہے۔ ان شعروں میں [illegible]

سے نئی کویتا کو آزاد کرانا چاہا ہے۔ انھیں نئے پن کی تلاش ہے اس تلاش جنوں میں انھوں نے خود کو مضحکہ خیز بھی بنا لیا ہے۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ ان کا کہنا ہے کہ کچھ دنوں میں ہماری یہی نئی علامتیں اور امیج نکھر کر خوبصورت خیالات، تصورات اور نازک جذبات کے اظہار کا وسیلہ بن جائیں گی۔ پرانی تشبیہوں علامتوں اور امیج کے خلاف اجت کمار کا یہ محاکمہ قابل غور ہے:

چاندنی چندن سدرش ہم کیوں لکھیں۔
مکھ ہمیں کملوں سریکھے کیوں دکھیں
ہم لکھیں گے چاندنی اس روپئے سی ہے کہ جس میں
چمک ہے پر کھنک غائب ہے
ہم کہیں گے زور سے مکھ گھر عجائب ہے
(یہاں پر دیہہ کے انمول زندہ اور مردہ بھاؤ رہتے ہیں)

علامتیں

علامتوں کو نئی کویتا نے اپنے گنجلک خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ لیکن علامتوں کی تلاش میں ہندی شاعری کی موسیقیت، اس کے مزاج و روایت، اس کے مذاق سلیم کی طرف سے آنکھ بند کر کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان شعراء کو کلام کے نسخے کے ساتھ ترکیب استعمال کی پوری تفصیل بھی مہیا کرنی پڑتی ہے۔ چند علامتیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ رتھ کا ٹوٹا پہیا:- زندگی کا رتھ دو پہیوں سے چلتا ہے — عقل اور دل سے لیکن اگر دل پر مادیت چھا جائے تو انسانی جذبات اور احساسات عقل کے بوجھ کے نیچے دب جائیں گے۔ اس طرح زندگی کا ایک پہیہ ٹوٹ جائے گا۔ اس لئے رتھ کا ٹوٹا پہیا اس انسان کی علامت ہے جو انسانی جذبات اور احساسات سے عاری ہو۔

۲۔ ندی:- چونکہ ندی ہمیشہ بہتی رہتی ہے اور سماج بھی ہمیشہ سے بہہ اور ہمیشہ بہے گا

اس تعلق سے ندی سماج کی علامت کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔

۳۔ ندی کا دیپ :۔ طوفانی ندی میں جیسے ریت کا کوئی ٹاپو ڈوبنے والوں کے لئے سہارا ہوتا ہے اسی طرح زندگی کے لئے شاعر اور فنکار سہارا ہیں۔ اس لئے وہ ندی کا دیپ ہیں۔

۴۔ کھنڈر :۔ پرانی روایتوں اور قدروں کی علامت ہے۔

۵ کمزور ہڈیاں :۔ بھوکا اور دکھی انسان

۶۔ تمسر (اندھیرا) : پرانی روایتوں کی علامت

۷۔ نشا (رات) : روایت پرستی کی زندگی۔

۸۔ آلوک ریکھا، اوشا :۔ نئے احساسات کی علامت۔

۹۔ بھگیرت : فنکار

۱۰۔ دھار :۔ زندگی

۱۱۔ پوکھر :۔ زندگی میں جمود

۱۲۔ لُو۔ بونڈر آندھیاں :۔ بحرانی دور میں نئی اور پرانی قدروں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے خیالات واحساسات۔

۱۳۔ شیام گھن :۔ جواہر لال نہرو۔

۱۴۔ سنہرے کشتی :۔ خوب صورت تصورات

یہ وہ جانے پہچانے الفاظ ہیں جن کے خاص معنی اور مطالب سینکڑوں برسوں سے ہمارے دماغ میں موجود تھے مگر انہیں الفاظ میں نئے معنی پر دنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک پڑھنے والا ان نئے معنی و مطالب سے مانوس نہ ہو جائے وہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

امیج

تیسرے تار سپتک میں سروشیور سکسینہ کی نظم میں شام کی نئی امیج دیکھئے:۔

سلما ستاروں کے کام والی
نیلی مخمل کا خول چڑھا
امبر کا سندورا
الٹی دھرتی پرندیوں کے جل میں
گرزنزو کے شکھروں سے
ڈھرڈھر کر
سب سیندور پھیل گیا۔

دوسرے شاعر کی شام کی امیج سے بھی محظوظ ہو لیجئے:۔

ایک شوئیٹ بھالو، ہو۔ پنجوں پر اپنے کھڑا
برف پر کھڑا ہو
جاڑے سے بھی بڑا ہو
اتنے میں جلدی سے کوئی شیش کاٹ دے
لہو تب اچھلا ہو
اوپر سے نیچے تک بھالو لال ہو،
دھرتی بھی لال ہو، امبر بھی لال ہو۔

بے چارے سورج دیوتا کی قدر و منزلت بھی ملاحظہ کر لیجئے:۔

روز صبح پورب سے آتا ہے،
میرے لئے گرم چائے کیتلی میں لاتا ہے
مجھ کو پلاتا ہے
روز شام پچھم کو جاتا ہے
وہ تو ایک بیرا ہے۔

شری کانت ورما نے ایک جگہ لکھا ہے :۔

" آنکھوں میں کالے پرشن بھرے بیٹھی گم سم "

یہ گم سم بیٹھنے والی ہماری موجودہ تہذیب ہے۔ لیکن "کالے پرشن" کا مطلب سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ "کالے پرشن" کا مطلب ہے فلسفہ حیات اور نظریات کی بنیاد پر زندگی کے مسائل کے بے سود اور واہیات حل۔

نئی کویتا کا شاعر حسن کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ حسن استعجاب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، انسان استعجاب کے پیچھے سرگرداں ہے، جہاں استعجاب ہے وہیں انسان کے لئے حسن ہے کشش ہے۔ حسن پرست، شعراء اور سخن فہموں پر طنز کرتے ہوئے سر دلیشور ورما نے حسن کی حقیقت سے روشناس کرایا ہے :۔

" اپنے اس کنیٹا پارٹی بیٹے کے
پیروں میں شہتیر باندھ کر
چوراہے پر کھڑا کردو۔
پھر چپ چاپ ڈھول بجاتے جاؤ۔
شاید پیٹ پل جائے
دنیا وستا نہیں کوتوہل خریدتی ہے۔

غرضیکہ نئی کویتا ہندی ادب کے گاؤں میں وہ اونٹ ہے جسے صرف لال بجھکڑ ہی بوجھ سکتے ہیں۔ اس کی طرز فکر، اظہار، حسن بیان، تراکیب، تشبیہات، استعارات، علامتیں سب ہی غیر مانوس ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جن حالات اور ذہنی اور مادی تبدیلیوں کو اس شاعری میں جگہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ سب ہماری عوامی زندگی سے ہی نہیں بلکہ ابھی تک خواص کی زندگی سے بھی کوسوں دور ہیں۔ اسی لئے نئی کویتا والوں کی تمام تر کوششیں بیل گاڑی سے ایک شہر کر چلانے کا عزم ہی ثابت ہوئی ہیں۔

مختلف مذہبوں کی پارلیمنٹ

جناب دھرم سردیپ

امریکی بہنو اور بھائیو![1]

جس گرم جوشی اور محبت سے آپ نے ہم سب کا استقبال کیا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے جو انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں دنیا کے قدیم ترین سنیاسیوں کی جماعت کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اس دیش کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جہاں مذہب کا جنم ہوا۔ اور میں وہاں کے کروڑوں ہندوؤں کی طرف سے بھی آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ان مقررین کا بھی ممنون ہوں، جنھوں نے مجھ سے پہلے اپنی تقریروں میں ہم مشرقی نمائندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب اس کانفرنس سے اپنے دور دراز ملکوں میں صلح و آشتی اور رواداری کا پیغام لے کر جائیں گے۔ اس سلسلہ میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کر رہا ہوں، جس نے نہ صرف تمام دنیا کو صلح و آشتی کا سبق دیا ہے، بلکہ ہمیشہ دنیا کے سب مذاہب کو اصولاً اور عملاً اپنایا ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں اس قوم کا فرد ہوں جس نے ہر مذہب و ملت کے ستم زدوں کو اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ میں فخر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب روم کے مطلق العنان حکمرانوں نے اسرائیل قوم کی متبرک عبادت گاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جب اس قدیم قوم کی تہذیب کے علمبردار روم کے مظالم سے تنگ آکر ہندوستان

---

[1] شکاگو میں خطبۂ استقبالیہ کا جواب بتاریخ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء

آئے تو ہم نے انھیں گلے لگا کر اپنے یہاں جگہ دی۔ یہ ہمارا ہی مذہب اور ہماری ہی قوم تھی جس نے زرتشت کے خود دار پیروؤں کو اس طرح اپنایا کہ وہ آج تک اپنے مذہب اور اپنی روایات پر چلتے ہوئے ہماری قوم کا ایک شاندار جزو بن گئے ہیں۔ دوسروں کو اپنانا تو ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے بھائیو! میں آپ کے سامنے ایک پراتھنا کا مختصر سا حصہ پیش کرتا ہوں جسے میں بچپن سال سے دہراتا آیا ہوں اور جسے میری طرح میرے کروڑوں ہم مذہب ہر روز دہراتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میرا مذہب کیا ہے۔

"میرے خدا جس طرح مختلف ندیاں اپنے اپنے منبع سے نکل کر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی آخر کار سمندروں میں آکر گھل مل جاتی ہیں، اسی طرح وہ تمام راستے جو مختلف مذہبوں اور قوموں کے لوگ اپنی اپنی پسند یا روایت کے مطابق اختیار کر لیتے ہیں۔ سب آخر تجھ ہی تک پہنچ جاتے ہیں، خواہ وہ دیکھنے میں کتنے ہی عجیب غریب اور الٹے سیدھے نظر آئیں۔"

ہماری یہ معتبر کانفرنس خود اس عالم گیر اصول کی تصدیق کرتی ہے، جس کا اعلان ہزاروں برس پہلے گیتا میں ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

"جو کوئی بھی میری شرن میں آتا ہے، میں یقیناً اس تک پہنچتا ہوں۔ تم جس صورت میں مجھے تلاش کرو گے میں اسی صورت میں تمھیں ملوں گا۔ سب انسان مختلف رستوں سے مجھ تک آنے میں کوشاں ہیں اور آخر کار پہنچیں گے، کیونکہ میں ہی سب رستوں کی منزل ہوں۔"

جماعت بندی، کینہ پروری، بغض و عناد، مذہبی تعصب نے دنیا پر صدیوں سے

لہ مان کعبہ و بت خانہ بہانہ فرقے نیست ... بہر طرف کہ نظر می کنی برابر اوست۔

تسلط جما رکھا ہے۔ ان کی بدولت بار بار فساد ہوئے، جنگ و جدال تک نوبت آئی، انسان کے خون سے زمین لال ہوئی، کئی قومیں تباہ ہو گئیں اور ان کی تہذیب کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اگر ان شیطانی طاقتوں نے ہماری سوسائٹی پر غلبہ نہ پایا ہوتا تو ہماری تہذیب ارتقا کی کئی اور منزلیں طے کر چکی ہوتی، لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان شیطانی طاقتوں کے مٹنے کا وقت آگیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے، بلکہ یقین ہے کہ گھنٹیوں کی جس میٹھی سریلی آواز سے اس کانفرنس کا آغاز ہوا ہے وہی آواز ایک نعرہ بن کر تعصب اور کینہ پروری کی موت کا اعلان کرے گی، خواہ وہ تعصب تلوار کے زور پر قائم ہو یا قلم کے بل بوتے پر۔ اگر ہم سب یہ سمجھ لیں کہ ہم ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں تو سماجی اور سیاسی نظام میں تعصب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی، تمام تفرقے مٹ جاتے ہیں، بغض و عناد ختم ہو جاتا ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

ابھی ابھی[1] آپ نے جو بلیغ اور شاندار تقریر سنی اس میں معزز مقرر نے ہم سے پرزور اپیل کرتے ہوئے کہا "آؤ ہم ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں۔ میں یہ کہوں گا کہ آؤ ہم سوچیں کہ ہمارے آپس کے تفرقات پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں۔ ان کی اصل کیا ہے؟ ان سب کا باعث ہماری لاعلمی اور جہالت ہے۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سناتا ہوں، جس سے میری بات واضح ہو جائے گی۔ ایک تھا کنویں کا مینڈک، وہ جنم سے وہیں رہتا آیا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ ایک اور مینڈک وہاں آنکلا۔ یہ مینڈک سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ کنویں کے مینڈک نے پوچھا "بھئی! کہاں سے آنا ہوا۔" اس نے جواب دیا میں سمندر سے آیا ہوں۔ کنویں کے مینڈک نے کنویں کے ایک سرے

---

[1] سوامی جی نے یہ چھوٹی سی تقریر ۱۵ ستمبر ۱۸۹۳ء کو کی، لیکن چونکہ اس کا موضوع وہی ہے جو ان کی پہلی تقریر کا تھا، اس لئے میں نے اسے پہلی تقریر سے ملا دیا ہے۔

سے دوسرے تک چھلانگ لگائی اور کہا۔ سمندر کیا میرے اس کنویں سے بڑا ہے؟ سمندر کا مینڈک مسکرا کر بولا۔ بھئی کہاں سمندر اور کہاں تمھارا یہ کنواں! ان دونوں میں مقابلہ ہو ہی کیا سکتا ہے۔ کنویں کے مینڈک نے ایک اور چھلانگ لگائی اور کہا اچھا تو کیا تمھارا سمندر اتنا بڑا ہے؟ سمندر کے مینڈک نے کہا۔ ارے بھائی! تم بھی کیا بے عقلی کی بات کرتے ہو۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ سمندر اور کنویں میں کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ کنویں کا مینڈک اکڑ کر بولا۔ تو تم جھوٹ کہتے ہو، چلو یہاں سے چلتے بنو، میرے اس کنویں سے اور کوئی چیز بڑی نہیں ہو سکتی۔

غور سے دیکھا جائے تو ہم سب کی یہی شکل ہے۔ ہم سب اپنے اپنے کنویں کی مینڈک ہیں۔ میں ہندو ہوں، میں اپنے کنویں میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہوں کہ تمام کائنات میری اسی چھوٹی سی دنیا میں بسی ہے، اسی طرح عیسائی اور مسلمان بھی اپنے اپنے کنویں پر ہی تمام عالم کا دارومدار سمجھنے لگتے ہیں۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ ہمارے تفرقات کی بنیاد لاعلمی اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے[لہ]

میرے امریکی بھائیو! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہم سب کو یک جا کر کے عالمی یک جہتی کی طرف ایک زبردست قدم اٹھایا ہے اور ان دیواروں کو جو ہمارے درمیان حائل ہیں، مٹانے کی ایک قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی اس کوشش کو کامیاب بنائے۔

(رام کرشنا مشن کی طرف سے ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے یہ مضمون اسی سے شکریہ کے ساتھ لیا گیا)

لہ جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

سونا —— ایک قدر بیجا

جناب عبدالرشید، ڈائرکٹر جامعہ ریسرچ سنٹر

سونا بھی موجودہ سماج میں انسان کی قدر و منزلت گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ خاں صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی میں ۲۰ تولے سونا دیا۔ شیروانی صاحب کی بہو تو سونے سے لدی ہوئی ہے۔ جب بڑی بوڑھیاں بیٹھتی ہیں اور کسی لڑکی کی شادی کا ذکر چھڑتا ہے تو پہلا سوال یہی اٹھتا ہے کہ فلاں کی بہو یا بیٹی کو کتنے زیور ملے۔ چاندی کے نہیں ۱۴ کیرٹ کے نہیں بلکہ اصلی سونے کے یا گنی گولڈ کے۔ ظاہر ہے یہ دینے والے کی حیثیت اور ہمت پر مبنی ہے۔ جس کے پاس زیادہ سونا ہے یا زیادہ سونا حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ سماج میں بہتر جگہ حاصل کرنے کا مستحق بھی ہوتا ہے۔ واقعی آدمی آدمی کی قدر نہیں کرتا بلکہ سونے کی قدر کرتا ہے۔

سونے کو یہ قدر اسی وقت سے ہے جب سے انسان نے اسے زمین کی گہرائیوں سے کھود کر نکالنا سیکھا۔ رفتہ رفتہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ سونے کی حیثیت بھی بڑھتی گئی۔ جاگیردارانہ دور میں اور بڑھ گئی لیکن صنعتی دور میں اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ صنعتی انقلاب سے سماجی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ صنعتی ممالک کے باشندوں کی زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔ عادتیں بدلیں۔ رہن سہن کے طور طریقے بدلے۔ انفرادی ضروریات کے اعتبار سے سونے کی مانگ میں کمی واقعہ ہوئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر میں سونے کی قدر رفتہ رفتہ کم ہو گئی، لیکن اسی کے ساتھ کرنسی اور صنعت کی اہمیت کے اعتبار سے اس کی مانگ میں اضافہ بھی ہوا۔

جاگیردارانہ دور سے ہم کو بہت سی قدریں ورثے میں ملی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسی بھی ہیں

جو بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ بلکہ ترقی کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں۔ سونے سے بیجا محبت اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ چونکہ ایک لمبے سفر کو کم سے کم مدت میں طے کرنا ہے اس لئے چھوٹی بڑی تمام رکاوٹوں کو بہر صورت دور کرنا ہے۔ چمن بندی کی راہ میں اگر ایک نایاب پودا بھی حارج ہوتا ہے تو اسے کاٹ کر الگ کر دینے کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے۔ بس اسی روشنی میں سونے سے متعلق حالیہ اقدامات کا جائزہ لینا چاہیئے۔

مقاصد

وزیر خزانہ نے حال ہی میں سونے پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے قاعدے قانون (GOLD CONTROL RULES) نافذ کئے ہیں۔ ان اقدامات سے حکومت کی سوجھ بوجھ ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت سونے کو یوں ہی بیکار نہیں پڑے رہنے دینا چاہتی، بلکہ تجوریوں اور بکسوں کی کال کوٹھری سے نکال کر باہر لانا چاہتی ہے اور اسے دفاعی کاموں پر خرچ کرنا چاہتی ہے اور اس سے بیرونی زر تبادلہ میں سہولت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان میں کتنا سونا ہوگا؟ اس کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔ پھر بھی خیال ہے کہ ملک میں چھ ارب روپے کا سونا ضرور ہوگا۔ اس میں سے تقریباً ۸۰ فیصدی زیورات کی شکل میں ہے۔ مختلف طریقوں سے جائزہ لینے کے بعد خیال ہے کہ کچھ نہیں تو دو یا تین سو کروڑ روپے کا سونا سلوں کی شکل میں ہوگا۔ اس میں خالص کردہ سونا بھی شامل ہے جو مندروں میں جمع ہے اور جو چور بازار میں خریدا جاتا ہے۔

فی الحال گولڈ کنٹرول کا مقصد محدود رکھا گیا ہے۔ ان قاعدوں کی رو سے نہ تو زیورات کا بیچنا ممنوع ہے اور نہ زیورات رکھنے پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ لیکن آئندہ جو زیورات بنیں گے وہ ۱۴ کیرٹ سے زائد خالص سونے کے نہیں ہوں گے۔ اس پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔ جن لوگوں کے پاس خالص سونے کے زیورات موجود تھے وہ

۹ فروری ۶۳ء تک فروخت کئے جا سکتے تھے۔

سونے پر اور سونے کی تجارت پر جب پابندی لگائی گئی تو اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ در اصل یہ کارروائی بہت پہلے ہونی چاہیئے تھی۔ اور جبکہ اس طرح کی کئی مثالیں بھی موجود تھیں۔ انگلستان میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوتے ہی حکومت نے ایک ایکٹ (DEFENCE OF THE REALM ACT) کے تحت سونے کے تمام اسٹاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے موقع پر بھی ایسا ہی کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ تمام بیرونی اثاثے پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

جو سونا چوری چھپے ملک میں آتا ہے اس کی روک تھام اور اس پر قابو حاصل کرنا اس قانون کا بنیادی مقصد ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہر سال قریب ۵۰ کروڑ روپے محض اسی غیر قانونی درآمد کی وجہ سے باہر چلے جاتے ہیں۔ حکومت کو یہ رقم (FOREIGN EXCHANGE) کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اقتصادی تعمیر کی یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ کم سے کم غیر ضروری سامان باہر سے درآمد کیا جائے تاکہ قومی سرمایہ بچے اور وہ ان ضروری چیزوں پر صرف ہو جو ہماری صنعتی ترقی کے لئے بے حد ضروری ہیں جیسے مشینیں وغیرہ۔ جو اس سے انحراف کرتا ہے۔ وہ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان قاعدوں کا ردعمل سماج پر مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔ اگر سختی سے قاعدوں کو عمل میں لایا گیا تو رفتہ رفتہ لوگوں کی نظروں میں سونے کی قدر کم ہو جائے گی اور اس کی مانگ میں بھی کچھ نہ کچھ کمی واقعہ ہو گی لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طویل مدت کی ضرورت ہے۔ کیوں؟ ہندوستان پر جاگیردارانہ نظام کا سایہ ابھی باقی ہے۔ اب بھی ملک کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ شادی بیاہ کے علاوہ اور موقعوں پر بھی سونے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً پیدائش۔ سال گرہ اور مذہبی تقریبیں وغیرہ۔ اچھا تو یہ تھا کہ ان رسموں میں سونے کا استعمال

ہی ترک کر دیا جاتا لیکن عملی طور پر فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ سونے کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ کمی برتی جائے۔ چنانچہ اب زیورات تو بنیں گے لیکن قانونی طور پر ان میں اصلی سونے کی مقدار بہت کم ہوگی۔ اس طرح سونے کے مجموعی استعمال میں کمی پیدا ہو جائے گی۔

دشواریاں

یہ تو ٹھیک ہے کہ ۱۴ کیرٹ سے زیادہ خالص سونا زیورات کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ لیکن اس پر عمل کیسے ہو؟ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ زیورات میں اصلی سونے کی مقدار کا پتہ کیسے لگایا جائے؟ ابھی تو وہی پتھر پر گھس کر پتہ لگانے کا طریقہ رائج ہے۔ جوہری نے زیور کو کسوٹی پر گھسا اور نشانات کی چمک سے اندازہ لگا لیا کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا۔ یہ طریقہ مقبول عام تو ہے لیکن کلیتًا ذاتی تجربے پر مبنی ہے۔ قاعدے قانون کو عمل میں لانے کے لئے شخصی پرکھ سے کام نہیں چل سکتا۔ ہاں اگر سونے کے بیوپاری خود ہی زیورات وغیرہ پر ایک مخصوص مہر لگانے کا طریقہ رائج کر دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ جیسا کہ انگلستان کے سناروں نے اپنی طرف سے سونے یا چاندی کی چیز پر مہر لگانے کا اصول رائج کیا تھا اس مہر کو ہال مارک (HALL MARK) کہتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کا طریقہ ہم کو بھی اختیار کرنا پڑے گا۔ یہی مسئلہ سونے کے سلوں یا ڈلوں کے ساتھ بھی پیدا ہوتا ہے۔ خریدتے وقت کیسے معلوم کیا جائے کہ سونا ۱۴ کیرٹ کا ہے یا نہیں۔ ان دشواریوں کے پیش نظر فی الحال لیسنس رکھنی والی بھٹیوں کو خالص ۱۴ کیرٹ کا سونا بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔

ایک سوال اور ہے، کیا حالیہ قاعدے قانون سے سونے کی غیر قانونی درآمد واقعی رک جائے گی؟ خلیج فارس، مکاؤ۔ ہانگ کانگ جیسی جگہوں سے بڑی مقدار میں سونا آتا ہے۔ کیا ان جگہوں پر ایسے سناروں کی کمی ہے جو اصلی سونے کو خالص ۱۴ کیرٹ والے زیورات میں تبدیل نہیں کر سکتے پہلے اصلی سونا مختلف شکلوں میں طرح طرح کے جال پٹوں سے لایا جاتا تھا۔

اب زیورات آئیں گے کسی نہ کسی شکل میں غیر قانونی درآمد کا سلسلہ جاری رہنے کا امکان ختم نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں ایسے سناروں کی کمی نہیں ہے جو "نافانا" غیر قانونی سونے کو زیور کی شکل نہ دے سکیں۔ ہم نے جب بے ایمانی اور چور بازاری اپنی فطرت ثانیہ بنالی ہے تو کتنے ہی سخت قاعدے قانون کیوں نہ نافذ کر دئے جائیں۔ مکمل کامیابی دشوار ہے۔ عوام دشمن عناصر بے ایمانی کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال ہی لیتے ہیں۔ لیکن دشواریوں کے باوجود سونے کی غیر قانونی درآمد میں کمی پیدا ہو جائے گی اس کے آثار ابھی سے نظر آنے لگے ہیں۔

خامیاں

نئے قانون میں بہت سی اچھائیوں کے ساتھ کچھ خامیاں بھی ہیں۔ ایک خاص خامی یہ ہے کہ سونے کے زیورات گولڈ کنٹرول کی زد سے آزاد ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جتنے زیور چاہے رکھے۔ ہاں ۹ فروری ۶۳ کے بعد اصلی سونے کے زیور خریدنے کا اختیار نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن اس بات کی تصدیق کیسے ہو کہ ۹ فروری کے بعد اصلی سونے کے زیورات میں اضافہ نہیں ہوا ہے ایسی حالت میں چوری چھپے اصلی سونا زیورات کی شکل میں درآمد ہوتا رہے گا اور بکتا رہے گا۔ جوہری اپنی دوکانوں کے شوکیس میں رکھنے کے بجائے غیر دکان داروں کے ذریعے فروخت کروائیں گے۔ خرید و فروخت بازار میں نہ سہی بازار سے ہٹ کر ہو گی۔ دن میں نہ سہی رات کی تاریکیوں میں ہو گی۔ اگر کوئی خریدار پکڑ بھی لیا گیا تو وہ قانون کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا وہ بہت آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ یہ تو ۹ فروری سے پہلے کا مال ہے۔

اس لئے گولڈ کنٹرول کو زیادہ موثر بنانے کے لئے کیوں نہ زیورات رکھنے والوں سے ان کے اسٹاک کا اعلان کروایا جائے۔ ایک حد مقرر کر دی جائے۔ (مان لیجیے، ۱۰ تولے) اگر کسی کے پاس اس حد سے زائد ہو تو وہ اپنے اسٹاک کا اعلان کرے۔ ظاہر ہے اس قانون کے جاری ہونے کے بعد ملک کے ڈر کے عورتیں شادیوں وغیرہ میں زیورات پہن کر جانے سے گریز کریں گی۔ اس طرح زیور حاصل کرنے کا ایک اہم مقصد ہی فوت ہو جائے گا جب زیور پہنے

نہیں جا سکتے تو رکھنے سے کیا فائدہ نفسیاتی طور پر لوگوں کی نظروں میں سونے کی روایتی چمک بھی مدہم پڑ جائے گی۔ اس کی قدر گھٹ جائے گی اور اخیر میں سونے کی مانگ میں کمی پیدا ہونے لگے گی۔

گولڈ کنٹرول کے قاعدوں کے مطابق لوگوں کو یہ بھی اعلان کرنا تھا کہ ان کے پاس کتنا سونا ہے اور وہ سونا کہاں سے ان کے پاس آیا۔ لیکن گولڈ بانڈ خریدنے والوں کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی کہ سونا کہاں سے آیا۔ اعلان کے لئے ۹ فروری آخری تاریخ مقرر کی گئی تھی بعد میں یہ تاریخ بڑھا کر ۲۸ فروری کر دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ گولڈ بانڈ خریدنے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو جائے لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ دراصل پہلے بھی جو تاریخ مقرر کی گئی تھی وہ بہت لمبی تھی۔ وہ تو ایک طرح سے ذخیرہ اندوزوں کو موقع دینا تھا کہ سونے کو زیورات میں تبدیل کر لیں اور فروخت کر لیں۔ اس موقع سے صرافوں نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ چنانچہ ۹ فروری کو اصلی سونے کی قیمت ۱۳۰ - ۱۱۰ روپے فی ۱۰ گرام تھی۔ انھوں نے اوسط ۵۰ فیصدی زیادہ منافع کمایا۔ تاریخ بڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا چھپے چوری زیورات بنوانے کے لیے مزید وقت مل گیا۔

گولڈ کنٹرول سے متعلق جو بھی قاعدے قانون اس وقت تک نافذ کئے گئے ہیں وہ تو شاید ابتدا ہے امید ہے کہ گولڈ بورڈ حالات اور تجربہ کے پیش نظر قاعدوں پر نظر کریگا اور انکو زیادہ مؤثر بنائے گا

تعلیمی مسائل

ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم

اس زمانے میں ایک ملک کی طاقت وحیثیت کا سارا دارومدار اس کی سائنسی معلومات، فنی مہارت اور ان کے مناسب وموزوں استعمال پر ہے۔ دنیا کی منڈی میں نہایت ہی سخت مقابلے کا سامنا کرنا ہوتا ہے صنعت وحرفت میں اعلیٰ مقام رکھنے والا ملک ہی اس میدان میں اترنے کی جرأت کرسکتا ہے اور پاؤں جما سکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پچھڑے ہوئے ممالک کے اندر بھی روزمرہ کی زندگی میں مشین کا عمل دخل تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ سائنس کی تعلیم ہی میں قوموں کی خوشحالی نظر آتی ہے اور وہی ان کی آزادی کا ذمہ لے سکتی ہے۔ اس نے صرف قدرت کے راز ہی آشکارا نہیں کئے ہیں بلکہ انسان کو انسان سے متعارف بھی کرایا ہے۔ خصوصاً ایسے ملکوں میں جہاں توہم پرستی اور تاریک اندیشی کا دور دورہ ہے، سائنس کی تعلیم کی اہمیت اور زیادہ ہے۔ سائنس کی بدولت عالمی اشتراک وتعاون بڑھا ہے۔ اس کی شرکت نسلی اور مقامی تعصبات سے پاک ہے وہ صلائے عام کی قائل ہے۔ سائنس کے اصول اور طریقے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوا کرتے وہ ان سب کے لئے ہیں جو انھیں برتنا چاہیں۔ سائنس کی تیز رفتاری نے تمام دنیا کے بسنے والوں کو آپس میں اس قدر نزدیک کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کے معاملات وحالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ترقی یافتہ ممالک کم حیثیت اور کم اہمیت کے دیسوں کی طرف سے کلیتاً غفلت نہیں برت سکتے۔ ایک جگہ کی ابتری کا اثر دور دور تک پہنچتا ہے اور یہ نہایت ضروری ہوگیا ہے کہ دنیا کا ہر ایک گوشہ کسی حد تک لازمی طور پر علوم وفنون کی برکتوں سے فیض یاب ہو۔ اب ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا دور گزر گیا اور کوئی ملک، دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے حال میں مست رہ کر ترقی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انتشار واختلاف کے ساتھ ساتھ امداد باہمی

کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ خواہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن بڑی بڑی مستحکم حکومتیں بھی چھوٹی چھوٹی عارضی ریاستوں کے ساتھ غیر معمولی فیاضی کا برتاؤ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آج کل کی صنعتی اور سیاسی فضا میں یہ بات کچھ ایسی دشوار نہیں رہی ہے کہ کوئی پس ماندہ ملک دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی رہنمائی اور ہمت افزائی کے سہارے پر چند سال کے اندر اندر اپنے یہاں فولاد کے کارخانے نہ قائم کرسکے یا بجلی کا سامان تیار کرنے کا انتظام نہ کرپائے یا اسی نوعیت کے اور دوسرے اہم کام نہ کرسکے۔ لیکن ان بڑے بڑے کارخانوں میں مشینوں کو مناسب طور پر برتنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک لائق اور تربیت یافتہ عملے کی ضرورت ہوتی ہے کاریگر اور ماہرینِ فن تیار کرنے میں کافی مدت لگا کرتی ہے اور یہ کام آسان بھی نہیں ہے۔ ایسی تربیت کے لئے ملک کے اندر ایک مکمل اور مستحکم قومی نظامِ تعلیم درکار ہوتا ہے۔ اس نظام کی ایک اہم اور درمیانی کڑی ثانوی منزل کی تعلیم ہے۔

اس وقت ثانوی مدارس کی آخری تین جماعتوں میں طلبہ کی تعداد تیس لاکھ بتائی جاتی ہے تیسرے پنجسالہ قومی منصوبے کے ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد پچاس لاکھ ہو جائے گی۔ اتنی بڑی تعداد کی بنا پر اس زمانے کی تعلیم کچھ اور اہم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دیس کی مشین چلانے والے ان میں سے ہی تیار ہوں گے اور اعلیٰ تعلیم کی بنیاد یہیں رکھی جاتی ہے۔ ہماری موجودہ ثانوی تعلیم کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ تیرہ چودہ سال کے بے فکر طالب علم کو اپنے لئے ان مضامین کا قطعی طور پر انتخاب کرنا پڑتا ہے جن میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ گویا ایک بچے کو عمر کی اس منزل پر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ اس کی آئندہ زندگی کی شاہراہ کیا ہوگی۔ جبکہ وہ اس مسئلے پر کسی طور پر صائب رائے رکھنے کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب یہ بات بڑی حد تک سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ ثانوی منزل پر تعلیم کو محدود و مخصوص نہ بنانا چاہیئے بلکہ اس کا دامن وسیع و کشادہ رکھنا چاہیئے۔ طلبہ کی موزونئ طبع کے مطابق انھیں منتخب مضامین کا گہرا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک وسیع پس منظر ضرور دینا چاہیئے۔ اس لئے بیشتر مضامین سب کے لئے لازمی ہونے چاہئیں

اور خصوصی مطالعہ کی بس ابتدا ہی کرنی چاہیئے اور اس بات کی گنجائش رکھنی چاہیئے کہ طالب علم اپنی طبیعت کے جھکاؤ کو سمجھنے کی خاطر مختلف مضامین کے ذائقہ سے واقف ہو سکے اور کسی حد تک تجربے سے سیکھ سکے۔

ہمارے دیس میں سائنس کی تعلیم اولاً بڑی تاخیر سے شروع ہوئی پھر بھی بہت کم مدارس میں اس کا انتظام کیا جا سکا۔ اور وہ بھی نہایت ناقص طور پر۔ تعلیمی ترقی کے ابتدائی دور میں تو سائنس کی تعلیم کا قطعی فقدان رہا کیونکہ بدیسی سامراج نے اپنے مفاد کے پیش نظر نہ ذہنی بیداری کو روا رکھا اور نہ صنعتی ترقی کے روادار ہوئے۔ لہٰذا تعلیمی نظام میں بھی سائنس کو صحیح مقام دینے کا سوال نہ اٹھا۔ تعلیم کو ملک کی فلاح و بہبود اور عوام کی شخصیت کو ابھارنے کا ذریعہ بنانے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ تو محض حکمرانوں کے ہاتھ بٹانے والے عملے کی تیاری کا ایک ذریعہ تھی۔ اس لئے سائنس کی تعلیم کا چراغ تہہ داماں ہی رہا۔ آزادی ملتے ہی رہبرانِ قوم نے اپنی توجہ تعلیمی مسائل کی طرف مبذول کی اور ابتدائی منزل پر بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار ہوئی۔ اگرچہ بنیادی تعلیم مروجہ اصطلاح میں سائنس کی تعلیم نہیں کہلائی جا سکتی لیکن بچوں میں ہاتھ سے کام کرنے کی صلاحیت کو ابھارتی ہے اور انھیں مشاہدے کی ترغیب دیتی ہے۔ ان کے دل میں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی وقعت بڑھاتی ہے اور انھیں دستکاری اور حرفے سے لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ یہ رجحانِ طبیعت آئندہ زندگی میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے اور صنعت و حرفت کی تربیت حاصل کرنے کے لئے نہایت مفید ہے۔ دوسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں ثانوی مدارس کے اندر سائنس کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا۔ مدالیار کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ثانوی مدرسے میں عام سائنس ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے اور اسے طالب علم کی عام تعلیم کا ایک ضروری جزو سمجھا جائے۔ علاوہ ازیں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبہ کو اختیاری طور پر بھی ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے سائنس پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس دوران میں تقریباً سب ہی ثانوی مدارس میں ابتدائی سائنس یا عام سائنس کا

انتظام کر دیا گیا اور چار ہزار چھ سو پچیس کے قریب مدرسوں میں اختیاری سائنس بھی شروع کر دی گئی۔ تیسرے منصوبے کے دوران میں تمام ثانوی مدارس میں عام سائنس لازمی کرنے کے علاوہ اکیس ہزار آٹھ سو ثانوی مدرسوں میں سے نو ہزار پانچ سو سے بھی کچھ زائد مدرسوں میں سائنس کی خصوصی تعلیم کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے شروع کر دیا جائے گا۔ کچھ دوسرے اقدامات بھی تجویز کئے گئے ہیں جن کے ذریعے سائنس کی تعلیم کو بہتر اور موثر بنایا جا سکے گا مثلاً دوسرے منصوبے میں چار سو پچاس سائنس کلب قائم ہوئے تھے۔ اب ان میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ سائنس کا شوق طلبہ میں عام ہو۔ تمام ریاستوں میں سائنس کے نصاب کو ایک نہج پر لانے کی کوشش کی جائے گی اور اسے تعلیم کی پہلی اور آخری منزل سے بخوبی مربوط کیا جائے گا۔ سائنس کے اساتذہ کی رہنمائی کے لئے خصوصی طور پر کتابیں تیار کی جائیں گی، طلبہ کے لئے اچھی اور سستی درسی کتب اور دیگر امدادی کتب کا انتظام ہوگا۔ سائنس کا معیاری سامان معقول قیمت پر بلا دقت فراہمی کی صورتیں نکالی جائیں گی۔ دوسرے منصوبے میں دو ہزار ایک سو پندرہ کثیر المقاصد ثانوی مدارس قائم ہوئے تھے مدالیار کمیشن میں ایسے مدرسے کھولنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے طلبہ کو بقدر ظرف اپنے جوہر دکھلانے کا موقع بھی مل سکے اور ان کی عام تعلیمی سطح بھی بلند اور کشادہ رہے۔ اس طرح فنی اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ تیسرے منصوبے میں صرف تین سو اکتیس کثیر المقاصد ثانوی مدارس کا اضافہ تجویز کیا گیا ہے کیونکہ ان سب مدارس کے کام کو بہتر بنانے کی طرف پوری توجہ صرف کی جائے گی اور بالخصوص سائنس کی تعلیم پر دھیان دیا جائے گا۔ اس زمانے میں اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں بھی بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ یوں تو ۱۹۶۱ء تک اساتذہ کے تربیتی اداروں کی تعداد دو سو چھتیس ہو چکی تھی جبکہ ۱۹۵۱ء میں صرف ترپن تھی لیکن اب کل تعداد بڑھ کر تین سو بارہ ہو جائے گی، اس کام کو اور بہتر بنانے کی غرض سے ملک کے مختلف حصوں میں چار علاقائی تربیتی ادارے (ریجنل ٹریننگ کالج) قائم کئے جا رہے ہیں جو کثیر المقاصد ثانوی مدارس کے لئے اساتذہ تیار کرنے والا عملہ تیار کریں گے اور ملک کے دیگر تربیتی اداروں

کے لئے رہنما ثابت ہوں گے۔ ان تمام اداروں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سائنس اور ریاضی کے اساتذہ تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کیونکہ بتایا جاتا ہے کہ ہر سال بیس ہزار سے زائد سائنس اور ریاضی کے اساتذہ مدرسوں میں پہنچتے ہیں جن میں سے بمشکل چھ ہزار پورے طور پر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ دورانِ ملازمت میں اساتذہ کی تربیت کی غرض سے دوسرے منصوبے کے دوران میں چوّن توسیعی پروگرام کے مرکز قائم ہوئے تھے۔ تیسرے منصوبے میں اس کام کو وسعت دے کر بیشتر تربیتی اداروں میں شروع کر دیا جائے گا۔ تاکہ بالآخر وہ تمام تربیتی اداروں کا ایک لازمی جزو بن جائے۔ اس وقت توسیعی پروگرام کا سارا زور سائنس اور سماجی علوم کے اساتذہ کی تربیت کی طرف ہے۔ اس کی طرف سے ثانوی مدارس میں سائنس کلب قائم کئے جا رہے ہیں اور بہر نوع طلبہ اور اساتذہ کو سائنس کی طرف راغب کیا جا رہا ہے۔

ہمارے مشہور عالم سائنس داں اچاریہ جگدیش چندر بوس کی یادگار کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ان کی صد سالہ سال گرہ کی تقریبات کے سلسلے میں "جگدیش بوس نیشنل سائنس ٹیلنٹ سرچ" اسکیم تیار کی گئی۔ اس اسکیم کا اصل مقصد تعلیمی اداروں کے تعاون سے سائنس کا رجحان رکھنے والے ذہین طلبہ کا پتہ لگانا ہے تاکہ ان کی ہمت افزائی کی جا سکے۔ کالج میں تعلیم پانے والا کوئی بھی طالب علم جس نے ثانوی جماعت تک سائنس کی تعلیم حاصل کر لی ہے۔ اس اسکیم کے ذریعے امداد کا خواہاں ہو سکتا ہے۔ ہر سال دس طلبہ کو پچھتر روپے ماہانہ وظیفے کا انتظام کیا گیا ہے یہ وظیفہ تین سال سے لے کر پانچ سال تک ایک طالب علم کو مل سکتا ہے۔ اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہونہار طالب علموں کو سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ ہوگا۔ "نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ" نے ابھی ایک ایسی ہی اسکیم کا اعلان کیا ہے جسے "سائنس ٹیلنٹ سرچ" کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ اسکیم نمونے کے طور پر فی الحال دہلی کے اندر چلائی جائے گی۔ اور آہستہ آہستہ ملک کی تمام ریاستوں میں رائج ہو جائے گی یہ اسکیم بھی اس غرض سے تیار کی گئی ہے کہ ثانوی تعلیم کے اختتام پر مستقبل کے سائنسدانوں کی

نشان دہی کرلی جائے تاکہ ان کی صلاحیتوں کو مقابلے اور ہمت افزائی کے ذریعے ابھارا جاسکے اس طرح ثانوی مدارس میں سائنس کی طرف طلبہ کا جھکاؤ بڑھے گا اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کو سائنس کے ذہین اور مستعد طلبہ میسر آسکیں گے۔ اس اسکیم کے مطابق "سائنس ٹیلنٹ سرچ" کے مقابلے میں اپنے استادِ سائنس کی تصدیق کے بعد دہلی کے کسی بھی ثانوی مدرسے کی آخری جماعت میں تعلیم پانے والا طالب علم شریک ہوسکتا ہے۔ ایک طالب علم کو اس مقابلہ میں صرف ایک مرتبہ شرکت کی اجازت ہوگی۔ صلاحیت کی جانچ، قابلیت کے امتحان اور انٹرویو کے ذریعے طلبہ کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ کامیاب طلبہ کو پہلے سال پچاس روپے ماہانہ اور اگلے دو سال پچھتر روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ تقریباً سو روپے کی قیمت کی کتابیں اور تعلیمی سامان بھی ہر ایک طالب علم کو فراہم کیا جائے گا۔ سائنس میں غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے طلبہ کی دریافت کے سلسلے میں مقابلے کا پہلا امتحان اسی ماہ (یعنی اپریل ۶۳ء) میں ہوگا۔

قومی منصوبوں کے ذریعے ملک کی اقتصادی حالت روز بروز بہتر ہورہی ہے۔ کاروبار کو فروغ ہورہا ہے اور صنعت وحرفت بڑھ رہی ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں قائم ہورہی ہیں اور ہماری زندگی میں مشین کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ اب ہمارا دیس ایسی مشترک معیشت اختیار کررہا ہے جہاں کی زندگی میں زراعت وصنعت دونوں دخیل ہوا کرتے ہیں اس لیے ہمارے واسطے سائنس کی تعلیم کی ضرورت واہمیت برابر بڑھتی جارہی ہے جو ملک صنعتی ترقی کا خواہش مند ہے اسے ابتدائی تعلیم سے ہی سائنس کی طرف توجہ کرنی ہوگی اس وقت جو ہنگامی حالات رونما ہوئے ہیں انھوں نے ہمیں کچھ اور چونکادیا ہے اس مکر وسیاست کی دنیا میں کسی کا اعتبار نہیں۔ یار کو غیر ہونے دیر نہیں لگتی صدیوں کی تہذیبی روایات زراسی دیر میں ملیامیٹ ہوکر رہ جاتی ہیں۔ سلوک کا جواب بدسلوکی سے ملنے لگتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو پوری طرح چاق وچوبند رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس دورِ حاضر میں صرف جنگ کے آلات ہی نہیں بدل گئے ہیں بلکہ حالات بھی قطعی مختلف ہو گئے ہیں۔ اب نہ جنگ کی غارت گری صرف میدانِ کارزار تک محدود ہے اور نہ اس کی تیاری۔ آج کی جنگ کے مورچے، محاذ کے علاوہ فیکٹریوں اور کارخانوں میں بھی قائم ہوا کرتے ہیں۔ ایک ملک کا مستحکم صنعتی نظام ہی اپنے سپاہی کی صحیح طور پر پشت پناہی کر سکتا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہی ہے کہ صنعتی ترقی کا سارا انحصار سائنس کی تعلیم پر ہے مزید برآں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سائنس کی تعلیم کے ذریعے نہ صرف مادّی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں بلکہ منطقی اور استدلالی نقطہ نظر بھی پیدا ہوتا ہے سائنس ذہنِ انسانی سے توہمات کے جالے ہٹاتی ہے اور ضعیف الاعتقادی سے بچا کر تحقیق و تفتیش کا عادی بنا دیتی ہے۔

"معلّم"

۱۹۶۲ء کے اُردو ادب کا جائزہ

اگلے ماہ جامعہ کا جائزہ نمبر شائع ہوگا

اس کے چند متوقع مضمون نگار حسب ذیل ہیں:-

پاکستانی مطبوعات کا جائزہ		پروفیسر انیس خورشید
تنقیدی ادب	"	پروفیسر آل احمد سرور
تحقیقی ادب	"	جناب قاضی عبدالودود
ناول اور افسانے	"	جناب ظفر پیامی
نظم	"	جناب علی جواد زیدی

کوائف جامعہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وفات پر تعزیتی جلسہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وفات کی خبر جامعہ میں انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔ استادوں اور طالب علموں کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایک مختصر تقریر کی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمات اور قربانیوں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتلایا کہ مرحوم نے کس خلوص اور لگن کے ساتھ ملک کی خدمت کی۔ ان کی ایک نمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ معاملات اور مسائل پر غور کرتے وقت ان کی نظر میں سب لوگ برابر ہوتے وہ نہ تو سیاسی اختلافات سے متاثر ہوتے اور نہ فرقے اور علاقے سے۔ راشٹرپتی منتخب ہونے کے بعد انھوں نے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے بہترین نمونہ پیش کیا

آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے حسب ذیل ریزولیوشن پڑھ کر سنایا جسے سب نے کھڑے ہوکر منظور کیا:

ڈاکٹر راجندر پرشاد صف اول کے رہنما، گاندھی جی کے مخلص عقیدت مند اور پیرو کار اور ہندوستان کے پہلے صدر تھے۔ ان کی وفات سے ملک ایک بہترین شخصیت سے محروم ہوگیا۔

مرحوم کو جامعہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ جامعہ کے کاموں کو قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان کے جامعہ کے سربراہوں سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے [illegible] میں بنیادی تعلیمی کانفرنس کی جو جامعہ کے اہتمام میں جامعہ نگر میں منعقد ہوئی تھی

صدارت کی اور ۱۹۶۰ء میں جب جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا، تو مرحوم نے اپنی انتہائی معروفیت اور خرابیٔ صحت کے باوجود اس کے بنیادی جلسے کی صدارت فرمائی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح کو سکون بخشے اور ان کی خوبیوں اور اچھائیوں پر عمل کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا کرے۔

استادوں کے مدرسہ میں سائنس میلہ اور کلچرل پروگرام

فروری اور مارچ کے مہینے استادوں کے مدرسے کے طلبا اور اساتذہ کے لئے بہت معروفیت کے مہینے رہے ہیں اس لئے کہ بیشتر جلسے اور کلچرل پروگرام اسی زمانے میں ہوئے جس کا مختصر ساخاکہ یہ ہے۔

توسیعی پروگرام کے تحت ۱۱، ۱۲، ۱۳ فروری کو ایک سہ روزہ سائنس میلے کا انتظام کیا گیا۔ اس موقع پر جلسوں کے علاوہ ایک سائنس کی نمائش بھی کی گئی جس میں دلی کے ہائر سکنڈری اور سینئر بیسک اسکولوں کے طلبا نے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کچھ سائنس کے پروجیکٹ پیش کئے تھے۔ ان میں سے کچھ پروجیکٹ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنے دلچسپ تھے کہ ان سے دلچسپی لئے بغیر کسی کا وہاں سے گزر جانا مشکل تھا۔ اس میلے کا افتتاح ڈاکٹر ڈی ایس، کوٹھاری چیئرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے کیا۔ آپ نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں اس بات پر بہت زور دیا کہ سائنس ایک عظیم عالمی نعمت ہے جو ملک وقوم، نسل ورنگ مذہب وملت کے امتیازات سے بالاتر ہے اور تمام ملکی اور جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہے درا صل سائنس کی ترقی سے ہی پوری انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے اس موقع پر ڈاکٹر جے۔ سوار برک، ڈائرکٹر، یونیسکو، ساوتھ ایسٹ ایشیا سائنس کوآپریشن آفس دہلی، بھی بحیثیت مہمان خصوصی تشریف فرما تھے، آپ نے نہایت موثر انداز میں اپنے تاثرات سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ آخر میں پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ نے اپنے مخصوص علمی انداز میں فرمایا کہ سائنس اور آرٹ کے علوم کا مقصد ایک ہی ہے یعنی حقیقت کی جستجو۔ اس مقصد کے پیش نظر ان علوم کے ماہرین کو چاہیئے کہ حقیقت کی تلاش کا ایک ایسا متوازن راستہ

اختیار کریں جس پر چل کر سائنس اور آرٹ کے علوم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں۔

۱۲ فروری کو صبح کی نشست میں ایک تقریری مقابلے کا انتظام کیا گیا جس میں دلی کے سینئر بیک اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکول کے تقریباً ۲۲ طلبا نے مختلف عنوانات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے کی صدارت شری جی۔ این شرما، مشیر سائنس ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن، دہلی نے فرمائی۔ آپ نے طلبا کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کلب کے قیام پر زور دیا۔

اسی دن شام کو سائنس کے استادوں کا ایک دلچسپ سمپوزیم ہوا جس کی صدارت کے فرائض شری این کے۔ سانیال، فیلڈ ایڈوائزر، ڈائرکٹریٹ توسیعی پروگرام نے انجام دئے۔

تیسرے دن کا پروگرام اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد دلچسپ تھا۔ صبح کی نشست میں طلبا نے خود نمائش میں پیش کئے جانے والے سائنس کے پروجیکٹ کے بارے میں دلچسپ اطلاعات بہم پہنچائیں۔

شام کی نشست میں وزارت تعلیم کے جوائنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر شری راجہ راؤ سنگھ نے طلبا اور اساتذہ کی کوششوں کو سراہتے ہوئے سائنس کے میدان میں کچھ نئی سمتوں کی طرف توجہ دلائی اور آخر میں تقریری مقابلے میں امتیاز حاصل کرنے والے طلبا کو انعامات تقسیم کئے۔

غرض اسی طرح یہ سہ روزہ میلہ ختم ہوا۔ اس میلے سے طلبا اور اساتذہ نے جس شوق اور دلچسپی کا اظہار کیا وہ بہت امید افزا ہے۔ اور آئندہ اس قسم کے کام کرنے کا ایک بہت بڑا سہارا۔

مارچ کے مہینے میں انجمن طلبا کے تینوں ہاؤسز کی طرف سے جو کچھ سرگرمیاں عمل میں آئیں ان کی مختصر سی تصویر یہ ہے۔

۵ مارچ کو ٹیگور ہاؤس کی طرف سے ٹیگور ڈے منایا گیا۔ اس موقع پر ایک نمائش کا انتظام کیا گیا جس میں ٹیگور کی بنائی ہوئی تصویریں اور ٹیگور کی کتابیں پیش کی گئیں۔ تصویریں للت کلا اکیڈمی سے حاصل کی گئی تھیں اور کتابیں ساہتیہ اکیڈمی سے۔ اس طرح طلبا کو

اساتذہ کے سامنے لیکچرز کے دو اہم پہلو پیش کئے گئے یعنی مصوری اور ادب۔

اس موقع پر طلبا کی طرف سے مونو ایکٹنگ، ایک ایکٹ کا ڈرامہ (پردے کے پیچھے) اور کچھ کلچرل پروگرام پیش کئے گئے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت دلچسپ تھے۔

۱۳ر مارچ کو گاندھی ہاؤس کی طرف سے ایک محفل موسیقی منعقد کی گئی جس میں دلّی کے بہت سے مشہور موسیقی کاروں کو جمع کرکے تفریح کا ایک اچھا موقع بہم پہنچایا گیا۔

۱۶ر مارچ کو گاندھی ہاؤس کی طرف سے ایک شام غزل کا انتظام کیا گیا جس میں طلبا کی طرف سے کچھ دلچسپ پروگرام پیش کئے گئے۔ اس موقع پر ایک ڈرامہ بندر کا پنجہ بھی پیش کیا گیا۔

غرض اس طرح یہ دونوں مہینے تعلیمی اور تفریحی سرگرمیوں کے اعتبار سے نہایت اہم تھے۔

ہندوستان میں مذہبی قوم پروری

۱۶ر مارچ ۱۹۶۳ء کو جامعہ کالج کے حلقۂ مطالعہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اپنی زیر تصنیف کتاب "ہندوستانی مسلمان — آج اور کل" کا وہ باب پڑھا جس کا عنوان ہے "مذہبی قوم پروری"، اس باب میں انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کی اُن ذہنی عملی کاوشوں کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی ذہنی و عملی زندگی کی اصلاح سے تھا، پھر ان کے جلیل القدر صاحب زادے اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ کا ذکر ہے جو اس وقت کے بدلتے ہوئے حالات میں مسلمانانِ ہند کا ضمیر تھے اور جنھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کی مزاحمت کے لئے اگر کچھ نہ کیا گیا تو ہندوستانی مسلمانوں میں با وقار زندگی ایک قصہ پارینہ بن کر رہ جائے گی، فاضل مصنف نے سید احمد شہید کی تحریک پر معروضی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی۔ اور بتایا کہ سید صاحب مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی اصلاح کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا مقصد بھی پیش نظر رکھتے تھے، ان کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کی چنگاریاں سلگتی رہیں یہاں تک کہ جب ۱۸۵۷ء

کی بغاوت شروع ہوئی تو یہ چنگاریاں ایک بار پھر شعلہ بنیں اور خاص طور سے شاملی کے میدان میں مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی رہنمائی میں علماء نے اپنی حریت پسندی کا نمایاں اور واضح ثبوت دیا۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، اس سلسلہ میں عابد صاحب نے مولانا نانوتوی رح کی درویشانہ زندگی ایثار وقربانی اور قائدانہ خصوصیات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور علماء دیوبند کی قوم پروری کو واضح طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس سے پہلے عابد صاحب نے اُس چیلنج کا ذکر کیا تھا جو نئے ہندوستان نے اپنے مسلمانوں کو دیا تھا اور جس کے مختلف جواب دئے گئے۔ ان میں سے پہلے جواب کا جو سرسید اور علی گڈھ کے مکتب خیال کی طرف سے دیا گیا پچھلے مقالے میں تفصیلی بیان تھا۔ موجودہ مقالے میں دوسرے جواب کا ذکر ہے۔ جو طبقہ علماء نے دیا۔

محفل مشاعرہ

پہلی اپریل کو جامعہ میں ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین صاحب کی صدارت میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے حسب ذیل شعراء نے شرکت کی:-

حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، گوپی ناتھ امن، روش صدیقی، سکندر علی وجد، سردار جعفری، قتیل شفائی، جگن ناتھ آزاد، حمایت علی شاعر، اقبال صفی پوری، نظر جعفری اور کلیم عثمانی۔

جناب غلام ربانی تاباں نے میزبان کی حیثیت سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ اس مختصر جگہ میں ان تمام شعراء کے کلام کا انتخاب پیش کرنا ممکن نہیں، اس لئے صرف فراق گورکھپوری اور حمایت علی شاعر کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے بقیہ شعراء کا کلام کسی اور اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

حضرت فراق گورکھپوری

غزل کے ساز اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات
نوائے میر سناؤ بڑی اداس ہے رات

ابھی تو ذکر سحر دوستو ہے دور کی بات
ابھی تو دیکھتے جاؤ بڑی اداس ہے رات

سنا ہے پہلے بھی ایسے میں بجھ گئے ہیں چراغ
دلوں کی خیر مناؤ بڑی اداس ہے رات

سمیٹ لو کہ بڑے کام کی ہے دولتِ غم
اسے یونہی نہ گنواؤں بڑی اداس ہے رات

اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیے ہیں ٹوٹے ہوئے
انھیں سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات

پڑے ہو دھندلی فضاؤں میں منہ لپیٹے ہوئے
ستارو! سامنے آؤ بڑی اداس ہے رات

کبھی تمھارے یہاں بھی ہوئی ہے رات ایسی
مقدروں کے خداؤ بڑی اداس ہے رات

دو آتشہ نہ بنا دے اسے نوائے فراق
یہ سازِ غم نہ سناؤ بڑی اداس ہے رات

بڑا کرم ہے یہ ہم پر ابھی یہاں سے نہ جاؤ
بہت اداس ہے یہ گھر ابھی یہاں سے نہ جاؤ

ابھی تو سوئے چراغوں نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو جاگتے ہیں گھر ابھی یہاں سے نہ جاؤ

گھنے درختوں کے جھرمٹ پہ پڑنے والی ہے
کمندِ ماہِ منور ابھی یہاں سے نہ جاؤ

حضرت حمایت علی شاعر

وہ ایک لفظ جو شرمندۂ بیاں نہ ہوا
اس ایک لفظ کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

اس ایک اشک نے رکھ لی ہے آبرو غم کی
جو دل میں ڈوب گیا آنکھ سے رواں نہ ہوا

آج اے دل لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
وقت کٹ جائے گا کچھ پیار کی باتیں ہی سہی

یوں تو کٹتی ہی رہے گی غمِ دوراں میں حیات
آج کی رات غمِ یار کی باتیں ہی سہی

زندہ رہنے کی کبھی تو کوئی صورت نکلے
عشرتِ عالمِ دیدار کی باتیں ہی سہی

کوئی تو بات چھڑے آج بہت جی ہے اداس
کچھ نہیں تو در و دیوار کی باتیں ہی سہی

یہ تو طے ہے کہ کھچے جائیں گے ہر حال میں ہم
ان کے لب پر رسن و دار کی باتیں ہی سہی

مراسلہ

اقبال کے خطوط عشرت رحمانی کے نام؟

(جامعہ کے مولانا ابوالکلام آزاد نمبر میں، مختلف خطوط سے جو اقتباسات دئے گئے تھے، ان میں ایک اقتباس اقبال نامہ کے اس خط سے تھا جو جناب عشرت رحمانی صاحب کے نام شائع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل مراسلہ موصول ہوا ہے :۔

شیخوپورہ بداؤں ۱۴-۳-۶۳

عزیز مکرم۔ السلام علیکم

جامعہ کے آزاد نمبر کا شکریہ۔ معلوم نہیں انکشاف کرنا چاہیئے یا نہیں، مگر اقبال نامہ میں جو خطوط عشرت رحمانی کے نام سے شائع ہوئے ہیں وہ درحقیقت میرے نام ہیں۔

مولانا راغب صاحبؒ نے اقبال نامہ کے مرتب پروفیسر کو بتایا تھا کہ بہت سے خطوط میرے پاس ہیں۔ چنانچہ جواب میں انھیں لکھا تھا کہ جملہ مشاہیر کے خطوط مجھ سے عشرت رحمانی لے گئے ہیں۔ ان سے منگوا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ چند خطوط مل سکے وہی میں نے بھیج دئے۔ جب کتاب میں یہ غلطی ہو گئی تو مرتب صاحب نے اپنے صاحبزادے کی غلطی بتائی اور دوسرے ایڈیشن میں صحیح کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر دوسرے ایڈیشن کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اور نہ آئے۔

بہرحال آزاد نمبر میں عشرت رحمانی کے نام ڈاکٹر اقبال کا جو خط مورخہ ۲۱ء آپ نے صفحہ ۲۰۷،۱ پر شائع کیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے میں نے ہی ڈاکٹر اقبال کو تذکرہ کے دیباچہ نگار کے اس ریمارک کی اطلاع دی تھی۔ اس کا یہ جواب ہے۔ چنانچہ اسی کے بعد اقبال نامہ میں ڈاکٹر صاحب کا سید سلیمان صاحب ندوی کے نام ایک خط موجود ہے۔ جس میں

انھوں نے ان سے میرے متعلق دریافت کیا ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ کے علاوہ ذاتی واقفیت نہ تھی اور وہ نقیب پر بڑی نوازش فرمایا کرتے تھے۔

سنہ ۲۱ء میں عشرت رحمانی غالباً اپنی ابتدائی تعلیم سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ سنہ ۲۸ء کے قرب وجوار میں انھیں نے اپنا رسالہ دہلی سے نکالا تھا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے تھے۔ اب ریڈیو میں ہی پاکستان میں ہیں۔

دعا گو

وحید احمد

ناشر: عبد اللطیف اعظمی، مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائٹل: دیال پریس دہلی

Regd. No. D - 768 April 1963
The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جَامِعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹	بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

"مرقع دہلی"

پروفیسر محمد مجیب

"مرقع دہلی" میں کچھ الف لیلا کی شان ہے، کچھ محتسب کی رپورٹ کا شائبہ، دراصل وہ ایسے شخص کا بیان ہے جس نے آنکھ کی دیکھی بات قلم سے لکھ دی، بغیر اس بحث کو چھیڑے ہوئے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اور مذہب کا تقاضا کیا ہے۔ "مرقع" اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہوتا تو اس میں حالات کا ایسا صاف عکس نہ ہوتا اور پڑھنے والے کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا کہ کسی ناصح نے اپنا غصہ اتارنے کے لئے بیگناہوں کو خواہ مخواہ بدنام نہیں کیا ہے تو کم از کم ایسی باتوں کو جن میں کوئی خاص عیب نہیں ہے بداخلاقی کی مثال بنا لیا ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں "مرقع" حقیقت نگاری کی ایک مشق ہے جسے اعلیٰ اور پست اخلاق کے مقامات اور مراتب سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ نتیجہ پڑھنے والا خود نکال سکتا ہے کہ اگر نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کا وہ حال تھا جو "مرقع" میں نظر آتا ہے تو نادر شاہی حملہ اور نادری فوج کی زیادتیوں پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں، جو ہوا اسے ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن کیا کل حقیقت وہی ہے جو "مرقع" کے مصنف نے دیکھی اور بیان کی ہے؟ کیا اورنگ زیب شاہ جہاں، جہانگیر اور اکبر کے زمانے میں امردوں، طوائفوں، قحبہ خانوں کی کچھ کمی تھی؟ کیا کبھی کسی بڑے ملک کے دارالسلطنت اور دربار کی زندگی ان عیبوں سے پاک تھی جو "مرقع" میں حالات کے روپ میں پیش کئے گئے ہیں؟ کیا یہ عیب ہمیشہ زوال کی علامت تھے؟ مورخ مثالیں تلاش کرے گا تو ہر طرح کی ملیں گی، مگر غالباً زیادہ تر ایسی جن سے ثابت ہوگا کہ زوال کے دور میں ہر جگہ بداخلاقی کے آثار ملے ہیں اور یہ ثابت نہ ہوگا کہ ترقی کے دور میں یہ آثار موجود نہ تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں غنڈہ گردی کا یہ عالم تھا کہ شریف عورتوں کو اکیلے گھر سے نکلنے اور مزاروں کو جانے کی ممانعت کرنی پڑی، لیکن خلجی دور میں جب شیخ نظام الدین غیاث پور سے شیخ قطب الدین

بختیار کے مزار پر تشریف لے جاتے تھے تو طوائفیں راستہ کے دونوں طرف قطاریں بنا کر سلام کرنے کو کھڑی ہو جاتی تھیں اور تغلق کے عہد میں دہلی اور دولت آباد میں بڑے محلے تھے جو طرب آباد کہلاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں دارالسلطنت کی طوائفوں کو الگ آباد کیا گیا اور ان کے پاس جانے والوں کے نام رجسٹروں میں درج کئے جانے لگے۔ اس آبادی میں اضافہ اس تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا کہ اکبر اس کی تحقیق کرنے پر مجبور ہوا کہ نوجوان عورتوں کو خاندانی زندگی کے لئے ناقابل بنانے میں اس کے امراء کا کتنا قصور ہے۔

انسان کی طبیعت پر ماحول کا اثر بے شک پڑتا ہے، مگر اتنا نہیں کہ ہر ملک اور زمانہ کی عادت اور عمل کو الگ نفسیاتی اصولوں کے مطابق جانچنا پڑے۔ ہندوستان میں اور اسباب کے علاوہ جو بداخلاقی کی طرف مائل کرتے ہیں اور سماجی زندگی میں اس کے لئے گنجائش نکالتے ہیں، ذاتوں کی تقسیم کا ایسا دستور تھا جو ہر کام اور پیشے کے برتنے والوں کو چاہے وہ برہمن کی مذہبی پیشوائی ہو یا کشتری کی سپہ گری، ٹھگ کی ٹھگی یا ڈومن کا ناچ، سب کو قاعدہ قانون کے تحت کر کے اخلاقی اعتبار سے خود مختار کر دیتا تھا، کسی پیشے کو برا مانا جا سکتا تھا، مگر پیشے کا برتنے والا اس کے تمام لوازمات کو اپنا فرض اور حق قرار دیتا اور اس طرح اس کے نزدیک خود اس پر کوئی الزام نہیں آتا تھا۔ پیشے کے اصولوں کے لحاظ سے طوائف کا مخصوص چالیں چل کر کسی کی دولت کو لوٹنا اور لٹانا مناسب تھا، مگر کسی کی منکوحہ بیوی بن کر گھر بیٹھنے کا حوصلہ کرنا مناسب نہیں تھا، کیونکہ پہلی صورت میں روایات اور تصورات کی تصدیق ہوتی تھی اور دوسری صورت میں ذاتوں کے قاعدے قانون کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ راج کی قسموں میں ایک قسم راجہ کا راج تھا، ایک قسم نیور یا کا راج، اور ہر نیوریا کا حق تھا کہ وہ اپنا راج قائم کرنے کی کوشش کرے، مسلمانوں نے ذاتوں کے قانون کو اصولاً کبھی تسلیم نہیں کیا، لیکن اس کے مطابق جو نظام قائم ہو چکا تھا اسے بدل نہیں سکتے تھے اور ان کے دور حکومت میں علاوہ ان ذاتوں کے جن کا منصب لہو و لعب کو فروغ دینا تھا، غلاموں اور لونڈیوں کی بے حساب تعداد ہوا و ہوس کی خدمت کرنے کو پیدا ہو گئی۔

اخلاقی محاسبہ کر کے شاید یہ معلوم نہ کیا جا سکے کہ ہماری تاریخ کا کونسا دور بہتر تھا اور کونسا بدتر، لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ تعمیر و تسخیر کا میلان کب قوی اور کامیاب تھا اور کب وہ کمزور ہوا یا غائب ہو گیا۔ یہ میلان کسی مقررہ قاعدے کے مطابق قوی اور کمزور نہیں ہوتا، کبھی کوئی شخصیت اسے بیدار کرتی ہے، کبھی ترقی کا موقع، کبھی کوئی بڑا خطرہ۔ یہ نظریہ منطق کے لحاظ سے لازمی اور تعلیم کے لئے مفید ہے کہ جب کسی قوم کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں تو وہ ترقی کرتی ہے اور برے ہوتے ہیں تو اسے زوال اور ناکامی کی بھیانک شکل دیکھنی پڑتی ہے، مگر تاریخ میں اس کے مستند اور قطعی ثبوت نہیں ملتے۔ جن ترکوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا ان کے اخلاق راجپوتوں سے بہتر نہیں تھے، بلکہ بعض اعتبار سے راجپوت ہی بہتر ثابت ہوں گے۔ ترکوں کو کامیابی اس وجہ سے ہوئی کہ ان میں ایک خاص قسم کی ہمت تھی اور فنِ جنگ میں وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ ہمت ان میں فوقیت کے نسلی اور تہذیبی احساس نے پیدا کی تھی جو خدا کے نیک بندوں میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ فنِ جنگ بھی انھیں مذہب اور اخلاق نے نہیں سکھایا، بلکہ خانہ بدوشی کے نظامِ حیات نے۔ یہی باتیں کم و بیش مغلوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں اور ان کی طرف سے یہ دعویٰ بالکل کیا ہی نہیں جا سکتا کہ ان کے حوصلوں کو بڑھانے اور ان کے مخالفوں کی ہمت پست کرنے میں مذہب اور اخلاق کو دخل تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کا ایک سبب یہ تھا کہ شریعت اور سیاسی رواج دونوں کے لحاظ سے تاج و تخت کی وراثت کا کوئی مسلّم قانون نہیں تھا۔ دوسرا سبب اورنگ زیب کی پالیسی تھی جسے ملک گیری کی ہوس کہا جا سکتا ہے یا حالات کا غلط اندازہ یا ایک سیاسی الجھاؤ جس سے مسلسل جنگ کے سوا رہائی کی کوئی صورت نہیں تھی اور جس نے اس کے امراء کو عاجز اور خزانہ کو خالی کر دیا۔ اورنگ زیب نے اپنے کسی لڑکے کو حکومت کے فرائض انجام دینے کے لئے تیار نہیں کیا اور اس کی وفات پر ملک میں انتشار پیدا کرنے والی جو طاقتیں تھیں ان کا کوئی تجربہ کار اور صاحب تدبیر حاکم ہی مقابلہ کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا تو بے شک صحیح ہو سکتا ہے کہ زوال اور پستی اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مغلیہ سلطنت کو زوال اخلاقی بگاڑ کی وجہ سے ہوا۔

"مرقع دہلی" کا مصنف زندگی کو اخلاق کا پابند رکھنے کی ضرورت کو مانتا ہوگا، گر ۱۷۳۹ء کی دہلی کو اخلاق کی عینک لگا کر دیکھا جاتا

تو مرزا مظہر جان جاناں جیسے اور شخصیتوں نے جو روشنی پھیلائی تھی اس کے سوا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ۔

پھر بھی اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے اخلاقی اور معاشرتی زوال کے اسباب کیا تھے ۔ سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے، مگر اس کا تعلق اخلاقیات اور مذہب سے نہ ہوگا ۔ اس وقت کی حکومت، خواہ وہ کسی مسلمان بادشاہ کی ہوتی یا ہندو راجہ کی در اصل ایک حاکم طبقے کا راج تھا، اور راج کے معنی یہ تھے کہ محنت دوسرے کرتے اور محنت کے حاصل کو حاکم طبقہ سیاسی، انتظامی اور فوجی ضرورتوں کی بنا پر مختلف ٹیکسوں کے نام سے یا محض زبردستی اپنے قبضے میں کر لیتا تھا ۔ کسان زمین کی کاشت کرتا، اور غلہ یا اس کی قیمت شاہی عمال، جاگیر دار، زمیندار اور ان کے متعلقین اس طرح اور اس مقدار میں وصول کر لیتے کہ کسان بس اس قابل رہتا کہ غلہ پیدا کرنے کے سلسلے کو جاری رکھ سکے ۔ صنعت پیشہ لوگوں سے خام مال حاصل کرنے اور اس سے چیزیں بنا کر خریدار کے ہاتھ بیچنے تک کئی منزلوں پر مختلف قسم کے ٹیکس وصول کئے جاتے، بادشاہوں اور امرا کی کبھی کبھی یہ کوشش ہوتی کہ بہترین ماہروں کو بالکل اپنے قابو میں کر لیں، اس طرح کہ وہ مال تیار کرنے پر مجبور رہیں اور انھیں اپنا بنایا ہوا مال بیچنے کی آزادی نہ ہو ۔ اس نظام معیشت کو "جاگیری" کہا گیا ہے، اور اسے یورپ کے فیوڈل نظام کا مماثل مانا گیا ہے، لیکن ان دونوں میں بنیادی فرق تھا ۔ فیوڈل نظام کا انحصار اس اصول پر تھا کہ ہر شخص کی حیثیت، اس کے حقوق اور اختیارات ایک معاہدے کے مطابق مقرر ہوتے ہیں، اور یہی حقوق اور اختیارات کا مجموعہ اسے ایک وجود، ایک شخصیت بنا دیتا تھا ۔ یورپ میں بادشاہوں، امرا اور کلیسا نے ہر طرح کی زیادتیاں کیں، فیوڈل نظام ان کی اغراض کی کشمکش کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا، پھر بھی حقوق کا ایک تصور باقی رہا، جو ہمارے زمانے کی جمہوریت اور شخصی آزادی کی بنیاد ہے ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے اور خاص طور سے راجپوت ریاستوں میں دستور اور رواج کو سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بہت دخل تھا، لیکن رواج نے کبھی قانون کی شکل اختیار نہیں کی، اور اس کے مطابق حقوق افراد کے نہیں تھے بلکہ قبیلوں، ذاتوں، خاندانوں کے ۔ مسلمانوں کے زمانے میں سیاسی اقتدار ایک ننگی تلوار کی طرح ان تمام تعلقات کو کاٹتا

جو اس کے مفاد یا مصلحت کے خلاف تھے، اور صرف رعایا نہیں بلکہ امرا بھی اپنے کسی رواجی حق کو فرماں برداری کی شرط نہیں بنا سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے بادشاہوں کا اختیار تقریباً غیر محدود اور حکومت کے انتظام کو سیاسی مصلحت کے مطابق شکل دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ بادشاہ اور امرا صرف سیاسی نہیں بلکہ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے مختار بن گئے، اور دوسری طرف سے مہاجنوں اور بڑے تاجروں کے سوا ہر قسم کے لوگوں نے اپنی پرورش کی ذمہ داری اصولاً اور عملاً بادشاہ اور امرا پر ڈال دی۔ جب تک حاکموں کو اپنے فرائض کا احساس تھا اور ان میں اتنی قوت اور صلاحیت تھی کہ اپنے فرائض کو انجام دے سکیں، ان کے اخلاقی عیب زوال کا سبب نہیں بنے، جب قوت اور صلاحیتوں میں بہت کمی ہوگئی تو یہی عیب انھیں لے ڈوبے، طبی نقطۂ نظر سے جوانی اور بڑھاپے کے نزلہ زکام میں کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن جس مرض کو جوان نظر انداز کرتا ہے وہ بوڑھے کو بستر پر لٹا دیتا ہے حاکموں کو زوال ہوا تو وہ لوگ جوان کے متعلقین میں شمار ہوتے تھے مرض کے جراثیم بن گئے اور اسے بڑھاتے رہے۔

"مرقع دہلی" شاید ہمیں ایسے ہی ایک عمر رسیدہ اور جراثیم زدہ معاشرہ کا نقشہ دکھاتا ہے۔

غزل

حضرت روش صدیقی

کیا ستم کر گئی اے دوست، تری چشمِ کرم
جیسے تیرے نہیں، دنیا کے گنہگار ہیں ہم
کوئی عالم ہو بہر حال گذر جاتا ہے
ہم نہ سرگشتۂ راحت ہیں نہ آشفتۂ غم
تری زلفوں کی گھنی چھاؤں، بہت دور سہی
جادہ پیما ہیں، حوادث کی کڑی دھوپ ہیں ہم
نکہتِ گُل سے کچھ اس طرح ملاقات ہوئی
یاد آیا تری بیگانہ وشی کا عالم
ہم ہیں، طوفاں ملامت ہے، گلی ہے تیری
حُسن تقدیر سے ہوتے ہیں یہ حالات بہم
لے گیا عشق کسی شاہدِ نادیدہ تک
مدتوں ذوقِ پرستش نے تراشے تھے صنم
ہم نے ہر عقدۂ دشوار کا منہ چوم لیا
کتنے دل کش ہیں تری زلفِ گرہ گیر کے خم
کوئے قاتل ہی سہی منزلِ راحت نہ سہی
تھک کے بیٹھے ہیں کہ آئے ہیں بہت دور سے ہم
کوئے جاناں میں کہیں آج تو ہم بھی تھے روشؔ
شکر ہے ہم کو نہ پہچان سکے دیر و حرم

ڈاکٹر غلام یزدانی

جناب سید غلام ربانی

ڈاکٹر غلام یزدانی ملک کے اُن گنے چنے بزرگوں میں سے تھے جن کو زندگی میں لافانی شہرت حاصل ہو جاتی ہے علم و فضل کی دنیا میں وہ جس مقام پر پہنچ گئے تھے، اس پر اخیر تک جمے رہے، کوئی ان کو وہاں سے نہ ہٹا سکا۔ اب آئندہ کے مورخ اور تنقید نگار اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ علم الاثار کی دنیا میں وہ جس بلندی پر پہنچ گئے تھے، وہاں کوئی ہندوستانی پہنچا ہے یا نہیں؟

میں نے پہلی بار مرحوم کو دلّی کے قدسیہ باغ میں کرکٹ کھیلتے دیکھا تھا، وہ فٹ بال بھی کھیلتے تھے، یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے، اس وقت آپ سینٹ سٹیفنز کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ کرکٹ کا شوق آپ کو شروع سے تھا اور کالج کی ٹیم کے اسپن بولر تھے، ان دنوں کالج کے فاسٹ بولر فرحت اللہ بیگ مرحوم تھے جو ململ کا کرتا اور اک برا ڈھیلا پاجامہ پہنے ننگے سر اور ننگے پاؤں بولنگ کرتے تھے۔ سی۔ ایف۔ اینڈروس اور آپ اسپن بولر تھے۔ جینڈ گز کا اسٹارٹ لیتے تھے۔ عینک اس وقت بھی لگی رہتی تھی اس زمانہ میں کرکٹ کے آداب کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ آپ کھیل کے میدان میں باریک ململ کا کرتہ پہنے رہتے تھے، اب اسے قدامت پسندی کہیئے یا وضع داری، کرتے کو آپ نے اخیر تک نہیں چھوڑا۔ قمیص صرف سوٹ پر پہنتے تھے، ورنہ شروانی کے نیچے ہمیشہ کرتا ہی ہوا کرتا تھا۔ کرتا پرانی وضع کا کلی دار ہوتا تھا، جسم اکہرا تھا جو آخر تک اس حالت میں قائم رہا۔ روزمرہ کے معمول میں بڑی باقاعدگی تھی، آپ کی صحت بہت اچھی تھی، بیمار بہت کم ہوتے تھے۔

آپ دلّی کے ایک معزز اور قدیم خاندان سے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے سینٹ سٹیفنز کالج سے بی اے پاس کیا اور انگریزی اور عربی میں یونیورسٹی میں اوّل آئے، کئی طلائی تمغے حاصل کئے۔

ایم اے کلکتہ یونیورسٹی سے کیا۔ شروع میں آپ مشن کالج دہلی میں فارسی کے پروفیسر ہوئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج راج شاہی میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔ اس زمانے میں حکومت پنجاب کو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہوئی جو علوم شرقیہ کے ساتھ انگریزی میں بھی کامل مہارت رکھتے ہوں۔ چنانچہ بنگال سے آپ کو پنجاب بلا لیا گیا۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔

لاہور ہمیشہ سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی کے سامنے آپ نے "جہاں آرا" پر مضمون پڑھا۔ انگریزی میں یہ آپ کا پہلا مقالہ تھا[1] جو بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا تھا، اس سے انگریز صاحبان بہت متاثر ہوئے، چنانچہ سر ایڈورڈ میکلیگن (گورنر پنجاب) اور سر جان ٹومسن کی معیت میں آپ نے پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی یہ ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ انہی دنوں حیدرآباد میں محکمہ آثار قدیمہ کا قیام عمل میں آیا اور سر جان مارشل (ڈائرکٹر جنرل آف آرکیولوجی) کے مشورہ سے آپ یہاں کے ناظم مقرر ہوئے۔

ریاست حیدرآباد آثار قدیمہ سے مالامال تھی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم یادگاروں کی کثرت نوعیت اور عظمت کے لحاظ سے یہ ریاست دنیا کے کسی خطہ سے کم نہ تھی۔ یہاں ہجری عہد سے لے کر انسانی تہذیب کے ہر دور کی یادگاریں موجود ہیں، جن کی تلاش اور تحقیق، پیمائش اور مطالعہ میں آپ کو سخت محنت اور مشقت اٹھانی پڑی۔ آثار قدیمہ کا مزاج کچھ ویرانی پسند ہے ان کا ٹھکانا لق و دق میدان، ویران جنگل اور پہاڑ ہوتے ہیں۔ چنانچہ دشوار گزار راستوں میں اکثر جگہ میلوں پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ان سنسان مقامات میں پھرنا اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا آپ کی عادت ہوگئی تھی۔

اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس کو آپ نے ہنس ہنس کر سنایا تھا میں اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں غار ہائے پیتل کھورا[2]

---

[1] یہ مقالہ جہاں آرا کے نام سے کتاب کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ جناب ضیاء الدین برنی نے کیا ہے جو اردو اکاڈمی سندھ، کراچی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ [2] پیتل کھورا کے غار اورنگ آباد

(باقی نوٹ اگلے صفحے پر)

کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے، جب میں پہلی بار ان غاروں کو دیکھنے گیا تو اورنگ آباد سے مولوی صاحب (بابائے اردو) بھی ساتھ ہو لئے۔ کنسٹر (ضلع اورنگ آباد) تک تو پختہ سڑک تھی، اس کے بعد پہاڑی راستہ شروع ہوا۔ کئی گھنٹے پیدل چلنے کے بعد ہم دونوں غاروں میں پہنچے، یہ پُر فضا مقام مولوی صاحب کو بہت پسند آیا، کہنے لگے تھکان کا بدلہ تو مل گیا مگر بھائی صاحب مجھے بھوک لگ رہی ہے" میرے پاس کچھ سنترے تھے، وہ دئے تو کہنے لگے، بھلا ان سنتروں سے پیٹ بھرتا ہے، وہ بھوک سے کچے تھے، بے چین ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے ایک جگہ ان کو کپڑے میں کچھ بندھا ہوا دکھائی دیا۔ انھوں نے اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا تو اس میں دو تین جوار کے روٹ تھے اور ان پر چٹنی رکھی ہوئی تھی مولوی صاحب بے تکلف اس طرح کھائے گئے جیسے کوئی شیرمال کھا رہا ہو۔ یہ روٹیاں ایک بھیل کی تھیں جو ان غاروں کا چوکیدار تھا۔

چند سال کی محنت کے بعد آپ نے مشکلات پر قابو پا لیا اور یہاں کے آثار کی وہ صورت نکلی کہ دنیا بھر کے اہل علم اور صاحبان فن ان کے دیکھنے کی تمنا کرنے لگے۔

ان دنوں حیدر آباد میں یہ دستور تھا کہ یہاں کے مختلف محکموں کے عہدہ دار ٹریننگ کے لئے برطانوی ہند بھیجے جاتے تھے لیکن یہاں کے سررشتہ آثار قدیمہ کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ خود برطانوی ہند کے عہدہ دار ٹریننگ کے لئے یہاں بھیجے جاتے تھے۔ یہی حال آثار کے تحفظ اور نگہداشت کا تھا۔ بیرونی سیاح ان کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ جسٹس EDGLAY (ایجلے[۱]) لکھتے ہیں:

(بسلسلہ صفحہ سابق) کی شمالی سرحد پر اجنتا کی طرح یہاں بھی تصویریں ہیں۔ جن میں بابلی اور اشوری اثر جھلکتا ہے۔

[۱] ایجلے (EDGLAY) کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ آثار قدیمہ سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ سر پرسی براؤن نے اپنی مشہور کتاب INDIAN ARCHETECTURE کی تالیف میں ان کی مدد کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

"...... ریاست حیدر آباد کا سب سے چھوٹا محکمہ غالباً "آثار قدیمہ" ہے لیکن مجھے یہ سررشتہ یہاں کے سب محکموں سے بڑا نظر آیا۔ آثار کا تحفظ اور نگہداشت یہاں جس سلیقہ سے ہوتی ہے برطانوی ہند میں نہیں ہوتی۔ کیا اچھا ہو کہ حکومت ہند اپنے تمام آثار کو نظام گورنمنٹ کی نگرانی میں دے دے کیونکہ یہاں کا محکمہ قدیم یادگاروں کو اچھی حالت میں رکھنا چاہتا ہے ....."

ڈاکٹر غلام یزدانی خاموش کام کرنے والوں میں تھے۔ مزاج میں سادگی تھی، نمود اور نمائش سے بچتے تھے۔ محنت بہت کرتے تھے، جس کام کو اٹھاتے اس کو بڑی مستعدی اور سرگرمی سے پورا کرتے تھے۔ فرض شناسی ان کا ایمان تھی، ایک نمازی کی طرح اپنے فرض کو قضا نہیں ہونے دیتے تھے۔ دل میں قومی درد اس درجہ تھا کہ جب کبھی اسلاف کے کارناموں کا ذکر آجاتا تو بے اختیار آبدیدہ ہوجاتے تھے۔ حکومت ہند نے ان کی بڑی قدر کی اور اب کی او، بی، ای کا خطاب دیا۔ جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ آخر میں بھارت سرکار نے پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

دنیا کی ہر قوم کو اپنی گزشتہ تہذیب پر ناز ہوتا ہے اور وہ اپنے اسلاف کے کارنامے معلوم کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے علم الآثار میں بہت ترقی ہوئی ہے چنانچہ 'ہند قدیم' کی تاریخ زیادہ تر اسی علم کے ماہروں کی کوششوں سے مدون ہوئی ہے۔ قومی تمدن میں انسانی زندگی کے بہت سے پہلو شامل ہیں۔ اس لئے علم الآثار کے شعبے بھی بہت ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی نے قریب قریب تمام شعبوں میں کام کیا، لکچر دئے اور ان پر کتابیں لکھیں جن کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے۔

مانڈو

سرسبز پہاڑوں اور خوب صورت جھیلوں سے گھرا ہوا مانڈو شاہان مالوہ کا پایہ تخت تھا، یہ شہر بندھیاچل کی گود میں پلا تھا جس نے اپنی ساری رعنائیاں یہاں لاکر رکھ دی تھیں۔ مہاراجہ دھار کی خواہش تھی کہ مانڈو پر ایک کتاب لکھوائی جائے۔ سرجان مارشل نے لکھنے کا وعدہ کیا تھا مگر کسی وجہ سے وہ نہ لکھ سکے۔ اس زمانہ میں سر ریجنالڈ گلانسی جو حیدرآباد میں وزیر مالیات

رہ چکے تھے، اندور میں ایجنٹ گورنر جنرل ہو کر آئے وہ آپ کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے مہاراجہ دھار کے ایما سے نظام گورنمنٹ کو لکھا کہ وہ یزدانی صاحب سے مانڈو پر کتاب لکھوانی چاہتے ہیں چنانچہ حکومت حیدرآباد کی اجازت سے آپ مانڈو گئے۔ یہاں کے آثار بہت بڑے رقبہ پر پھیلے ہوئے تھے جن میں بہت سے محل، ایوان، برج، بارہ دری، دروازے، مسجدیں، مقبرے اور دوسری عمارتیں تھیں، آپ نے ان سب کا مطالعہ کیا، تصویریں تیار کرائیں، نقشے کھنچوائے اور "مانڈو" "THE CITY OF JOY" کے نام سے کتاب لکھی۔ ہرچند یہ ایک فنی کتاب ہے مگر آپ کا بیان اس قدر دلچسپ اور انداز اتنا دلفریب ہے کہ پڑھنے والے کی نظروں میں اس اجڑی نگری کی گزشتہ عظمت کا سماں پھر جاتا ہے۔ آثار کے ساتھ ان کے تاریخی پس منظر بھی بیان کئے ہیں، چنانچہ آخری عمارتوں کے ذکر میں باز بہادر، اور روپامتی کے عشق کی داستان ہے۔ یہ وہی حزینہ ہے جس کے درد بھرے گیت آج بھی مالوے میں سنائی دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں آپ کی یہ پہلی کتاب تھی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

مانڈو کی تصنیف سے آپ کے جوہر کھلے۔ اس کتاب کی عالمی شہرت کو دیکھ کر حیدرآباد کی حکومت کو خیال ہوا کہ آپ سے اجنٹہ پر کتاب لکھوائی جائے، اس طرح حکومت کی خواہش سے آپ اس یادگاری کتاب کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔

اجنٹہ کی تصویریں جو دو ہزار برس سے زمانہ کا مقابلہ کر رہی تھیں، تھک کر چور ہو گئی تھیں اور خستگی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ لگانے سے ریزہ ریزہ ہوئی جاتی تھیں۔ حیدرآباد میں سررشتہ آثار قدیمہ کے قیام سے پہلے ان کے تحفظ کا انتظام صوبہ بمبئی سے متعلق تھا۔ اس زمانہ میں نگرانی کا یہ حال تھا کہ لوگ ان تصویروں کی پیڑیاں کھرچ کھرچ کر لے جاتے تھے۔ ایک انگریز تصویر کا ایک ٹکڑا لندن لے گیا تھا وہاں وہ ایک ہزار پونڈ میں فروخت ہوا۔ تصویر کا یہ ٹکڑا اس وقت بوسٹن (امریکہ) کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

اجنٹہ کی تصویروں کے تحفظ کی داستان بہت طویل ہے ان کی درستی میں بڑی احتیاط

برتی گئی ہے۔ اس کام پر جس فراخ دلی سے خرچ ہوا ہے، اس کا اندازہ ان دو اطالوی کی تنخواہوں سے لگایا جا سکتا ہے جو تصویروں کی درستی اور صفائی کے لئے بلائے گئے تھے۔ ان کی تنخواہ چھ ہزار ماہانہ تھی۔ خورد نوش، سواری، ریل، اور جہاز کے کرایہ کے اخراجات سب حکومت کے ذمہ تھے، ان کی جسمانی آسائش کے علاوہ روحانی میلان کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ اس کے لئے اطالوی مشن کے ایک پادری کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اجنٹہ میں انھوں نے دو موسم سرما گزارے۔ تصویروں کے تحفظ کے لئے انھوں نے ایک کیمیاوی عمل تجویز کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوا، اس سے تصویروں کی عمر میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کئی سال کی محنت کے بعد کتاب اجنٹہ کی پہلی جلد شائع ہوئی جس نے علم و فن کی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان اور مغربی ملکوں کے علمی اور فنی رسالوں میں اس پر جو تبصرے ہوئے ہیں ان میں سے ایک دو کو بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا۔

برلنگٹن میگزین لندن نے مئی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں اس کتاب کی بہت تعریف کی اس کے اقتباس کا کچھ حصہ پیش ہے:

"...... اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی ان مشہور تصاویر کا بیان اگرچہ پہلے شائع ہو گیا ہے اور حال میں مسٹر گریفتھ (GREFITH) اور لیڈی ہیرنگھم کی کتابوں میں نقول بھی نہایت خوبی سے چھاپی گئی ہیں لیکن ان سب کی بنیاد دستی نقول پر ہے، کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی ماہر ہو، صحت کے لحاظ سے فوٹو کا مقابلہ نہیں کر سکتا موجودہ کتاب کی شاندار تصاویر کا جب پہلی تالیفات کی تصاویر سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو لیڈی ہیرنگھم کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اصلی تصاویر کے فنی محاسن ایسے محکم اور مکمل ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کو خاطر خواہ نقل نہ کر سکا۔ ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کی شاہانہ فیاضی اور شوق کا شکر کرنا چاہیئے کہ ایشیا کے ان عجوبہ روزگار تصاویر کی نقول کی تیاری میں موجودہ زمانے کے علم و کمال سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اب صحیح اور مکمل شائع ہو گئیں....."

رسالہ انڈین انٹی کیوری (INDIAN ANTIQUARY) اگست ۱۹۳۱ء کی اشاعت

میں اس کتاب کی بڑی لمبی چوڑی تعریف کی گئی ہے۔ اور آخر میں ان لفظوں پر ختم کیا ہے:

"........ دنیائے فن اعلیٰ حضرت کی فیاضی اور سرپرستی اور ان کے قابل وزیر مالیات سر اکبر حیدری کی تدبیر کی رہین منت ہے کہ یہ عظیم الشان کارنامہ اس خوش اسلوبی سے شائع ہوگیا ہے......"

لندن ٹائمز اور نیویارک ٹائمز نے بھی اس کتاب پر تبصرے کئے تھے، فرانس کی ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اس کو بہت سراہا ہے۔

کتاب "اجنٹہ" چار جلدوں پر مشتمل ہے جن کی تیاری میں کوئی دو لاکھ کی لاگت آئی۔ سررشتے نے یہ رقم حکومت سے قرض لی تھی۔ چنانچہ اس کی فروخت سے قرضہ تقریباً بے باق ہوگیا ہے اور بہت بڑی مالیت کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس مقام پر یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس کتاب کے خریدار ہندوستان میں سو بھی نہیں نکل سکے۔ کتاب کا قرض مغربی ملکوں کے قدردانوں کے شوق سے ادا ہوا ہے۔ کتاب لکھنے سے پہلے اس کے مصنف کا یہ اندازہ لگانا، کہ اس کی تصنیف کس پایہ کی ہوگی، آسان نہیں ہے مگر آپ کو اپنے اوپر اعتماد تھا اور اس یقین کے ساتھ لکھنا شروع کیا کہ اس کتاب کی عالمگیر شہرت ہوگی۔[1]

بیدر

دکن کے تاریخی شہروں میں بیدر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کی عمارتیں اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں ایک مقام رکھتی ہیں جن سے بہمنی فرمانرواؤں کی سطوت اور جلال ٹپکتا ہے مدرسہ محمود گاواں ہندوستان میں اپنی وضع کی ایک ہی عمارت ہے۔ بہمنی دور میں ایران کے اہل علم اور صاحبان فن اس کثرت سے جمع ہوگئے تھے کہ یہاں کی تہذیب میں ایرانی اثر سرایت کرگیا۔ چنانچہ اس عہد میں جو عمارتیں تیار ہوئیں، ان میں ایرانی طرز تعمیر نمایاں تھا۔ اس زمانہ میں بیدر ایران کا ایک ٹکڑا معلوم

---

[1] کتاب اجنٹہ کی قیمت چھ سو (۶۰۰) روپے ہے۔ ڈائرکٹر آف پبلی کیشن حیدرآباد کے دفتر سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

ہوتا تھا لیکن زمانہ کسی کی عظمت یا خوبصورتی کا لحاظ نہیں کرتا، شاہی خاندانوں کے زوال اور جنگی محاصروں کے بھونچالوں نے ان شاندار عمارتوں کو ایسا تباہ کیا کہ ملبے کے ڈھیر اور ٹوٹی پھوٹی دیوار کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ سررشتہ نے قلعہ کی صفائی کرادی اور زمین میں دبے ہوئے آثار کو برآمد کرکے ان کا تحفظ کیا۔ کئی سال کی محنت اور کاوش کے بعد آپ نے بیدر کے آثار پر کتاب لکھی جس میں ڈیڑھ سو سے زیادہ نقشے اور تصویریں ہیں۔ یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی اور کتاب اجنٹہ کی طرح اس کو بھی عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اعلیٰ حضرت نے اس کو اپنی خاص سرپرستی میں شائع کرانے کی اجازت عطا فرمائی۔ چنانچہ کتاب کی جلد پر شاہی نشان (CREST) بطور امتیاز ثبت ہے[۱]۔ آپ کا ارادہ تھا کہ کتاب بیدر کی طرح گلبرگہ اور حیدرآباد پر بھی کتابیں لکھیں مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اپی گریفیا انڈو مسلمکا

حکومت ہند کی جانب سے اپی گریفیا انڈو مسلمکا کے نام سے جو جرنل نکلتا تھا اس میں ہندوستان کے اسلامی کتبات چھپتے تھے۔ ڈاکٹر غلام یزدانی نے ۲۸ برس اس رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ قدیم کتبوں کا پڑھنا بڑی دیدہ ریزی اور پتہ ماری کا کام ہے اور مسخ شدہ کتبوں کی تعبیر کے لئے بڑی ذہانت کی ضرورت ہے اس جرنل میں ایک آدھ مضمون کسی دوسرے کا ہوتا تھا ورنہ باقی تمام رسالہ آپ ہی کے قلم کی پیداوار ہوتا تھا۔ تاریخ کی تدوین میں کتبوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ آپ نے بعض ایسے کتبے شائع کئے ہیں جن سے بعض بڑی غلطیاں دور ہو گئی ہیں مثلاً گولکنڈہ کی جامع مسجد کے دروازہ پر ایک کتبہ ہے جس سے ظاہر ہوا کہ فرشتہ نے قطب شاہی خاندان کے بانی کی تخت نشینی کا سن صحیح نہیں لکھا ہے ـــــ اسی طرح محمد تغلق دکن کی مہم کے دوران میں جہاں جہاں گیا اس کا ذکر مستند اول تاریخوں میں نہیں ہے۔ آپ نے کتبوں کے ذریعہ ان مقامات کا پتہ لگایا۔ سکوں کے مطالعہ سے آپ نے دکن میں بہت سی نئی

---

[۱] کتاب بیدر کی قیمت اسی روپے (۸۰) ہے۔ ڈائرکٹر آف پبلی کیشن حیدرآباد کے دفتر سے مل سکتی ہے۔

دارالضرب کا بھی پتہ لگایا۔ ان سب باتوں کا حال سررشتہ کی رپورٹوں میں موجود ہے۔ قدیم کتبے تاریخی واقعات کے علاوہ اپنے زمانہ کے ادبی ذوق کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کتبہ نگار پہلے ہی سے سمجھ لیتا تھا کہ وہ ایک یادگاری چیز لکھ رہا ہے۔ کوئی چھ سال ہوئے راقم نے "کتبات اور شاعری" کے عنوان سے ایک مقالہ اردو مجلس کے ایک اجلاس میں پڑھا تھا، اس میں کتبوں کی اعلیٰ شاعری کے کچھ نمونے پیش کیے تھے[1] یزدانی صاحب کی سبکدوشی کے بعد یہ جرنل علیحدہ چھپنا بند ہو گیا اور اب اسلامی کتبات ایپی گرافیا انڈکا کے ضمیمے کے طور پر چھپتے ہیں۔

ڈاکٹر یزدانی اپنے سررشتہ کی جو سالانہ رپورٹ شائع کرتے تھے، اس کی شان بھی نرالی ہوتی تھی۔ یہ درست ہے محکموں کی رپورٹوں کی طرح سال بھر کی کارگزاری، نظم و نسق اعداد و شمار یا جمع و خرچ کا گوشوارہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ علم الآثار کے مختلف شعبوں پر تحقیقی رسالے ہوتے تھے جن میں طالب علموں کے لئے مفید مواد موجود ہوتا تھا۔ یورپ کے نامور مصنفین اپنی کتابوں میں ان رپورٹوں کے حوالے درج کرتے تھے۔ سررشتہ کی طرف سے مسکی، پٹن کونڈاپور، حیدرآباد، رائے گیر وغیرہ مختلف مقامات پر جو کھدائیاں ہوئیں، ان میں قدیم سکے ہانڈیاں، مٹکے، گولیں، مٹی کی مورتیں، کھلونے، منکے، مہریں، ہاتھی دانت اور سنکھ کے زیورات، عمارتوں کے آثار، پختہ اینٹیں، صحری آلات وغیرہ بہت سی چیزیں برآمد ہوئیں۔ یہ اثری باقیات زبان حال سے اپنی بیتی سناتے ہیں جس کو سمجھنے والے سمجھتے ہیں، ڈاکٹر یزدانی ان کی زبان سے واقف تھے۔ چنانچہ رپورٹوں میں ان سب چیزوں کا حال درج ہے۔

یورپ اور امریکہ میں ان رپورٹوں کی بڑی قدر تھی کرن انسٹی ٹیوٹ لیڈن (ہالینڈ) سے ایک ضخیم ششماہی جرنل (BIBLIOGRAPHY OF INDIAN ARCH-AEOLOGY) کے نام سے شائع ہوتا ہے، اس میں ہندوستان کی علمی کتابوں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ آپ کی رپورٹ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس جرنل میں سب سے

---

[1] یہ مضمون رسالہ اردو کراچی اور صبا، حیدرآباد میں چھپ چکا ہے۔

پہلے حیدرآباد کے سررشتہ آثار قدیمہ کی رپورٹ کا حال درج ہوتا تھا۔

لکچر

اسلامی فن تعمیر کے مطالعہ کے لئے آپ نے ایران، عراق، شام، لبنان، فلسطین، حجاز، مصر، ٹیونس الجیریا، مراکش اور اسپین کا سفر کیا اور وہاں کی قدیم عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھا، کئی بار انگلستان کا بھی سفر کیا، جب آپ لندن پہنچتے تو وہاں کے علمی اداروں کی درخواست پر آپ کے لکچر ہوتے تھے چنانچہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے آپ نے BUDHIST ART OF PAINTINGS بودھی عہد کی نقاشی پر جو لکچر دیا وہ رنگین تصویروں کے ساتھ کتاب کی صورت میں شائع ہوگیا ہے، اس میں بودھی عہد کی نقاشی کی خصوصیات اور محاسن بیان کئے گئے ہیں۔

انڈیا سوسائٹی کے سامنے RACKHENN TEMPLES OF AURANGABAD یعنی غارہائے اورنگ آباد پر جو لکچر دیا تھا وہ بھی رسالہ کی صورت میں چھپ گیا ہے، یہ غار بودھی عہد کے ہیں ان میں بت تراشی کے بعض اعلیٰ قسم کے نمونے ہیں جن کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اجنٹہ کی نقاشی

اورنگ آباد کے یوم کالیہ کے موقع پر "اجنٹہ کی نقاشی" کے نام سے آپ کا لٹرن لکچر ہوا تھا وہ بہت مقبول ہوا، اردو زبان میں آرٹ کے محاسن، فنی خصوصیات اور نزاکتیں بیان کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ بیان بہت شگفتہ ہے اس میں سلاست اور روانی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ فنون لطیفہ کی اصطلاحوں کے روڑوں سے پاک ہے۔ یہ لکچر کچھ اضافہ کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھپ گیا ہے۔ اس میں رنگین تصویریں ہیں، کتاب کا متن حیدرآباد کے مشہور خوش نویس جابر صاحب کا لکھا ہوا ہے جس کو میونخ (جرمنی) کے مشہور مطبع برکمان میں پلیٹوں کے ذریعہ طبع کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور اب نایاب ہوگئی ہے۔ اس کا ترجمہ مرہٹی زبان میں ہوچکا ہے۔

ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک نظر

یہ بھی ایک فانوسی لکچر ہے جو اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں ہوا تھا۔ یہ بھی تصویروں کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھپ گئی ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ملک کے کونے کونے سے

اس کی داد دی گئی۔ اس کے پہلے حصہ میں بودھ، جین اور برہمنی مذہب کی عبادت گاہوں کا بیان ہے، دوسرے میں اسلامی مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں کا ذکر ہے۔ مسلمان جب یہاں پہنچے، اس وقت دنیا کا بہت بڑا حصہ ان کے زیر نگیں آچکا تھا اور تمام مفتوحہ ملکوں میں مختلف وضع کی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ لیکن ہندوستان میں اس فن کو بہت ترقی ہوئی۔ چنانچہ جتنی خوبصورت اسلامی عمارتیں ہندوستان میں ہیں، کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں، یہ کتاب ہے تو مختصر سی مگر اس میں فن تعمیر کی عہد بہ عہد کی تبدیلیوں اور تدریجی ترقی کا حال بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے[1]۔ کتاب کے شروع میں اکادمی کے ناظم ڈاکٹر سید عابد حسین کا دیباچہ ہے جو ہے تو مختصر مگر بہت ہی پاکیزہ ہے۔

دکن کی زمانہ ماقبل تاریخ کی یادگاریں

یہ آپ کی ایک ریڈیائی تقریر ہے جو دکن ریڈیو سے نشر ہوئی تھی۔ اس میں تاریخی زمانہ سے ہزاروں برس پہلے کی قبروں کا حال ہے، اس قسم کی قبروں کا سلسلہ ہندوستان سے باہر ایک طرف ایران سے گزرتا ہوا مغربی یورپ میں اسپین، فرانس اور انگلستان تک چلا گیا ہے اس طرح ہندوستان کے شمالی ملکوں میں وسط ایشیا سے لے کر سائبیریا پہنچتا ہے، ان دور دراز ملکوں میں قبروں کی بیرونی ہیئت اور ان کے اندر کا سامان ہر جگہ ایک سا ہے۔ علم الآثار میں "قدیم قبور" ایک مستقل شعبہ ہے جس پر بہت کچھ تحقیقاتی کام ہوا ہے اور اس سے مفید نتیجے نکلے ہیں۔ شمالی ہند میں اس قسم کی کوئی قبر موجود نہیں ہے لیکن دکن میں اضلاع کریم نگر، ورنگل، نلگنڈہ، محبوب نگر، رائچور اور گلبرگہ میں مختلف مقامات پر بے شمار قبریں موجود ہیں۔ چنانچہ سررشتہ نے کوہ مولا اور حشمت پیٹھ (نواح حیدر آباد) میں دو ایک قبروں کو کھولا بھی ہے۔ یہ تقریر بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے جس کو تصویروں کے ساتھ رسالے کی صورت میں شائع کردیا گیا ہے۔

کھدائیوں میں قدیم زمانے کی جو ہانڈیاں، گھڑے یا مٹکے نکلتے ہیں، ان پر کچھ علامات ہوتی ہیں، اس قسم کی نشانیاں دنیا بھر کی قدیم قبور کے ظروف پر پائی گئی ہیں ڈاکٹر یزدانی نے جو

---

[1] "ہندوستان کے آثار قدیمہ" یہ رسالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کی طرف سے چھپا ہے۔

نشانیاں ان برآمد کئے ہوئے برتنوں پر دریافت کی تھیں، ان کو بعض علماء نے ہندوستان کے برہمی رسم خط کا ماخذ تسلیم کرلیا ہے۔ اسی قسم کے نشانات موہن جداڑو (MOHAN JO DARO) میں بھی دریافت ہوئے ہیں لیکن آپ نے بہت پہلے، ۱۹۱۶ء میں رائے گیر (ضلع ورنگل) کی قبور کے ظروف کے نشانات کا نقشہ شائع کردیا تھا اور ان کی مماثلت بعض برہمی حروف سے ثابت کردی تھی جو بحیرۂ روم کے جزائر مصر اور شمالی افریقہ میں زمانہ قدیم سے رائج تھے ڈاکٹر یزدانی کا یہ انکشاف بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

شاہ جہاں نامہ کی تہذیب

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی درخواست پر آپ نے شاہ جہاں نامہ مصنفہ محمد صالح کنبوہ کو ایڈٹ کیا، اس کی چار جلدیں ٹائپ میں چھپی ہیں۔ شروع میں آپ کا ایک مبسوط مقدمہ فارسی زبان میں ہے۔

مثنوی مولانا روم

اس مشہور مثنوی کا ایک نادر قلمی نسخہ آپ کو دستیاب ہوا۔ اس کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ آپ کو اس قدر بھایا کہ آپ نے پوری کتاب کو بلیٹوں کے ذریعہ جرمنی میں چھپوا دیا۔ اس پر بھی اردو اور انگریزی میں آپ کا ایک دلچسپ مقدمہ ہے ـــــ فارسی سے آپ کو خاص شغف تھا پندرہ برس سے حیدرآباد کی مجلس مخطوطات فارسیہ کی معتمدی کے فرائض اعزازی طور پر انجام فرماتے رہے۔ اس مجلس نے فارسی کی بعض ایسی نایاب کتابیں چھاپی ہیں جن کا وجود دنیا کے کسی کتب خانہ میں نہیں تھا۔

آرکیولوجیکل سوسائٹی کا جرنل

محکمہ آثار قدیمہ کے قیام کے بعد حیدرآباد میں لوگوں کو علم الآثار سے دلچسپی ہوگئی تھی چنانچہ ایک انجمن (ARCHAEOLOGICAL SOCIETY) کے نام سے قائم ہوئی، کچھ دن بعد اس سوسائٹی کا ایک جرنل جاری ہوا، اس کے ایڈیٹر بھی آپ ہی تھے، اس جرنل میں بہت بلند پایہ مضامین ہوتے تھے رسالہ کا معیار کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے مضمون نگار سرجان مارشل ڈاکٹر غلام یزدانی، سر ڈونالڈ

سرکار، ڈاکٹر ہنٹ اور اسی پایہ کے حضرات تھے۔

دکھنی آرٹ

ہندوستانی اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے آپ سے خواہش کی تھی کہ آپ الہ آباد جا کر ادارہ میں دکھنی آرٹ پر لکچروں کا سلسلہ شروع کریں اور ان میں ملک کے فنون لطیفہ کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ آپ نے اس دعوت کو قبول تو کر لیا مگر بعض مجبوریوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے الہ آباد نہ جا سکے۔ البتہ اتنا ہوا کہ آپ نے دو لکچروں کا مسودہ وہاں بھیج دیا اکیڈمی نے اس کو غنیمت سمجھا اور بڑی خوشی سے ان دونوں مقالوں کو تصویروں کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھاپ دیا۔ پہلی کتاب دکھنی آرٹ کے ابتدائی مسائل سے متعلق ہے۔ اس میں دکن میں فنون لطیفہ کی ابتدا، ان کی خصوصیات اور دوسرے ملکوں کے آرٹ سے ان کا تعلق بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ دوسرا مقالہ فن تعمیر پر ہے۔ اس میں گھاس پھونس کی جھونپڑیوں سے لے کر لکڑی کے مکانات اور اس کے بعد اینٹ پتھر کی عمارتوں کی تدریجی ترقی کا ذکر ہے۔ فن تعمیر کی ترقی میں مذہبی جوش کو بڑا دخل ہے ہر قوم نے اپنی عبادت گاہوں کو خوب صورت اور شاندار بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، دکن کے دیول اور مذہبی آثار خواہ وہ بودھ مت سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ جین یا برہمنی مذہب سے، فن تعمیر کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں۔ ان کی بعض خصوصیات کو سمجھنے میں مغربی نقادوں سے جو لغزشیں ہوئی ہیں ان کو بھی واضح کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں :

"..... دکن کی عبادت گاہوں کا مقابلہ جب دنیا کے اور ملکوں کے معابد سے کیا جاتا ہے تو کمال فن اور حسن تخیل اور جوش عقیدت کے لحاظ سے وہ کسی طرح کمتر نظر نہیں آتے۔ مثلاً کارلا کے چیتیا، ایلورا کے کیلاش ناتھ دہار کا مقابلہ یونان، روما، مصر، فلسطین کے شاندار سے شاندار معابد سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انگی اونڈھا اور ورنگل کے دیول بعض تعمیری خصوصیات کے لحاظ سے یورپ کے زمانہ کے قوطی طرز (GOTHIC STYLE) کے گرجوں پر فوقیت

رکھتے ہیں .....''

تاریخ دکن

۱۹۲۲ء میں کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی پہلی جلد شائع ہوئی، نوعیت کے لحاظ سے یہ ایک مثالی کتاب تھی جو انگلستان کے مورخوں، علماء، مستشرقین اور محققین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی مگر اس میں بعض امور ایسے بھی تھے جن سے ہمارے علماء کو اتفاق نہیں تھا اور ان کے جذبات اور قومی وقار کو ٹھیس لگتی تھی۔ چنانچہ ملک میں خیال پیدا ہوا کہ اسی نہج پر ہندوستان کی ایک جامع تاریخ ہندوستانی نقطۂ نظر سے مدون کی جائے۔ اس سلسلہ میں بھارتیہ اتیہاس پریشد، انڈین ہسٹری کانگریس اور علی گڑھ ہسٹاریکل سوسائٹی کی تجاویز قابل ذکر ہیں۔ ملک کی بعض جامعات کو بھی خیال ہوا کہ اپنے اپنے صوبہ کی تاریخ مرتب کریں۔ اس معاملہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی نے پہل کی اور اپنے صوبہ بنگال کی تاریخ شائع کی۔

حیدرآباد میں پروفیسر ہارون خاں شروانی اور علی یار خاں (نواب علی یاور جنگ) نے تاریخ دکن کی تدوین کے لئے حکومت کے سامنے تجویز پیش کی۔ اس زمانہ میں دوسری عالمگیر جنگ زوروں پر تھی، تجویز جھمیلے میں پڑ گئی مگر کچھ دن اور ڈاکٹر یزدانی نے سر اکبر حیدری صدر باب حکومت کی خدمت میں ایک نوٹ پیش کیا جس میں بیان کیا کہ ہندوستان کی مذہبی، معاشی سماجی اور ثقافتی زندگی میں دکن کا بڑا حصہ ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ دکن کی تاریخ کے لئے یہاں ہر قسم کا مواد کتبوں، اثری یادگاروں، تاریخوں، قدیم فرامین اور دستاویزوں کی شکل میں موجود ہے۔ سر اکبر نے علی شروانی تجویز کی اہمیت کو تسلیم کیا اور آخر کار حسب فرمان ضروری تاریخ دکن کی تیاری کی منظوری صادر ہوئی کونسل نے ڈاکٹر یزدانی کو پہلی جلد کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ قرون وسطیٰ اور برطانوی عہد کی متعلقہ جلدوں کے ایڈیٹر پروفیسر ہاروں خاں شروانی، اور نواب علی یاور جنگ مقرر کئے گئے۔

سالہا سال کی کوششوں کے بعد (HISTORY OF THE DECCAN (تاریخ دکن) کی پہلی جلد ڈاکٹر یزدانی کی ادارت میں شائع ہوئی اس کا آٹھواں باب جو فنون لطیفہ پر ہے، آپ ہی کا لکھا ہوا ہے، اس میں فن تعمیر، مجسمہ تراشی اور نقاشی کا بیان ہے۔ اور دکن کی مورتوں

اور نقاشی میں فن رقص کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا بھی دلچسپ بیان ہے۔

ابھی تاریخ دکن تیار نہیں ہوئی تھی کہ آپ کا یہ باب برسوں پہلے (FINE ARTS کے نام سے علیحدہ کتاب کی صورت میں چھپ گیا۔ اس میں فنون کی ابتدا ان کی ترقی اور تنزل کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

وطن پرستی کا جذبہ آپ میں اس درجہ تھا کہ ہندوستانی تہذیب کے خلاف کسی کا ایک حرف برداشت نہیں کرتے تھے۔ انگریزی راج میں یورپ کے مصنفوں کے قول حرف آخر کا حکم رکھتے تھے کسی کو ان کی تردید کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں کے فن مجسمہ سازی اور نقاشی کے بارہ میں یورپ کے ماہر طرح طرح کے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ کوئی ان میں یونانی اثر تلاش کرتا تھا۔ کسی کو ان میں اطالوی نقاشی کا روپ نظر آتا تھا۔ آپ نے اس قسم کے خیالات کو ملک کی توہین سمجھا۔ ان کی تردید کی اور بتایا کہ دو ہزار برس پہلے اٹلی میں فن نقاشی اجنتہ کی نقاشی کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔ بودھی ستوا پدما پانی کے بارہ میں کہا ہے کہ پندرھویں صدی تک اس تصویر کا جواب دنیا کے پردہ پر کہیں نہیں تھا۔ تاج محل کے نقشہ کو فادر فیر یکے وینس کے ایک مہندس کی دماغی پیداوار لکھدیا۔ اس پر آپ نے لکھا ہے کہ "خود روضہ کی ساخت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میں اس ملک کی صنعت اور کمال کا نمونہ ہوں۔ اس عمارت کا نقشہ وہی ہے جو ہمایوں اور خانخاناں کے مقبروں کا ہے۔ مینار ہمایوں کے مقبرہ میں نہیں ہیں لیکن اکبر کے مقبرہ میں، جو سکندرہ میں ہے، موجود ہیں۔ تبدیلی اتنی ہوئی ہے کہ دروازہ سے لے کر ان کو چبوترے پر نصب کر دیا ہے۔

سر جان مارشل کے چلے جانے کے چند سال بعد ہندوستان کا محکمہ آثار قدیمہ ملکی ماہرین کے ہاتھ میں آگیا۔ لیکن شاید ارباب حکومت کو گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ مشہور ماہر آثار قدیمہ سر لیونارڈ وولے (SIR LEONARD WOOLAY) کو مشورہ کے لئے طلب کیا گیا۔ سر لیونارڈ نے یہاں کے کاموں پر سخت نکتہ چینی کی اور اپنی رپورٹ میں یہاں تک ظاہر کر دیا کہ ہندوستان میں آرکیولوجی جاننے والے نہیں ہیں اور ناواقف لوگوں کے ہاتھوں میں یہاں کے آثار برباد ہو رہے ہیں۔ ملک کے

عالموں کو سر لیونارڈ کی اسی قسم کی باتیں ناگوار تو بہت گزریں مگر صبر کر کے خاموش بیٹھ رہے۔ انہی دنوں (۱۹۴۰ء میں) لاہور میں انڈین ہسٹری کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ آپ شعبہ آرکیولوجی کے صدر تھے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں آپ نے سر لیونارڈ وولے کے اعتراضوں کے جواب دیئے[۵۱] اور بیان کیا کہ وہ ہمارے عہدہ داروں کی قابلیت سمجھ نہیں سکے۔ ہندوستان کی آرکیولوجی جتنا ہم سمجھ سکتے ہیں، باہر والے نہیں سمجھ سکتے۔

اس زمانہ میں کے۔ این۔ ڈکشٹ ڈائرکٹر جنرل تھے۔ آنجہانی نے آپ کو جو خط لکھا اس میں شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ آپ نے ہمارے سررشتہ کی لاج رکھ لی۔

دوسرے سال (۱۹۴۱ء میں) جب حیدرآباد میں اورینٹل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں ڈکشٹ آنجہانی کے کاموں کو بہت سراہا[۵۲]۔ اور ان کو تفصیل سے بیان کیا۔ اس خطبہ میں محکمہ آثار قدیمہ کی تنظیم کے سلسلہ میں آپ نے ایک اسکیم پیش کی ہے۔

سر جان مارشل یہاں اپنا صحیح جانشین ڈاکٹر یزدانی ہی کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے انگلستان سے آپ کو خط لکھا کہ فرگسن (FERGUSSON) اور برجس (BURGESS) کی کتابیں اب پرانی ہوگئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم تم مل کر (HISTORY OF THE MONUMENTS OF INDIA) ہندوستان کے آثار پر ایک جامع کتاب لکھیں۔ شمالی ہند کا حال میں لکھوں گا اور جنوبی ہند کا حال آپ لکھیں۔ اس طرح ایک مستند کتاب تیار ہو جائے گی۔ حکومت نے اس تجویز کو بہت پسند کیا غرض کتاب کی تیاری کا کام شروع ہوا اور پہلی جلد کا مواد تیار ہوگیا۔ مگر کچھ دن بعد سر جان مارشل کی صحت نے جواب دے دیا اور یہ یادگاری بند ہوگیا۔

وظیفہ پر سبکدوشی سے چند سال پہلے آپ کو ڈائرکٹر جنرل کا عہدہ بھی پیش کیا گیا تھا مگر آپ کی وضع داری نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ آخری عمر میں حیدرآباد کی ملازمت چھوڑ کر دلی چلے

---

۵۱ آپ کا یہ صدارتی خطبہ کتابچہ کی صورت میں چھپ چکا ہے۔

۵۲ یہ خطبہ معلومات سے پر ہے۔ کتابچہ کی صورت میں چھپ چکا ہے۔

آپ نے زیادہ تر انگریزی میں لکھا ہے اردو میں کم لکھا ہے مگر جو رسالے اور مضمون آپ نے لکھے ہیں وہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ آپ کا بیان بہت شگفتہ اور دل نشین ہے اس میں روانی ہے اردو زبان کے مالک تھے۔ الفاظ کا انتخاب اور استعمال بڑی خوبی سے کرتے تھے۔ لفاظی کو ناپسند کرتے تھے۔ راقم نے ایک دن آپ سے عرض کیا کہ حساب یا الجبرا کی طرح آپ عبارت میں صرف اتنے ہی لفظ استعمال کرتے ہیں جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے "میاں یہ عادت اجنٹہ کی کتاب نے ڈال دی ہے۔ وہاں ایک ایک لفظ بڑی احتیاط سے لکھنا پڑتا ہے۔" آپ کی انشا پردازی کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ اردو میں کچھ اور زیادہ لکھتے تو بہت بڑے صاحب طرز ادیب ہوتے۔

خدا تمام اچھی چیزوں کو فروخت کرتا ہے، عزت، شہرت، عظمت وغیرہ سب کی قیمتیں مقرر ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی نے ان کو اپنی خداداد ذہانت، ذکاوت اور سخت محنت سے خریدا ہے۔ اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا خدا کی دین ہے۔ ترقی کے لئے آپ نے کسی کا سہارا پسند نہیں کیا۔ انسان نہیں رہتا، مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں۔ ان میں ایسے کام بھی ہوتے ہیں جو جانے والے کی یاد دلاتے ہیں۔ مرحوم کے علمی کارنامے ایسے ہی ہیں، ان کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھی جاتی اور ان کے کام کی یاد دلاتی ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہیں۔

"کتابیں جو چھپ نہ سکیں"

جناب عبد المجید قریشی

زمانے گذرتے دیر نہیں لگتی دس سال ہونے کو آئے لیکن یہ جیسے کل ہی کی بات ہے "فاران" کراچی کے اپریل ۱۹۵۳ء کے اس شمارے کے متعلق جو اس وقت میری نظروں کے سامنے میری میز پر پڑا ہوا ہے، مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اسے کس قدر جذباتی انداز میں مقامی بک سٹال سے خریدا تھا اور اس کا سبب وہ مضمون تھا جو اس میں "مشاہیر کے خطوط سید سلیمان ندوی کے نام" کے زیر عنوان شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں متحدہ ہندوستان کے متعدد عمائدین کے خطوط جو انھوں نے کبھی مولانا سید سلیمان ندوی کے نام تحریر فرمائے تھے شائع ہوئے تھے مکاتیب نگار حضرات میں علامہ اقبال، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد، نواب اسمٰعیل خاں۔ سر شفاعت احمد خاں۔ نواب صدر یار جنگ، مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید محمود۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مولانا احمد سعید دہلوی مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا عبید اللہ سندھی شامل ہیں مشاہیر ہند نے یہ تمام خطوط اُردو زبان میں تحریر فرمائے ہیں حتیٰ کہ گاندھی جی کا خط بھی اُردو میں ہے۔ ایک نادر و نایاب خط البتہ مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ براؤن کے قلم سے فارسی میں ہے۔ ان خطوط کے پیش لفظ میں "فاران" کے مدیر حضرت ماہر القادری نے یہ مسرت افزا خبر سنائی تھی کہ یہ اور ایسے ہی دوسرے خطوط عنقریب ایک مجموعے کی صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس اُسی سال نومبر کے مہینے میں سید صاحب وفات پا گئے اور مکاتیب کا یہ بیش بہا اور بے مثال ذخیرہ دس سال گذر جانے کے بعد بھی ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے صاحبزادے سید سلمان آجکل حیدرآباد (سندھ) یونیورسٹی میں ایک عہدہ جلیلہ پر فائز ہیں اور اُن کی معمولی سی توجہ ان غیر معمولی خطوط کو گوشۂ گمنامی سے باہر لانے میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

اللہ مغفرت فرمائے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دُنیائے علم و ادب پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ "سیرت النبیؐ" "سیرتِ عائشہؓ" "ارض القرآن" "نقوشِ سلیمانی" "عمر خیام" اور "یادِ رفتگاں" کے مصنف سے دل دادگانِ علم و ادب میں بھلا کون واقف نہیں۔ وفات سے کچھ عرصے پیشتر اُنھوں نے کراچی میں ایک ادارۂ نشر و اشاعت "مکتبۃ الشرق" کے نام سے قائم فرمایا تھا جس کے زیرِ اہتمام اُن کی ایک نہایت ہی بلند پایہ اور دل پذیر کتاب "بریدِ فرنگ" شائع ہوئی تھی۔ "بریدِ فرنگ" سید صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور چند دوسرے احباب کو تحریر فرمائے تھے جب مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سید حسین کے ہمراہ یورپ تشریف لے گئے تھے۔ سید صاحب نے ان خطوط کو کچھ ایسی ندرت اور جدت سے ترتیب دیا تھا کہ اُن کا حُسن نکھر آیا اور اُن میں دیارِ غرب کے ایک علمی ادبی اور سیاسی سفرنامہ کا لطف محسوس ہونے لگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات کا رنجدہ سانحہ اگر پیش نہ آتا تو امید تھی کہ "مشاہیر کے خطوط" بھی "بریدِ فرنگ" کی سی آب و تاب کے ساتھ اُنھی دنوں شائع ہوجاتے "فاران" کراچی کا یہ شمارہ جس کا ذکر اوپر ہوا کم و بیش دس سال سے میرے پاس محفوظ ہے کل جب یہ یکایک مجھے نظر پڑا تو جیسے کوئی بھولی بسری کہانی یاد آگئی۔ مجھے اپنی یادداشت پر کمال افسوس ہوا حالانکہ سید سلیمان صاحب کا تذکرہ اِس عرصے میں متعدد بار علمی اور ادبی محفلوں میں آیا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کی یاد میں جو خاص شمارہ "ریاض" کراچی نے شائع کیا تھا اُسے میں نے خریدا تھا۔ پھر "معارف" اعظم گڑھ کا "سید سلیمان نمبر" بھی میں نے منگایا لیکن "فاران" میں چھپنے والے یہ خطوط کچھ ایسے نظر سے بلکہ دل و دماغ سے اوجھل ہوئے کہ دس سال کے بعد اُن کی اہمیت اور افادیت کا احساس آج پھر تازہ ہوا ہے۔ میرے مطالعہ کی عمر بیس پچیس سال کے قریب ہے۔ اس عرصے میں جہاں میں نے مطبوعہ صورت میں اپنی پسندیدہ کتابوں کو فراموش نہ ہونے دیا وہاں میرا ذہن اپنے گوشوں میں کچھ ایسی کتابوں کی یادوں کو بھی محفوظ کرتا رہا جو میرے معیار اور مذاق کی تھیں اور اُس وقت زیرِ تجویز، زیرِ ترتیب، زیرِ تکمیل اور زیرِ طبع کی منزلوں میں تھیں۔ اُن کے انتظار میں زمانہ گذرنے لگا۔ دِنوں کے مہینے اور مہینوں کے سال بننے لگے۔ لیکن نہ یہ منزلیں طے ہونے میں آئیں اور نہ یہ کتابیں چھپیں۔ وقت کے ساتھ

ساتھ ان کتابوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور آہستہ آہستہ یہ تعداد پچاس ساٹھ تک جا پہنچی۔ ان میں سے بعض کتابوں کا انتظار کرتے ہوئے مجھے دس دس، پندرہ پندرہ اور بیس بیس سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے مگر میں ابھی تک ان کی اشاعت کے متعلق پُر امید ہوں اور رہوں گا ان کتابوں کے مصنفین سے خط و کتابت کرتا رہتا ہوں۔ دُنیا بہ امید قائم ہے جب تک دم میں دم ہے مجھے اُن کا انتظار باقی رہے گا۔ اب سید سلیمان ندوی مرحوم کے یہ خطوط یاد آئے تو دل چاہا کہ ان تمام کتابوں کی یادوں کو اپنے ذہن کے گوشوں سے نکال کر سینۂ قرطاس پر ثبت کر دوں اور اب یہی خواہش اس مضمون کی تخلیق کا محرک بن رہی ہے۔ اپنی محبوب کتابوں کا یہ تذکرہ میرے لئے تو دلچسپی کا باعث ہوگا ہی لیکن وہ لوگ بھی جنھیں کتابوں اور کتابوں کے ذکر سے دلبستگی ہے امید ہے اسے پُرکشش ہی پائیں گے اور عجب نہیں کہ ان سطور کا مطالعہ بشرطیکہ یہ سطور ان کی نظر سے گذریں ہمارے مصنفین اور ناشرین حضرات کو بھی زیرِ تبصرہ کتابوں میں سے کچھ نہ کچھ کتابوں کی اشاعت کی جانب مائل کردے۔ اس تذکرہ میں میں نے کچھ ایسے اہم اور قابل ذکر مضامین کی شمولیت بھی ناگزیر سمجھی ہے جو کافی پُرانے ہونے کے باوجود ابھی تک مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں اور جن کی دوبارہ اشاعت کا التزام ہمارے ادب میں بہت سی گرانمایہ تصانیف کے عالمِ وجود میں لانے کا سبب بن سکتا ہے۔ ان مضامین کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت ہی قریبی دور کی "کتابیں" بھی اس مضمون میں شامل کردی گئی ہیں۔

اب میں اس سلسلہ میں سب سے پہلے "اعمال نامہ" کو لیتا ہوں۔

سر سید رضا علی کی یہ باغ و بہار کتاب ان سطروں پر ختم ہوتی ہے:

"اُس خاتون (لیڈی رضا علی) کا تذکرہ کرنے کے بعد جو صحیح معنی میں میری رفیقۂ حیات اور محبوبہ تھی کوئی اور ذکر کتاب کے اس حصّہ میں کرنا میرے جذبۂ محبت کے منافی ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میری زندگی کی کہانی اور محبت کی داستان ناتمام رہی۔ آخر اعمال نامہ ہے کہاں تک اختصار سے کام لیا جائے۔ میرا شمار اُن لوگوں میں تھا جو بغیر پئے جھومتے ہیں جو کچھ لکھ چکا ہوں اُس کا سرور شاید کتاب کا دُوسرا حصہ تیار کرنے تک رہے۔ دوسرے حصہ کے کافی اجزا کا مسودہ تیار ہے۔ بندگانِ خدا سے سرِ دست باتیں ہو چکیں اب یادِ خدا کا وقت ہے۔"

پانی وضو کو لاؤ رُخِ شمع زرد ہے
بیناؔ اُٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا "

"اعمال نامہ" کے یہ الفاظ جب کبھی پڑھنے کا اتفاق ہوا مجھے ہمیشہ دُکھ ہوا۔ کاش "اعمال نامہ" کا یہ دوسرا حصہ جس کا ذکر سید صاحب نے یہاں فرمایا ہے اُن کی زندگی میں ہی شائع ہو چکا ہوتا۔ "اعمال نامہ" کی جلد اول کو شائع ہوئے بتیس سال گذر چکے اور سید صاحب کی وفات کو پندرہ برس ہونے کو آئے خدا جانے "اعمال نامہ" کی جلد دوم کا یہ مسودہ اب کن صاحب کے قبضے میں ہے اور وہ اسے کیوں نہیں شائع کر رہے ہیں۔ سوچتا ہوں کہیں یہ مسودہ ضائع تو نہیں ہو گیا لیکن اس سوچ سے فائدہ! سر سید رضا علی "اعمال نامہ" کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد پانچ سال زندہ رہے تعجب ہے وہ بھی جلد دوم کی اشاعت کا اِس عرصہ میں کوئی اہتمام نہ کر سکے!

نواب صاحب چھتاری ۱۹۴۷ء میں اپنی آپ بیتی "یادِ ایام" قلم بند فرما رہے تھے کہ انہی دنوں اُن کو ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے وزارتِ عظمیٰ کی پیشکش ہوئی۔ نواب صاحب وہاں تشریف لے گئے تو مصروفیات میں کچھ ایسے گم ہوئے کہ "یادِ ایام" کی یاد ہی بھول بیٹھے اور وہ نا تمام رہ گئی۔ نواب صاحب "یادِ ایام" میں ۱۹۳۰ء تک کے واقعات لکھنے پائے تھے اس سے زیادہ پھر نہ لکھ سکے اور کتاب ادھوری ہی شائع ہو گئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر نواب صاحب اپنی زندگی کی اس دلکش داستان کو مکمل فرما دیتے۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی تین کتابیں "محمد علی: ذاتی ڈائری" "سفرِ حجاز" اور "مقالاتِ ماجد" تو میری پسندیدہ کتابوں میں سرِ فہرست ہیں۔ لیکن اُن کی سب سے زیادہ دلکش اور دل آویز کتاب اُن کی آپ بیتی "حیاتِ ماجدی" ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اور جس کے دو باب چار پانچ سال ہوئے رسالہ "چراغِ راہ" کراچی میں نکل چکے ہیں۔ "حیاتِ ماجدی" کے مسودہ کو مکمل ہوئے سات آٹھ برس گذر چکے ہیں لیکن کتاب چھپنے میں نہیں آرہی ہے کیوں کہ مولانا دریابادی نے اس کی اشاعت پر ایک بہت ہی عجیب سی پابندی عائد کر رکھی ہے وہ یہ کہ "حیاتِ ماجدی" ان کی زندگی میں کبھی شائع نہ ہو گی۔

میں نے اپنی محبوب کتابوں کی اشاعت کے لئے کئی مرتبہ دعائیں بھی مانگی ہیں لیکن "حیاتِ ماجدی" کے لئے تو میں دعا بھی نہیں مانگ سکتا خدائے پاک مولانا عبدالماجد دریابادی کو خوش و خرم رکھے[۱]۔

علی گڑھ کے ایک مشہور ادیب اور مصنف مولوی محمد مقتدیٰ خاں شیروانی ہیں۔ عرصے کی بات ہے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں اور نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی کے سوانح حیات علیحدہ علیحدہ تحریر فرما رہے ہیں۔ بلکہ ثانی الذکر کتاب کی تسوید و تہذیب میں تو مولانا ابوالکلام آزاد کی قلمی امداد بھی شامل تھی کیونکہ ان کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک اور کتاب یو پی کے اپنے زمانے کے مشہور سیاسی رہنما جناب تصدق احمد خاں شیروانی کے متعلق ڈاکٹر سید محمود صاحب سے بھی لکھوا رہے تھے۔ یہ کتابیں اگر چھپ جاتیں تو ہمارے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہوتیں لیکن افسوس کہ کسی خاص وجہ سے ان میں سے کوئی کتاب بھی اب تک شائع نہ ہو سکی۔

خاں بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں بہت پرانے علیگ تھے وہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے ابتدائی طلبا میں سے تھے۔ کوئی دو سال ہوئے بچانوے برس کی عمر میں علی گڑھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی سے گہری محبت رکھتے تھے پنشن پانے پر علی گڑھ آ بسے تھے اور انہیں ولایت منزل کے نام سے اپنی کوٹھی تعمیر کی تھی۔ خاں بہادر صاحب مسلم یونیورسٹی اور اُس کے معاملات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے "حیاتِ آفتاب" کے نام سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سوانح حیات بھی مرتب فرمائے تھے۔ وہ بہت دنوں سے اپنی آپ بیتی "میرا علی گڑھ" لکھ رہے تھے۔ جس کا ایک باب "علی گڑھ کا کرکٹ" سنہ ۱۹۴۷ء میں الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ کرکٹ کے کھیل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں لیکن کتاب "علی گڑھ کا کرکٹ" واقعات کے لحاظ سے

---

[۱] میں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو اس سلسلے میں لکھا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"حیاتِ ماجدی" نام سے کوئی کتاب میرے علم میں نہیں۔ ایک آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری ضرور میں نے لکھ ڈالی ہے، لیکن ابھی مسودہ کی صورت میں ہے اور اپنی زندگی میں اسے شائع کرنے سے طبیعت ہچکچا رہی ہے۔ "چراغِ راہ" کو ایک ادھ سبق آموز باب (اپنے دورِ الحاد کے متعلق) شاید اس کے طلب کرنے پر میں نے بھیج دیا تھا! اس سے زیادہ یاد نہیں۔"

ایک پر لطف کوشش ہے۔ میرا علی گڑھ کے موضوع پر خان بہادر صاحب سے میری کئی سال تک مراسلت رہی۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے میرے خطوط کا جواب ہمیشہ دیر سے دیتے تھے لیکن جواب سے نوازتے ضرور تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میرے ایک خط کا جواب اُنھوں نے پورے چھ مہینے کے بعد عنایت فرمایا تھا۔ خان بہادر صاحب وفات پاگئے میرا خیال ہے "میرا علی گڑھ" مکمل نہیں ہوئی اور اگر مکمل ہو بھی گئی ہو تو کون جانے کب شائع ہوگی۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار غالباً لطیفے سے کم نہیں کہ خان بہادر صاحب نے "علی گڑھ کا کرکٹ" میں ایک مقام پر "حیاتِ آفتاب" کا ذکر فرمایا اور اُس کے آگے خطوط وحدانی میں یہ الفاظ تحریر فرمائے "جو زیرِ طبع ہے" آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا اور شاید ہنسی بھی آئے کہ یہ "زیرِ طبع" کتاب (حیاتِ آفتاب) کم و بیش پندرہ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

انہی خان بہادر ڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب کے ایک نہایت ہی عزیز دوست میر ولایت حسین صاحب تھے۔ اُن کا شمار محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے مشہور اور قدیم اساتذہ میں ہوتا ہے۔ میر صاحب نے بھی اپنی زندگی کے حالات خود قلم بند فرمائے تھے جن کے کچھ اجزا "علی گڑھ میگزین" کے "علی گڑھ نمبر" (۱۹۵۵ء) میں "ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ شروع میں سید محمد ٹونکی صاحب کا ایک نوٹ بھی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "میر صاحب نے اپنی سوانح لکھ کر جو احسان علی گڑھ پر کیا ہے۔ اس کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب وہ پوری چھپ کر منظرِ عام پر آئے گی اور لوگ دیکھیں گے کہ وہ ان کی نہیں علیگڑھ کی بڑی سچی تاریخ ہے۔" میں نے اس سلسلے میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ سے کئی سال تک خط و کتابت کی ستمبر ۱۹۵۷ء میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نقیب پندرہ روزہ "علی گڑھ" میں اسی موضوع پر میرا ایک خط بھی شائع ہوا تھا جس کے جواب میں ایڈیٹر صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ کتاب بہت جلد پریس میں جانے والی ہے لیکن بعد ازاں اس کتاب کو کچھ ایسی مجبوریوں سے سابقہ پڑا کہ اُس کی اشاعت کی آج تک نوبت نہ آئی۔[لہ]

لہ سید محمد ٹونکی صاحب اس کتاب کی اشاعت کی فکر میں برابر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۲ر جون ۶۳ء کو شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کو ایک خط لکھا ہے۔ (اعظمی)

ملا واحدی صاحب ہلکا پھلکا اور شگفتہ لکھنے میں اپنی مثال آپ ہیں اور مجھے اُن کا یہ طرز نگارش بہت پسند ہے۔ "حیاتِ سرورِ کائنات" "میرے زمانے کی دلی" اور "حیات خواجہ حسن نظامی" اُن کی بہترین تصانیف ہیں لیکن سب کی سب نامکمل ہیں "حیات سرورِ کائنات" کو وہ چھ جلدوں میں مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی صرف تین تین جلدوں کی تکمیل ہوئی ہے "میرے زمانہ کی دلی" کی جلدوں کا مواد اُن کے پاس موجود ہے لیکن اُس کی صرف ایک جلد ہی شائع ہوئی "حیات خواجہ حسن نظامی" کو بھی انھوں نے ۱۹۲۷ء تک کے واقعات پر ختم کر دیا حالانکہ خواجہ صاحب کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا یوں انہوں نے اس سلسلہ کو بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر شاہ ولی اللہؒ کے متعلق لکھنے لگے تو سولہ صفحات لکھ کر بس کر دیئے۔ "تاثراتِ واحدی" شروع کی تو وہ بھی نامکمل ہی رہی سو اھدی صاحب اپنی ایک پرانی کتاب "مضامینِ واحدی" کا نیا ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تھے لیکن بس اعلان کر کے رہ گئے۔ اور یہ معاملہ دس بارہ سال سے یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ واحدی صاحب میرے بزرگ ہیں اُن سے کسی قسم کا گلہ شکوہ سراسر بے ادبی ہے بہرحال ان کی کتابوں کا انتظار شب و روز کرتا ہوں۔

ستمبر ۱۹۵۴ء کی بات ہے لاہور کے رسالہ "نئی تحریریں" میں منشی نجم الدینؒ کی غیر معمولی شخصیت پر ایک دلچسپ مضمون ڈاکٹر مختار احمد آرزو (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے قلم سے میری نظر سے گذرا تھا۔ آرزو صاحب اردو کے سلجھے ہوئے ادیب ہیں اور غالبیات پر دقیق نظر رکھتے ہیں منشی نجم الدین صاحب سرسید کے منشی تھے اور اُن کی پیشی میں رہتے تھے۔ انھوں نے بابائے علی گڑھ کے ساتھ ایک طویل زمانہ گذارا تھا اور انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ منشی نجم الدین کے پاس خطوط، اسناد اور دوسری نایاب تحریروں کے علاوہ علی گڑھ تحریک سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی تصویروں کا بڑا نادر مجموعہ تھا جس میں سرسید، سید محمود، اُن کے خاندان کے بعض اعزہ اُن کے معاصرین اور احباب، کالج کے قدیم اساتذہ اور ممتاز اہل قلم کی بہت اچھی عکسی تصویریں تھیں۔ آرزو صاحب منشی نجم الدین سے متعدد مرتبہ ملے۔ اس مضمون میں اُنھوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ وہ سرسید کی زندگی پر ایک کتاب تحریر فرمائیں گے جس میں مطبوعہ ماخذوں سے قطع نظر کر کے اُن صاحب سے جیسے کہ منشی نجم الدین ہیں سرسید کے ذاتی حالات اور اُن کی تحریک کے متعلق ایسی معلومات فراہم کریں گے جو صرف اُنھی بزرگوں کے سینوں میں پوشیدہ ہیں۔ یہ کام آرزو صاحب ہی کے کرنے کا

تھا مگر ابھی تک نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن کی بعض دوسری مصروفیات اس راہ میں حائل ہو گئی ہوں خدا کرے میرے یہ الفاظ آرزو صاحب تک پہنچ جائیں اور وہ اب اس کا بیڑا اُٹھا لیں۔

دلی کے ایک بہت معمر بزرگ منشی عبدالقدیر صاحب ہیں۔ اسی پچاسی برس کی عمر ہے تحریکِ آزادی سے دیرینہ تعلق رہا ہے اور اُس کی پاداش میں عمر کا ایک حصہ قیدِ فرنگ میں بھی گذرا۔ اُس زمانہ کی یادوں کو اُنھوں نے "جیل میں دو سال" کے عنوان سے لکھا اور دلی کے ایک ناشر کے حوالہ کیا۔ اُنھوں نے ایک دوسری کتاب "دلی میں پچپن برس" اور لکھی اور وہ بھی انھی ناشر صاحب کو دے دی۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے جسے اب اٹھارہ سال ہونے کو آئے یہ کتابیں جب ناشر کے واضح اعلان کے باوجود کئی سال تک نہ چھپیں تو میں نے منشی عبدالقدیر صاحب سے اس کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ناشر صاحب پریس کے مقروض تھے۔ پریس کے مالک نے "جیل میں دو سال" کی تیار شدہ پلیٹوں کو دبا کر رکھ لیا کہ قرضہ ادا کیجئے اور پلیٹیں لیجائیے۔ نہ اُن کے پاس پیسے ہوئے اور نہ کتاب واپس ملی اور نہ چھپی اور اس طرح یہ کتاب غالباً اس تنازعہ میں ضائع ہو گئی۔ "دلی میں پچپن برس" کے متعلق اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ کتاب "دلی میں پینسٹھ برس" کی صورت میں چھپے گی اور اب تو شاید "دلی میں پچھتر برس" کی نوبت آگئی ہے لطف یہ ہے کہ منشی صاحب کے صاحبزادے علاؤالدین خالد صاحب پاکستان میں کتابوں کا بہت بڑا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور بلاشبہ سینکڑوں کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ اُن سے بھی کئی مرتبہ اس کتاب کا ذکر کیا۔ مگر خاموشی کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں ملا۔

۱۹۵۹ء میں میں نے مولانا غلام رسول مہر سے اُن کی زیرِ ترتیب کتاب "سرودِ رفتہ" کے نفسِ مضمون کے متعلق استفسار کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ "سرودِ رفتہ" اُن کی آپ بیتی ہے۔ مولانا مہر نے میرے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ "سرودِ رفتہ" اُن کی سرگذشت نہیں بلکہ علامہ اقبال کا وہ کلام ہے جو اُنھوں نے اِس لئے قلمزد فرما دیا تھا کہ وہ اُن کے معیارِ بلند کے مطابق نہ تھا۔ اُنھوں نے مزید فرمایا تھا کہ اُن کی سرگذشت تو نہیں مگر اُن کے دور کی سرگذشت انشاءاللہ بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔ اُس کی دو جلدیں ہونگی اور سنہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اور دوسری جلد ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک کے حالات پر مشتمل ہوگی۔ آخری دور کے حالات پہلے لکھنے کا سبب اُنھوں نے یہ لکھا تھا کہ ۱۹۲۱ء سے وہ خود سیاسیات میں آگئے تھے اور یہ تمام واقعات اُن کے سامنے گذرے ہیں مہر صاحب کے مکتوب گرامی کو آئے چار سال ہو چکے اور پانچواں سال شروع

ہے۔ جن کتابوں کی اشاعت کے لئے اُنھوں نے "بہت جلد" کے الفاظ استعمال فرمائے تھے اُن کے لئے چار پانچ سال کی مدّت کچھ کم تو نہیں۔

چودھری محمد علی صاحب سابق وزیر اعظم پاکستان ایک عرصہ سے انگریزی میں اپنی زندگی کی داستان لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کا ایک بڑا حصہ اُنھوں نے متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے دو اہم سالوں (۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء) کے لئے وقف کیا ہے۔ کتاب امریکہ میں چھپے گی۔ ویسے پروگرام کے مطابق اسے گذشتہ سال چھپ جانا چاہئے تھا، دیکھئے اِس سال بھی آتی ہے یا نہیں۔

میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" لاہور کا ایک اعلان ۱۹۵۵ء میں مجھے اخبار "امروز" لاہور میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا کہ وہ اپنے والدِ گرامی جسٹس شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم کے سوانح حیات قلم بند کرنا چاہتے ہیں لیکن بعد میں یہ نہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُنھوں نے اس سلسلے میں اب تک کیا کچھ کیا۔

کراچی کے ایک ادارہ مکتبۂ خدام ملت نے بھی انھی دنوں ایک نادر و نایاب کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کتاب جسٹس سید امیر علی مرحوم کی خود نوشت داستانِ زندگی تھی جو اُنھوں نے کبھی انگریزی میں لکھی تھی اور ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ ناشر کے پے در پے اعلانات سے اُس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کتاب بہت جلد شائع ہو رہی ہے۔ لیکن بعد میں یہ بد قسمت کتاب کچھ ایسی مشکلات سے دوچار ہوئی کہ پانچ سال گذرنے کے بعد بھی اب تک شائع نہ ہو سکی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مختصر سے سفرنامہ "شرقِ اوسط میں کیا دیکھا" جو جنوری ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا کے پیش لفظ میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ اُن کے اس سفرنامہ کے اجمال کی تفصیل اُن کی اُس ڈائری میں ملے گی جو کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور جو مصر، سوڈان، شام، شرقِ اُردن اور فلسطین کا مکمل سفرنامہ اور روزنامچہ نیز وہاں کی زندگی، معاشرت، سیاست اور تعلیم کا اُبھرا ہوا خاکہ ہے۔ مولانا علی میاں کے اِس دلفریب سفرنامہ کا انتظار کرتے کرتے مجھے دس سال ہو گئے لیکن ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی وفات سے کوئی ہفتہ بھر پیشتر اپنے ایک بیان میں حکیم اسرار احمد کریوی ناظم مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان کی خصوصی توجہ حضرت صدق جائسی کی کتاب "دربارِ دُربار" کی جانب مبذول کرائی تھی کہ وہ اس کتاب کو جلد از جلد انجمن کی طرف سے شائع کرنے کا اہتمام کریں۔

بابائے اُردو کی وفات کو دو برس ہونے کو آئے لیکن کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی "دربارِ دُربار" یوں توفانی بدایونی مرحوم کی حرماں نصیبی کی داستان ہے لیکن برسبیل تذکرہ اِس کتاب میں متعدد دلچسپ اور پرلطف واقعات ایسے بھی شامل ہوگئے ہیں جن کا تعلق میر محبوب علی خاں نظام دکن۔ میر عثمان علی خاں نظام دکن۔ پرنس اعظم جاہ۔ مرزا داغ۔ امیر مینائی۔ جلیل مینائی۔ جوش ملیح آبادی۔ ساہر القادری۔ نجم آفندی اور کتاب کے مصنف صدق جائسی سے ہے۔ "دربارِ دُربار" سے مصنف کی مراد شہزادہ معظم جاہ جو ہز ہائینس ریاست حیدرآباد دکن کا دربار ہے جہاں مصنف کا ایک اعزازی مصاحب کی حیثیت سے آنا جانا تھا۔

بابائے اُردو کی سیرت جس کے متعلق سُنا تھا کہ حکیم اسرار احمد صاحب ترتیب دے رہے ہیں ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔

جماعت اسلامی کے رہنما اور "سیارہ" لاہور کے فاضل مدیر جناب نعیم صدیقی کو قادیانی تحریک کے سلسلے میں ۱۹۵۳ء کے ابتدائی ایام میں کچھ عرصہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑا تھا۔ جب وہ رہا ہوئے تو انھوں نے "چراغ راہ" کراچی میں ایام اسیری کے متعلق اپنے کچھ تاثرات پیش کیے تھے۔ اس زمانہ میں لاہور کے ایک ناشر نے اعلان کیا تھا کہ وہ جلد ہی نعیم صدیقی صاحب کی جیل کی ڈائری کو ایک مستقل کتاب کے طور پیش کر رہے ہیں۔ لیکن بعد ازاں ایسا نہ ہوا اور اب تو امتدادِ زمانہ نے اس امید کو ناامیدی میں بدل دیا ہے۔ اِس ضمن میں مشہور افسانہ نگار اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی کے اُن مضامین کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو "زندان و سلاسل" کے زیرِ عنوان کئی قسطوں میں "نقوش" لاہور میں اُس زمانہ میں شائع ہوئے تھے جب وہ "راولپنڈی سازش کیس" میں سزایاب ہونے کے بعد رہا ہوئے تھے۔ اُنھوں نے "مہرلب" کے نام سے اپنے زمانۂ اسیری کی یادوں کو ترتیب دیا تھا اور اس فکر میں تھے کہ یہ کتاب جلد شائع ہو جائے لیکن پھر نہ جانے کیا حالات پیش آئے کہ کتاب مذکور چھپتے چھپتے رہ گئی۔ آغا شورش کاشمیری کا مشہور و معروف سلسلۂ مضامین "پسِ دیوارِ زنداں" بھی آج تک کتاب کی شکل میں ظاہر نہ ہو سکا گو اُس کے زیرِ طبع ہونے کا اشتہار پچھلے دس بارہ برسوں میں "چٹان" میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

تین چار سال ہوئے یہ خبر بھی سُننے میں آئی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر صاحب اپنے برادرِ معظم کی سیرت مکمل کرنے میں مصروف ہیں۔ چودھری صاحب صاحبِ قلم ہیں اس لئے امید تھی

کہ اُن کے قلم سے مولانا ظفر علی خاں کے متعلق ایک جامع اور مبسوط کتاب مرتب ہو جائیگی لیکن ابھی تک یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ اُدھر کراچی کی حسرت میموریل سوسائٹی بھی مولانا حسرت موہانی کی سیرت پر ایک بلند پایہ کتاب شائع کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کا تانا بانا ابھی تیار نہیں ہوا۔

شاہد احمد دہلوی صاحب مدیر "ساقی" سے بھی اُن کی دو کتابوں "طاقِ نسیاں" اور "اُجڑا دیار" کے بارے میں کئی سال تک مراسلت رہی "طاقِ نسیاں" "گنجینۂ گوہر" کے نام سے پچھلے برس چھپ چکی ہے البتہ "اُجڑا دیار" کا انتظار باقی ہے۔ "اُجڑا دیار" کو دِلّی مرحوم کا مرثیہ کہنا چاہیئے جسے شاہد احمد دہلوی نے نظم کے بجائے نثر میں لکھا ہے اس کتاب میں اُن کا مشہور رپورتاژ "دِلّی کی بپتا" بھی شامل ہے۔ "اُجڑا دیار" کے سلسلے کے مضامین آجکل "ساقی" میں نکل رہے ہیں توقع ہے کہ یہ کتاب سالِ رواں میں شائع ہو جائے گی۔

مکتبۂ جدید لاہور کی فہرستوں میں ایک مدت تک مولوی محمد امین زبیری کی کتابوں "تذکرۂ محسن" اور "تذکرۂ وقار" جو بالترتیب نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے متعلق ہیں زیرِ طبع کے ضمن میں ذکر آتا رہا۔ "مکتبۂ داستان گو" قدرت اللہ شہاب کی "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" کے بارے میں لگاتار اشتہار دیتا رہا اور مکتبہ مہر نیمروز کراچی اپنے تین سفرناموں "سفرنامۂ انگلستان" "سفرنامہ امریکہ" اور "نئے چمن نئی بہاریں" کی اشاعت کا یقین دلاتا رہا لیکن مجھ ایسے مشتاقانِ جمال کے خرمنِ صبر و قرار میں آگ لگا کر میری یہ محبوب کتابیں نہ جانے کہاں بیٹھ رہیں یہی شکوہ مجھے ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور سے ہے جو رئیس احمد جعفری کی "دامانِ باغبان" (شخصیات پر مضامین) کو دس گیارہ سال کا عرصہ گذر جانے پر بھی شائع نہیں کر رہے ہیں۔

دیارِ حجاز کی منزل ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سا مسافر ہو اور مولوی محمد عاصم حدّاد اور مولوی خلیل حامدی جیسے اہلِ قلم رفیقانِ سفر ہوں تو پھر اس مقدس سفر کی روداد دلچسپ سے دلچسپ تر کیوں نہ ہو لیکن ان سفرناموں کی یہی دلچسپی میرے لئے وبالِ جان بن کر رہ گئی۔ "ترجمان القرآن" اور "ایشیا" میں ان سفرناموں کی چند قسطیں نکلی تھیں لیکن اپنے ذوقِ مطالعہ پر یہ قسطیں گراں ہی گذریں کیونکہ اپنی محبوب کتابوں کو اس طرح قسطوں میں پڑھنا اپنے لئے تو قیامت سے کم نہیں اس لئے ان سفرناموں کو کتابی صورت میں دیکھنے کا آرزومند ہوں۔ ناشر کی طرف سے کئی سال ہوئے "زیرِ طبع" ہونے کی خوشخبری مل چکی ہے۔ دعائیں مانگ مانگ کر تھک چکا ہوں لیکن ناشر کا وعدۂ فردا وفا ہونے میں نہیں آتا۔ ایسے حالات حضرتِ ناشر سے

اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

بُرا کیا تیرے وعدے پر اعتبار کیا

اللہ تعالیٰ اُن کی اور ہماری مشکلیں آسان فرمائے آمین!

حیدر آباد دکن کی ڈاکٹر بیگم قطب النساء ہاشمی نے کئی سال ہوئے "بابائے اُردو" کے نام سے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی یہ کتاب اُن سے کراچی کے ایک ناشر نے حاصل کرلی لیکن دو تین سال تک اپنی فہرستِ کتب میں اس کتاب کا اشتہار دینے کے باوجود اِسے شائع نہ کیا۔ اِن باتوں کو چار پانچ سال گذر گئے لیکن کوشش کے باوجود مجھے اس کتاب کی عدم اشاعت کا پس منظر معلوم نہ ہوا سوائے اس کے کہ مصنفہ کو ناشر سے شکایت ہے۔ لہ

سردار عبدالرب نشتر مرحوم کی خود نوشت سوانح حیات کے اقتباسات گذشتہ دنوں اُن کی ساتویں برسی کے موقع پر اخبار جنگ کراچی میں شائع ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے سردار صاحب نے ۱۹۵۸ء میں وزارتِ صنعت سے سبک دوش ہونے کے بعد یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ وہ اب اپنی آپ بیتی لکھیں گے جس میں وہ قیامِ پاکستان کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ سردار عبدالرب نشتر کی اس آپ بیتی کا مسودہ اُن کے صاحبزادے عبدالجمیل نشتر صاحب کے قبضہ میں ہے۔ بہتر ہوگا کہ جمیل صاحب اپنے والدِ گرامی کی اس آپ بیتی کو خواہ یہ مکمل ہو یا نامکمل جلد از جلد چھپوا ڈالیں۔

حضرت مولانا ابو الوفا ثناء اللہ مرحوم کی مفصل اور شایانِ شان سوانح عمری پر ہندوستان میں کام مکمل ہوچکا ہے اور اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے ایک ٹرسٹ کی تشکیل بھی عمل میں لائی جا چکی ہے۔ دیکھئے مولانا مرحوم پر یہ قابل دید کتاب کب تلک جلوہ نما ہوتی ہے۔

حکیم شجاع احمد صاحب نے آج سے کوئی بیس سال پیشتر معجون بہائیں بڑے پیارے اور خوبصورت

لہ اس کتاب کے متعلق خود بابائے اردو نے مجھے لکھا تھا کہ مصنفہ اور ناشر کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے کتاب شائع نہ ہو سکی۔ مصنفہ سے بھی میری خط وکتابت ہوئی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کوئی ان کا مسودہ ان کو واپس دلا دے! وہ چھپوانے کا انتظام کریں گی۔ (اعظمی)

انداز میں اپنی زندگی کے مشاہدات اور تاثرات پیش کیے تھے۔ اُن کی اِس پُر لطف کہانی میں ضمناً کچھ ایسے واقعات اور شخصیات کا تذکرہ بھی آگیا ہے جو ہماری قومی، مجلسی اور سیاسی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب بنیادی طور پر ادیب ہیں اس لیے اس روداد کا اسلوب نگارش اور اندازِ بیاں بہت ہی پُر کیف اور دلکش ہے "خوں بہا" کی زیرِ نظر کتاب پر جلد اوّل لکھا ہوا ہے اور واقعات کے لحاظ سے یہ ۱۹۱۵ء پر ختم ہو جاتی ہے جس کو اب پچاس برس ہونے کو آئے۔ حکیم صاحب نہ صرف صاحبِ طرز ادیب ہیں بلکہ مجلسِ قانون ساز صوبہ پنجاب کے ڈپٹی سکرٹری اور سکرٹری مجلس قانون ساز صوبہ مغربی پاکستان کے سکرٹری ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل زمانہ ہماری سیاسی گہماگہمی میں بھی گذارا ہے۔ حکیم صاحب ۱۹۱۵ء کے بعد کی داستان اگر اسی انداز میں مرتب فرما ڈالیں تو اُن کا یہ دل نشیں تذکرہ نہ صرف ادب و سیاست کا ایک حسین امتزاج ہوگا بلکہ اُس کی اشاعت سے درونِ پردہ کے کچھ ایسے حالات اور واقعات بھی ہمارے سامنے آئینگے جن سے حکیم صاحب کے سوا کوئی اور واقف نہیں۔

آغا محمد باقر صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی خود نوشت سرگذشت "لاہور سے لاہور تک" اور "لاہور سے لندن تک" جو دو ماہی "صحیفہ" لاہور میں بالاقساط شائع ہوتی رہی ہے خوب سے خوب تر تھی اور اس امر کی پوری طرح متقاضی بھی کہ یہ شگفتہ داستان ایک کتاب کی صورت میں دوبارہ شائع ہوکر ہمارے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سبب بنے۔ اس مرحلہ پر مجھے ادیب الملک خواجہ محمد شفیع دہلوی کی "بلاکشاں" کی وہ قسطیں بھی یاد آگئیں جو کبھی "تذکرہ" کراچی میں نکلتی رہی تھیں۔ "بلاکشاں" یاد آئی تو ساتھ ہی مشہور انقلابی پروفیسر محمد اقبال شیدائی کی "داستانِ بلاکشاں" بھی یاد آگئی۔ تحریک مجاہدین کی یہ ناقابلِ فراموش کہانی آج کل "تہذیب الاخلاق" لاہور میں مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ مضامین جلد سے جلد ایک کتاب کی شکل اختیار کریں۔ لیجیے حضرتِ مرش بھی بر وقت یاد آئے۔ بہت عرصے کی بات ہے ہفت روزہ "آفاق" لاہور میں "میری جیل یاترا" کے عنوان سے کوئی ایک درجن قسطوں میں اُن کے قلم سے ایک دلچسپ سلسلۂ مضامین نکلا تھا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں صوبہ مغربی پنجاب کی بعض اہم سیاسی شخصیتوں کے خاکے بھی "آفاق" ہی میں پیش کیے تھے۔ یہ سب چیزیں ادبی لحاظ سے بہت بلند اور وقیع

تھیں اور آج بھی اُن کی یہ خصوصیت باقی ہے۔ حضرتِ م ش توجہ فرمائیں تو اُن کی ایک بہت ہی عمدہ اور قابلِ مطالعہ کتاب منصۂ شہود پر آسکتی ہے اور پھر اُن کی مشہور و معروف "لاہور کی ڈائری" کا ایک انتخاب چھپ جائے تو کیا کہنے! مجھے جناب عبداللہ ملک کے وہ مضامین بھی کبھی نہ بھول سکیں گے جو تین سال قبل "لیل و نہار" لاہور میں "یادوں کے مزار" بن کر شائع ہوتے رہے۔ "لیل و نہار" میں شیخ عبدالرحیم (علیگ) کے پُرلطف مضامین نواب محسن الملک مسعود ٹامی مرحوم اور سر شیخ عبدالقادر وغیرہ بھی بھول لینے والی چیزیں نہیں۔ میری شدید خواہش ہے کہ یہ دلفریب مضامین جو یوں بکھرے ہوئے پڑے ہیں جلد از جلد خوبصورت اور خوشنما کتابوں کی صورت میں یکجا ہو جائیں۔

ہاں تین کتابیں اور بھی میرے انتظار کے مراحل میں ہیں۔ پہلی کتاب "زندگانی کی گذرگاہوں میں" ہے یہ ہمارے ملک کے نہایت ہی محترم اور نامور صحافی اور ادیب مولانا نصر اللہ خاں عزیز مدیر ایشیا لاہور کی زندگی کی کہانی ہے جو گاہ بگاہ "ایشیا" لاہور میں شائع ہوتی رہی ہے۔ باقی دو کتابیں حضرت جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" اور حضرت حفیظ جالندھری کی "جنگ و آہنگ" ہیں۔ دونوں کی دونوں کتابیں اِن حضرات کی آپ بیتیاں ہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر کتاب اِن دنوں نظر سے گذر رہی ہے۔ یہ کتاب جناب ذوالفقار علی بخاری سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے جو آج کل ہر دوسرے تیسرے روز کراچی کے اخبار "حریت" میں نکل رہی ہے۔ یہ بہت ہی دلچسپ قابلِ مطالعہ ہے۔

ایک بہت ہی عجیب و غریب اور نہایت ہی دلچسپ کتاب کا ذکر ابھی باقی ہے جس کی ترتیب و تدوین میں میرے اشتیاق، میرے اصرار اور میرے جذبات کا دخل ہے یہ ضخیم کتاب میرے محترم مشفق مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب مالک دواخانہ سلیمانی جہانیاں (ملتان) کی ساٹھ سالہ زندگی کے متعدد واقعات، گوناگوں حادثات اور بوقلموں مشاہدات سے عبارت ہے۔ اِس کتاب کا مسودہ کوئی چار پانچ سال سے غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہوا ہے حالانکہ حکیم صاحب سے میری قریب قریب روزانہ ہی ملاقات ہوتی ہے اور میں بسا اوقات اُس کی اشاعت کے لئے اصرار بھی کرتا ہوں لیکن پھر بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ میں بعض دفعہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا کرتا ہوں کہ تم جو اپنی قریب ترین کتاب کو چھپوانے میں اتنے لمبے عرصے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے تو کیا حق حاصل ہے کہ تم ایسے لوگوں کی شکایت کرتے پھرو جو تم سے سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے ہیں اور جن کے حالات کا تمہیں کوئی علم نہیں تو مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔

چھوٹے بچوں کی تربیت

یہ صدی "بچوں کا زمانہ" کہلاتی ہے۔ مہذب دنیا نے بچے کی شخصیت کا احترام سکھایا ہے اور "انسانی حقوق" کے ساتھ ہم آج "بچوں کے حقوق" کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ لیکن بچے کی تربیت کے معاملے میں عموماً ہمارا زور اس کے "مطالعے" کی طرف رہا ہے۔ ہم اُسے اوپر سے دیکھتے ہیں اور اس کے بارے میں اعداد و شمار اکٹھا کرتے ہیں۔ مثلاً بچہ کتنا لمبا پیدا ہوتا ہے۔ پیدائش کے وقت ایک عام بچے کا وزن کیا ہوتا ہے۔ بچے کا پہلا دانت آٹھ ماہ سے قبل ہی نکل آتا ہے۔ ڈیڑھ سال کا بچہ پانچ لفظ بول لیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اس طرح کی معلومات کے ذریعے ہم نے تمام بچوں کا حساب جوڑنا شروع کر دیا ہے۔ عام حیثیت کا بچہ کون کہلائے گا؟ بڑھیا کون ہے اور گھٹیا کون؟ اس قسم کی واقفیت حاصل کرنے سے بچے کو سمجھنے میں آسانی یقیناً ہوئی ہے اور مسلسل مطالعے سے واقعات کا ربط بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بچے کی نشو و نما میں خاص خاص موڑ کب آتے ہیں اور بچہ اپنی زندگی کی مختلف منزلیں کس شان سے طے کرتا ہے، ہر ایک دور میں اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ہمیں اس سے کیا توقعات ہونی چاہئیں، اس لئے اگر دو تین سال کا بچہ "انکار کی منزل" میں پہنچ جاتا ہے۔ خواہ اس سے کیسی ہی پیار کی بات کیوں نہ کریں، وہ منع ہی کرتا ہے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہماری معلومات نے ہمیں باخبر کر رکھا ہے کہ بچے کی یہ بات اس کی عمر کا تقاضا ہے۔ اس خاص زمانے میں اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے کیونکہ عموماً سب بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہمارا یقین ہو گیا ہے کہ بچے کی ترقی، قطعی طور پر بندھی ٹکی ہوتی ہے۔ اس کی نشو و نما میں قدرت کے قانون اپنا عمل دخل چلاتے رہتے ہیں۔ ہم ان اصولوں کو دیکھیں اور سمجھیں اور انھیں سرکاری قانون کی طرح مان لیں اور بس! اس معاملے میں گویا تعلیم و تربیت صرف سہولت پیدا کرتی ہے اور کچھ نہیں

ایسی صورت میں ہمارے اوپر لازم آتا ہے کہ بچے کی دلچسپیوں پر توجہ دیتے رہیں۔ اس کے حرکات وسکنات کا مطالعہ کرتے رہیں اور اپنے مطالعے کی روشنی میں ہر ایک بچے کو پہچانیں۔

لیکن بچے کو اس طرح سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کو اب زیادہ سراہا نہیں جا رہا ہے روز بروز اس کے اس بے تعلق جائزے کے بے جان پن کا احساس بڑھتا جا رہا ہے بچے سے محبت رکھنے والوں اور واقفیت پیدا کرنے والوں میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ بچے کے بارے میں ہمارا مطالعہ اور اس کا دیدہ یا شنیدہ 'بیان' بذاتِ خود بچے کی طبیعت کی رنگینی، پیچیدگی اور انفرادیت کو پورے طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ یہ واقفیت ہمیں صرف 'کیا ہے' تک پہنچاتی ہے اور 'کیوں ہے'، کے جواب سے ہم پھر بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ چکے ہیں کہ دو تین سال کا بچہ 'منع' بہت کرتا ہے۔ "وہ نہیں نہیں" کی رٹ لگایا کرتا ہے۔ لیکن کیا یہ ایک ضروری عمل ہے۔ کیا یہ بچے کی فطرت کا مطالبہ ہے یا کچھ اس کے ماحول کا تقاضا بھی ہے۔ بچے کی طبیعت کی اس خصوصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ والدین اور دوسرے متعلقین کا رویہ اس کے ساتھ کیا ہے۔ دراصل اس کے مزاج کی چاشنی، داخلی اور خارجی دونوں حالات سے مل کر تیار ہو رہی ہے۔ بچوں کے عمل کا بیان، صرف بیان، کافی نہیں ہے بلکہ اس کی معقولیت اور نامعقولیت کے بارے میں بھی ہمیں سوچنا ہوگا۔ بچے کا ایک مخصوص عمل، مناسب، معتدل یا معقول کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ جیسے ہم نے کہا کہ بچے کا 'منع کرنا' مناسب اور معقول ہے کیونکہ دو تین سال کے سب بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ بچہ 'انکار' کرتا ہے اور بچی کم۔ ایسی صورت میں کیا ہم اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچی کے مقابلے میں بچہ زیادہ معقول ہے؟ اب اگر یہ مان بھی لیں تو ایک انکشاف اور ہوتا ہے۔ کچھ محققین کا ارشاد ہے کہ اونچے گھرانوں کا بچہ زیادہ 'انکار' کرتا ہے اور معمولی گھروں کی بچی۔ اب بتایئے کہ کس کا عمل زیادہ مناسب اور معقول ٹھہرا ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کی یہ "نہیں نہیں" اپنے حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر ایک سماج کے اپنے طور طریقے ہوا کرتے ہیں مزاج اور مذاق کا فرق بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے بچے کا عمل 'وقت' اور 'جگہ' کے تعلق کے

بغیر مناسب' موزوں یا 'عام' نہیں کہلایا جا سکتا ہے ہمیں بچے کو پہچاننے اور جاننے کے لیے اس کے 'ماحول' کو بھی دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے شوق میں بچے کو صرف بدیسی لباس ہی نہیں پہناتے ہیں بلکہ اسے بدیسی بچوں کے عادات و اطوار کے پیمانوں سے ناپنے بھی لگتے ہیں۔ ہم نے غیر ملکی بچے کے حالات پڑھ کر جو ذہنی تصویر بنائی ہے، اسے اپنے نور نظر پر چسپاں بھی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نادانی میں اسی کاغذی پیرہن' کے مطابق اپنے جیتے جاگتے بچے کو دیکھنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے پیمانے خود بنائیں اور دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہم حالات کے ربط کے ساتھ ان پیمانوں کو برتیں۔ یہ پیمانے 'وقت' اور 'مقام' دونوں کے لحاظ سے بدلا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ دہلی میں پلتا بڑھتا ہے اور دوسرا کسی معمولی قصبے یا گاؤں میں۔ ان دونوں بچوں کی بول چال اور رنگ ڈھنگ میں فرق لازمی ہے۔ اسی طرح مجھے سمجھنا چاہیئے کہ میرے بچپن اور میرے نرسری اسکول جانے والے بچے کے بچپن میں تیس سال کا زمانہ حائل ہے۔ اس لئے تیس سال پہلے کا عام انداز غالباً آج کا عام انداز' نہ رہا ہو۔ اور مناسب و معتدل رویے کا حساب لگاتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اس بنا پر بچوں کے برتاؤ کو سمجھنا دشوار ہے جب تک کہ ہم اسے کسی ماحول سے مطابقت دے کر نہ سمجھیں۔ ایک مغربی دیس کے بچے میں اور ہمارے بچے میں جو فرق ہے، وہ دراصل اس سماج کا ہے جس کے وہ دونوں بچے ہیں۔ اس لئے اس سماج اور تہذیب پر توجہ دینی ہوگی جو شروع سے ہی بچہ پاتا ہے۔ اگرچہ اس نظریئے میں بچے کی ترقی کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا جاتا لیکن یہ نظریہ ان تعلقات پر زور دیتا ہے جن سے بچے کی زندگی وابستہ ہے۔ ہم اسی قدر اس معاملے میں دلچسپی رکھیں کہ دوسرے لوگ بچے کے ساتھ اور بچے کے لئے کیا کرتے ہیں، جس قدر ہمیں اس بات میں دلچسپی ہے کہ بچہ خود کیا کرتا ہے۔

نشو و نما کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک متعینہ شکل میں بچہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو اپنے سماجی اور طبعی حالات کے تحت رونما ہوتا ہے۔ ایک بچہ کیا ہے اور وہ کیا کرتا ہے۔ اس کا انحصار حالات پر ہے لیکن کیا یہ نظریہ بچے کو ایک کھلونا

نہیں بنا دیتا جیسے حالات بناتے، بگاڑتے ہیں؟ کیا اس کا سارا عمل، محض حالات کی دین ہے؟ ہمارا جواب ہے 'نہیں' ہمیں بچے اور اس کے ماحول' دونوں کو دیکھنا چاہیئے۔ بچہ ایک ذی روح کی حیثیت سے کچھ صلاحیتیں اور استعداد رکھتا ہے۔ یہ بچہ کسی مخصوص سماج میں جنم پاتا ہے، اس کی ترقی، دونوں کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ اسے کچھ کرنے کا موقع ملے گا اور کچھ کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ وہ کچھ کرتا ہے۔ شاید تنہا چھوڑ دیا جاتا تو نہ کرتا۔ اس طرح وہ اپنے سماج کے طور طریقوں کو سیکھتا ہے اور بالآخر اپنے سماج کا ایک ذمہ دار رکن بن جاتا ہے۔ اس عمل میں بچہ، سیکھنے والا ہے اور اس کے والدین، اساتذہ اور ماحول کے دوسرے عناصر' سیکھنے کا ذریعہ' لیکن اصل دشواری انتخاب کی پیش آتی ہے۔ بچے کے سامنے بہت سی چیزیں آتی ہیں۔ لیکن اسے اچھے' برے کی تمیز نہیں ہوتی اس لئے بچے کو اچھا ماحول اور مناسب محرکات دینے کی ذمہ داری سماج پر آتی ہے۔ ایک نرسری اسکول، اسی ذمہ داری کو نبھانے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہمارے دیس میں صدیوں سے "کنھیا کا بال پن" گایا جاتا ہے لیکن ہمارا بالک آج بھی گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم اپنے بڑوں کے بچپن پر خواہ ایک، اچھی سی کتاب چھاپ لیں، لیکن بچے کے لئے ایک اچھی کتاب کو فضول خرچی ہی سمجھتے ہیں۔ ہم نے دھرتی کے لال کو بال ہی مانا ہے اور اس کی ضرورتوں کو اس کی خاطر شاید ہی کبھی پورا کرنے کا خیال آتا ہو اگر بچے پر لاڈ آجاتا ہے تو اسے 'ضدی'، 'اکل کھرا'، تانا شاہ یا مرزا پھویا ہی بنا کر چھوڑتے ہیں ورنہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ وہ نہ پدے، 'جھگڑالو' اور رُودیّاں بنتے رہتے ہیں۔ اور مٹتے رہتے ہیں۔ ان کی تربیت کا کیا سوال۔ انھیں ہم اپنا تن پیٹ کاٹ کر کھلاتے تو ہیں اور کیا چاہیئے! لیکن یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اب ہم چونک رہے ہیں اور ابتدائی مدرسے سے پہلے کی تعلیم پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ ۱۹۵۰،۵۱ء میں صرف اٹھائیس ہزار کے قریب یہ چھوٹے بچے تربیت پا رہے تھے لیکن پانچ سال بعد یہ تعداد چھہتّر ہزار ہو گئی اور اب تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں پانچ ہزار 'بال واڑیاں' قائم ہیں جن میں سے تقریباً نصف مرکزی اور ریاستی سرکار سے امداد پاتی ہیں۔ اس تیسرے پنجسالہ قومی منصوبے میں بال سیوکا

کی تربیت کے لئے چھ مرکزوں کا قیام طے پایا ہے۔ بچوں کی دیکھ ریکھ کے کاموں کے لئے مرکزی حکومت نے تین کروڑ روپیہ منظور کیا ہے اور ایک کروڑ روپیہ ریاستوں کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ سماجی ترقی (کمیونٹی ڈولپمنٹ) اور سماج سیوا پروگرام (سوشل ویلفیر پروگرام) کے اداروں کے وسائل بھی اس کام کے لئے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اب امداد کی کمی کا سوال بہت اہم نہیں ہے۔ پہلے تو یہ کام صرف رضا کارانہ طور پر ہی انجام پاتا تھا۔ اب تو قومی حکومت بہرحال دست گیری کر رہی ہے۔ اس وقت دراصل سب سے زیادہ ضرورت چھوٹے بچوں کی نگہداشت کرنے والی بال سیوکاؤں کی تعلیم کی ہے۔ اس کے بعد بچے کی تربیت کے جدید نقطۂ نظر کے پیش نظر اس کے ماحول کی مطابقت اور اس کی ضرورت کے مطابق، اس کے لئے سامان فراہم کرنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یوں تو ہم سب بچے کی زندگی میں کھیل کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن اس کی حیثیت اور نوعیت کا سوال کچھ کم ہی ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ ہم اول تو کھیل کی چیز کو بس کھیل سمجھتے ہیں یعنی ناقابلِ توجہ اور اگر کسی قدر کرتے بھی ہیں تو محض قیمت کے اعتبار سے۔ سچ تو یہ ہے کہ عموماً ہم بچے کو اپنی پسند کے مطابق کھیل کھلاتے ہیں اسے کھلونا دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ہماری خواہش کے مطابق اسے استعمال کرے۔ آپ نے غالباً ایسے بھی محتاط والدین دیکھے ہوں گے جو بچوں کے کھلونوں کو بہ حفاظتِ تمام سجا کر رکھتے ہیں اور بچوں کو ان سے کھیلنے نہیں دیتے انھیں کھلونے کے ٹوٹنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور بچے کے دل کو ٹھیس پہنچانے وقت ذرا تامل نہیں کرتے وہ اس بات پر خفا ہوتے ہیں کہ بچے نے ایک قیمتی کھلونا توڑ ڈالا۔ گویا ان کے نزدیک بچے نے کوئی نہایت ہی نامعقول کام کیا ہے۔ غالباً بچے کے لئے لازم تھا کہ اس کھلونے کو محفوظ رکھتا اور پچیس تیس سال بعد ایک بڑے منافع کے ساتھ اسے فروخت کرتا۔ غرضیکہ ہم بچے کے کھیل اور کھلونے کے بارے میں تجاہل اور تغافل دونوں ہی کا شکار ہیں۔ ہمارے نرسری اسکول' اس طرف توجہ تو ضرور کرتے ہیں لیکن عموماً ان کے پاس انمل بے جوڑ بدیسی سامان زیادہ نظر آتا ہے۔ اس بنا پر اس سامان کی حیثیت بہت کچھ نمائشی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے اس معاملے میں خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ چھوٹے بچوں کی ضروریات اور ان کے مطابق کھیل کا سامان فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش ہونی

چاہیئے۔ جامعہ نرسری اسکول میں برابر کوشش ہوتی رہی ہے کہ بچوں کا تربیتی سامان، مقامی طور پر ہوتا رہے۔ اس طرح ایک طرف لاگت بھی کم آتی ہے اور دوسری طرف سامان اپنی ضرورت کے مطابق تیار ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اگرچہ ہم نے دوسرے ممالک کی چیزوں کو پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنایا ہے لیکن ان کے رنگ روپ میں آپ کو خانہ سازی کی سادگی کے ساتھ ساتھ افادیت کا پہلو بھی نظر آئے گا۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ سب اس معاملے میں ہمیشہ مشورہ دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ چھوٹے بچوں کے لئے تربیتی سامان، کے مقامی مرکز کھلنے چاہئیں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہمارے ماہرانِ تعلیم کو قدم اٹھانا چاہیئے۔ نرسری اسکول کے اندر ہم تربیتی سامان، کو نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں بلکہ اسی کو کافی بھی خیال کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین رہا ہے کہ بچے کو اس منزل پر باقاعدہ پڑھانے لکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھیل کود اور ذہنی بیداری کے لئے مناسب سامان، سمجھ داری کے ساتھ دیا گیا تو بچے کی ذہنی ترقی بخوبی ہو سکے گی اور وہ اپنی عمر کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو یقیناً بیدار کر سکے گا۔ لیکن ہمارا یہ احساس ان احباب کو گراں گزرتا ہے جو بچے کی انگلی پکڑ کر اسے ناک کی سیدھ جانا چاہتے ہیں تاکہ زندگی کی مسافت کم سے کم طے کرنی پڑے۔ ان کے نزدیک نرسری اسکول کا زمانہ تضیعِ اوقات کی حیثیت رکھتا ہے۔ کھیل کود اور دوسرے مشغلوں میں بلا وجہ بچے کا قیمتی وقت خراب کیا جاتا ہے۔ اسے جلد سے جلد کتاب خواں، اور حساب داں بنانا چاہیئے۔ سیدھی سی بات ہے جس قدر جلد بچہ نقلِ مکتب، بنے گا، اسی قدر پہلے فارغ التحصیل ہو گا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ بات نہ حقیقت اندیشی ہے اور نہ دور اندیشی۔ نرسری اسکول میں بچے کی بے ضابطہ تربیت، اس کی صلاحیتوں کے ابھارنے میں زیادہ مددگار ہو گی اور ابتدائی مدرسے کی تعلیم کے لئے وہ زیادہ موزوں طور پر تیار ہو سکے گا۔ ہمارے اس مدرسے میں ایک ہی بستی کے بچے آتے ہیں اور قریب قریب سب کا تہذیبی سرمایہ یکساں ہے۔ ہم نے ان کی ضرورتوں کے مطابق ہی اس مدرسے کو بنانے کی کوشش کی ہے۔ غالباً ہماری یہ روش، بچے کی تربیت میں ماحول کی مطابقت پر زور دینے والوں کو پسند آئے گی۔

(یہ مضمون جامعہ نرسری اسکول کے سمینار میں پڑھا گیا)

"فرانسیسی ادب"

مولفہ : ڈاکٹر یوسف حسین خاں

تبصرہ نگار: جناب اسلوب احمد انصاری

اس کتاب میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرانسیسی ادب کا تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ خاص خاص نشاناتِ راہ یہ ہیں۔ قرون وسطیٰ میں فرانسیسی ادب کی ابتدا، کلاسیکی ادب کی ابتدا، اور انتہا، اٹھارھویں صدی کا ادب، انیسویں صدی میں ادب کے مختلف فارم خصوصاً ناول اور تنقید کا ظہور، پارناس اور مریے کے دبستانِ شاعری، بیسویں صدی میں شاعری، ڈراما اور ناول کا ارتقاء، اور سارتر اور اس کی وجودیت۔ ادبی تاریخ کے موجودہ رجحان کے مطابق اس کتاب میں زور تاریخی سلسلہ داری پر نہیں، بلکہ ذہنی ارتقاء کے دھاروں پر ہے۔ فرانسیسی ادب زبان اور ادب کی ابتداء کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ خیال ہوتا ہے، کہ کم و بیش تمام ممالک میں ادب کا آغاز ایک ہی طرح کے عوامل کی پیداوار ہوتا ہے۔ قدیم ترین انگریزی ادب جسے اینگلو سیکسن ادب کہتے ہیں، اور بعد میں درمیانی دور کے انگریزی ادب پر بھی عرصہ تک غیر ملکی ثقافتی اور لسانی موثرات کا غلبہ رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اندرونی اور قومی رجحانات اور تقاضوں نے قوت پکڑی، اور چاسر کے عہد میں جدید انگریزی زبان اور ادب کے خط و خال ایک طور سے متعین ہو گئے۔ صفحہ ۳ پر مصنف کا یہ خوشگوار انکشاف قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، کہ اسلامی فتوحات کے کے زیر اثر، جو قرونِ وسطیٰ میں فرانس کی سرحد تک پہنچ چکی تھیں، پرووانسال کی غنائی شاعری جسے گیارہویں اور بارہویں صدی میں فروغ حاصل ہوا، عربوں کے شعری مزاج کا اثر واضح ہے یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ قرونِ وسطیٰ میں انگریزی غنائی شاعری براہِ راست فرانسیسی شاعری کی مرہونِ منت ہے۔ اور یہ اثر شعری روایات اور اسالیب دونوں میں یکساں نظر آتا ہے۔

اس تفصیلی تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں فرانسیسی تہذیب اور ادبی روایات کے بعض دلچسپ پہلو سامنے آئے ہیں، ان میں سے ایک ان دیوان خانوں کا وجود ہے، جہاں علم و ادب کی صحبتیں منعقد کی جاتی تھیں۔ ان میں مصنف کے بیان کے مطابق میدموزیل دے سابلے، میدموزیل دے اسکو دری، میدموزیل سکاڈری اور میدموزیل دے مینتوں تینوں کے دیوان خانے خاص طور پر مشہور ہوئے۔ ان دیوان خانوں میں جو اعلیٰ خاندانوں کی خواتین کی ملکیت تھے، اکابر جمع ہوتے، علم و فضل کا چرچا ہوتا، اور علمی و ادبی مذاکروں سے فکری اور تخئیلی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع ملتا۔ دوسری اہم چیز فرانسیسی اکیڈمی کا قیام ہے، جس کے ذریعہ نہ صرف اہل علم و ادب کے کمالات کا اعتراف کیا جاتا تھا، بلکہ خود علمی و ادبی رجحانات اور فیصلوں کو بھی ایک مشترکہ بنیاد اور توثیقِ عام حاصل ہوتی۔

اس کتاب میں مصنف کا طریق عمل یہ ہے، کہ انھوں نے ادبی ادوار کو پوری ذہنی اور سماجی زندگی کے آئینہ میں رکھ کر دیکھا ہے، اور انھیں محض کتابوں یا مصنفوں کی رائے شماری تک محدود نہیں کیا ہے۔ پھر ہر دور کے خاص خاص لکھنے والوں کی اہم تصانیف پر کسی قدر تفصیل اور نسبتاً کم اہم پر اختصار کے ساتھ، اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے فکری اور تخئیلی میلانات پر عمومی تبصرہ کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے، کہ تاریخی جائزہ میں ایک ایک تصنیف یا کسی ایک مصنف پر سیر حاصل بحث کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی بعض مباحث کے سلسلہ میں کسی قدر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں فرانسیسی ادب کی جو روایات تھیں، اور جو بڑی حد تک فرانسیسی اور انگریزی ادب میں مشترک ہیں، ان کا مصنف نے ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح اس عہد میں ان رومانی کارناموں کا جنھیں (ROMANCES) کہا جاتا ہے اور جو اس ادب کا ایک قابلِ ذکر حصہ ہیں، مصنف نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح موپاساں کا ذکر بہت سرسری طور سے کیا گیا ہے حالانکہ مختصر کہانی کے فن کے معماروں میں اس کا نام سر فہرست ہے۔ اسی طرح رمزیت (SYMBOLISM) کی تحریک، جو ایک معنی میں رومانیت کی توسیع ہے، اور جس کا اثر جدید انگریزی شاعری پر گہرا اثر پڑا ہے، کسی قدر تفصیلی تعارف کا مطالبہ کرتی تھی۔ جدید فرانسیسی ادب کے سلسلہ میں عام طور پر اور جدید ڈرامہ پر خاص طور سے،

اگر مصنف پڑھنے والوں کو اور زیادہ اطلاع بہم پہنچاتے، تو ایک بڑی ادبی خدمت ہوتی۔
ایسے پڑھنے والوں کے لئے جو فرانسیسی سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ہی انگریزی اور اردو ادب سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ مماثلت دلچسپی سے خالی نہیں، جو ان تینوں زبانوں کے بعض مصنفین کے درمیان پائی جاتی ہے، اور جس کا اس کتاب کو پڑھنے کے دوران میں اکثر خیال آتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۷۹ پر مصنف نے لارڈش فوکو کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "اگر ہم اپنے جذبات پر قابو پالیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جذبات کمزور تھے، نہ یہ کہ ہم میں ایسا کرنے کی قوت تھی"۔ مصنف نے توارد ذہنی کو ثابت کرنے کے لئے عرفی کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی شاعر ولیم بلیک کا یہ قول بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ THOSE WHO RESTRAIN DESIRE DO SO BECAUSE THEIRS IS WEAK ENOUGH TO BE RESTRAINED

اسی طرح الفرد دے دنی کے بارے میں صفحہ ۲۸۷ پر مصنف نے لکھا ہے "وہ اپنے جذبے کو تصور کی شکل میں اور تصور کو رمز کی شکل میں تحلیل کر دیتا تھا۔ اس کے یہاں فنی تخلیق ریاضت چاہتی تھی"۔ اس بیان کو پڑھ کر ذہن فوراً سترھویں صدی کے ان انگریزی شاعروں کی طرف منتقل ہوتا ہے، جو عام طور پر مابعد الطبیعیاتی شاعر کہے جاتے ہیں اور جن کا امتیاز یہی تھا، کہ وہ مختلف النوع جذبات، کیفیات اور تصورات کو ایک ہم آہنگ وجود میں سمو سکتے تھے، اور رمز بلیغ (   ) سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح استاں دھال کے بارے میں مصنف نے صفحہ ۳۴۰ پر لکھا ہے "استاں دھال کے سامنے نپولین کی غیر معمولی توانائی اور قوت عمل کا نمونہ تھا۔ جو اس کے تخیل کے روبرو نصب العین کے طور پر تھا، جس کو عمل میں سب سے زیادہ مسرت ملتی تھی۔ استاں دھال توانائی اور قوت کے مظاہر کو سراہتا تھا..... استاں دھال کے کرداروں کے سمجھنے کے لئے قوت و توانائی کے اصول کو سمجھنا ضروری ہے"۔ ان جملوں کو پڑھ کر معاً اقبال کا خیال آتا ہے، کیونکہ وہ بھی قوت اور توانائی کے اصول کے پرستار تھے، اور مسولینی کے لئے اپنے دل میں جذبۂ ستائش رکھتے تھے۔ اس طرح صفحہ ۵۳۶ پر مالرو کے بارے میں یہ جملے ملتے ہیں "مالرو کا خیال ہے کہ اعلیٰ درجہ کی فنی تخلیق بغاوت کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ اس بغاوت کے بطن سے خیال اور عمل کی ندرت جنم لیتی ہے، اگر یہ نہ ہو،

تو تخلیقی آزادی سلب ہو جائے، جو فنونِ لطیفہ اور ادب کی جان ہے۔" ان جملوں کو پڑھ کر ذہن اقبال کی ضربِ کلیم کی ان نظموں کی طرف منتقل ہوتا ہے، جو "فنونِ لطیفہ" کے عنوان کے تحت درج کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں جامعیت، نظر کی گہرائی، اور مطالعہ کی وسعت کا ثبوت جگہ جگہ ملتا ہے مصنف نے جتنے بڑے رقبہ کو اس کتاب میں سمیٹا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ نہ کہیں تکرار اور اعادہ ہے، اور نہ کہیں استدلال میں کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ تاریخی مواد اور حقائق کو معروضی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا ہے، اور انھیں کہیں بھی گھٹا بڑھا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود انداز بیان کی شگفتگی اور دل نشینی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مصنف نے مختلف لکھنے والوں کے بارے میں جو رائیں قائم کی ہیں، وہ مدلل اور محتاط ہونے کے ساتھ ہی وسعتِ نظر اور شادابیٔ ذہن کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ راسین کے بارے میں صفحہ ۱۵۲ پر لکھتے ہیں:

"وہ یونانی تاریخ اور دیومالا سے جب اپنی شخصیتیں مستعار لیتا ہے، تو دراصل وہ اپنے جذبہ اور تخیل کو ایک وسیع تر بصیرت کا جز بنانا چاہتا ہے۔ اور شعر و نغمہ کے ذریعہ ان پیکروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ اس کی نفسیاتی حقیقت پسندی اس کی شاعرانہ بصیرت میں ضم ہو جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر اس کے المیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔"

وکٹر ہیوگو کے متعلق صفحہ ۲۹۷ پر یہ جملے ملتے ہیں:

"وہ لفظوں کی تراش خراش اور انتخاب پر بڑی محنت کرتا تھا۔ اتنی محنت شاید کسی دوسرے رومانی مصنف نے نہ کی ہوگی۔ لیکن وہ بیچارہ کیا کرے۔ اس کے اشارۂ ابرو پر لفظوں کے قافلے کے قافلے کبھی صف بندی کے ساتھ اور کبھی خود ہی بے ترتیب حالت میں اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور اپنی اپنی خدمات پوری عقیدت اور خلوص کے ساتھ پیش کرتے تھے۔"

میوسے کے بارے میں صفحہ ۳۰۶ پر لکھتے ہیں:

"اس کی شاعری ایک مکالمہ معلوم ہوتی ہے نہ جس میں اس کی روح کا اعتراف

سنائی دیتا ہے۔ اس مکالمہ میں ذاتی جذبات اور احساسات، خارجی تاثرات سے مل کر اپنا رنگ نکھارتے ہیں، اور اس کی خود رفتگی اور ربودگی کے لئے سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنی روح کی گہرائی میں خارجی حقیقت کی قلب ماہیت کر کے جو تخئیلی پیکر تخلیق کرتا ہے، ان کی تازگی میں حقیقت کی خوشبوئیں بسی ہوئی ہوتی ہیں۔"

ایک دلچسپ سوال جو فرانسیسی ادب کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ ہم فرانسیسی ذہن کو کلاسیکی کہیں گے یا رومانی؟ غالباً اس سوال کا کوئی قطعی جواب ممکن نہیں۔ فرانسیسی نثر کا جب ہم بحیثیت مجموعی جائزہ لیتے ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ یہ نثر کی بنیادی خوبیوں، جیسے نظم و ضبط، تقلیل الفاظ اور منطقی ترتیب اور خیال اور بیان کے درمیان گہری مطابقت سے پوری طرح آراستہ ہے، اور جذبہ یا آرائش کی بجائے محاکمہ اور فیصلہ کی زبان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ قرون وسطیٰ سے لے کر آج تک جن جن تحریکوں میں رومانی عناصر کی کارفرمائی رہی ہے، ان سب کا سرچشمہ بھی فرانس ہی کی سرزمین رہی ہے۔ اس کے علاوہ اصلاح مذہب کی تحریک کو بھی یہاں کافی فروغ نصیب ہوا، اور انقلاب فرانس نے جو فرد کی برتری کا سب سے زیادہ پر زور اعلان اور فرسودہ سیاسی اور سماجی اداروں کے خلاف سب سے زیادہ بلند بانگ احتجاج تھا، یورپ کے ممالک میں آزادی کا صور پھونک دیا۔ ان سب تحریکوں کا رشتہ بھی دراصل رومانیت ہی سے ملتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا، کہ ذہنی احتجاج کی لہر، اور تجربہ کی بے چین خواہش، جیسی فرانس کے اہل علم و عمل میں تیز رہی ہے، اتنی شاید انگلستان اور جرمنی میں بھی نہ رہی ہو۔ معمولاً بھی فرانسیسی قوم انگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ حریت پسند اور تلون آشنا رہی ہے۔ اس لئے ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے، کہ فرانسیسی مزاج دراصل رومانیت کے عناصر ترکیبی سے نسبتاً زیادہ ہم آہنگ ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، ادبی تاریخ، تنقیدی مطالعہ کا بدل نہیں ہے۔ اور اس لئے ادبی تاریخ نگار موضوع کی گہرائیوں میں نہیں جا سکتا۔ ادبی تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے

کہ وہ ہمیں ذہنی اور تخیلی تسلسل کا احساس دلائے۔ ظاہر ہے کہ یہ تسلسل خلا میں پرورش نہیں پاتا، بلکہ ٹھوس اور معروضی حالات کے چوکھٹے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انفرادی ادبی کارنامے تاریخ بناتے بھی ہیں، اور پچھلے کارناموں کے بعض عناصر کو غیر شعوری طور پر اپنے اندر جذب بھی کرتے ہیں۔ اس لئے تاریخی جائزہ محض الگ الگ کارناموں کا جائزہ نہیں، بلکہ عوامل، روایات اور فکری اور فنی اسالیب اور اقدار کا جائزہ بھی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے جو تاریخ داں اور ادیب، دونوں حیثیتوں سے معروف ہیں، ادبی واقعات اور حقائق کو تاریخی پس منظر میں رکھ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو زبان میں غیر زبانوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، ان میں اس کتاب کے علاوہ صرف پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "روسی ادب" جو عرصہ ہوا انجمن نے شائع کی تھی، قابلِ ذکر ہے۔ فرانسیسی ادب کی یہ تاریخ اردو ادب کے محدود سرمایہ میں ایک بہت ہی گراں قدر اضافہ ہے۔ انگریزی زبان کی وساطت سے فرانسیسی ادبی تحریکات کا جدید اردو شاعری پر بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ ایک بڑی اور گراں مایہ زبان کے شاہ کاروں سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنے طور پر انگریزی اور اردو زبانوں کے ادب اور شاعری پر ان کے تخلیقی اثرات کا اندازہ لگانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

کتاب ٹائپ میں شائع ہوئی ہے، ۵۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے تیرہ روپے میں مل سکتی ہے۔

سیاسی نظریئے —— افلاطون اور ارسطو

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۲۰۴، کتابت وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش۔
قیمت چار روپے۔ تاریخ طباعت: جون ۶۳ء۔ ناشر: قومی کتاب گھر، دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی)

پیش نظر کتاب میں افلاطون اور ارسطو کے سیاسی خیالات اور نظریے کو اس طرح پیش

کیا گیا ہے کہ اس زمانے کی تہذیب و تمدن پر بھی ایک سرسری نظر پڑجاتی ہے۔ مؤلف اس نہج پر دو کتابیں اور لکھ رہے ہیں، پہلی میں عہد اوسط کے ممتاز مفکرین کے اور دوسری میں عہد جدید کے سیاسی مفکرین کے افکار اور نظریات سے بحث کی جائے گی۔

مؤلف اردو کے اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں، ان کا طرز بیان دل کش اور زبان صاف ستھری ہوتی ہے، اس لئے یہ کتاب جہاں عام پڑھنے والوں کے لئے کارآمد ہے، وہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوگی، اس لئے نصاب تعلیم میں اسے شامل کیا جاسکتا ہے اور پبلک لائبریریوں کے لئے منظور کیا جاسکتا ہے۔

نگار (رام پور) اڈیٹر : اکبر علی خاں

اردو صحافت میں نگار (لکھنؤ) کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اس کامیابی میں تمام تر جناب نیاز فتحپوری کی ہمہ گیر شخصیت کا دخل ہے۔ پچھلے سال کچھ نامعلوم اسباب کی بنا پر نیاز صاحب پاکستان چلے گئے، اس وقت سے ان کا نگار بھی کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ جنوری ۶۳ء سے جناب اکبر علی خاں صاحب نے رام پور سے نگار نکالا ہے اور اعلان کیا ہے کہ "نگار (لکھنؤ) سے رام پور آ گیا ہے" چنانچہ جلدوں کا شمار نیاز کے نگار ہی سے کیا گیا ہے۔ مگر ظاہر ہے نگار کی جو خصوصیات نیاز صاحب کی جودت طبع کی رہین منت تھیں وہ محض جلدوں کے تسلسل سے پیدا نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اب تک جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں ان کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ رام پور کا نگار بھی اردو ادب میں ایک مخصوص جگہ بنائے گا۔

پہلے شمارہ کے ملاحظات میں لکھا گیا ہے کہ "نگار نے بڑے معرکے کے سالنامے نکالے ہیں۔ اب بھی اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دئے جائیں گے۔" چنانچہ اب ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ نگار کی گذشتہ روایات سے قطع نظر ہم اس تجویز اور فیصلہ کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ رام پور کا نگار اپنا ایک الگ معیار قائم کرے گا۔ (ع ل ا)

کوائف جامعہ

نئے امیر جامعہ — جناب ڈاکٹر ذاکر حسین

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک سیاسی پر آشوب زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے بانیوں کے ارادے نیک تھے، ان کی نیتیں مخلصانہ تھیں، ان کے عزائم بلند تھے اور وہ جامعہ کو مسلمانوں کی ایک شاندار اور عظیم الشان یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے چند ساتھی جامعہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تو جامعہ کا آج شاید وجود ہی نہ ہوتا، نیز ذاکر صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسے سیاست کی تنگ ڈگر سے ہٹا کر تعلیم کی وسیع شاہراہ پر لگایا، اور اسے نئی تعلیم کی تجربہ گاہ اور قومی تعلیم کا مرکز بنایا۔

جامعہ سے یوں تو ذاکر صاحب کا تعلق اول دن سے ہے، مگر جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۶ء میں واپس آئے تو کم از کم بیس سال تک (یا تاحیات ان میں سے جو زیادہ ہو) جامعہ کی خدمت کا عہد کیا اور شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اس کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالی اور پورے استقلال اور عزم کے ساتھ کوئی ربع صدی تک انتہائی نامساعد حالات میں اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں بعض بزرگان قوم کے مشورہ اور اپنے ساتھیوں کی اجازت سے انتہائی نازک زمانے میں مسلم یونیورسٹی کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس وقت سے، اگرچہ دلی تعلق باقی رہا اور ان کے جانشین پروفیسر محمد مجیب صاحب کو ان کا تعاون حاصل رہا، مگر ظاہری تعلق منقطع ہو گیا تھا۔ اب جبکہ جامعہ کا قدیم خواب پورا ہوا، اسے یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہوئی اور خدمت کے مواقع پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو گئے تو ہمیں خوشی ہے کہ ان کا براہِ راست تعلق پھر قائم ہو گیا ہے

جامعہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر یقیناً بڑی خوشی ہوگی کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ابھی حال میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو امیر جامعہ (چانسلر) منتخب کیا ہے اور موصوف نے جامعہ سے غایت محبت کی بنا پر اسے قبول فرمالیا ہے۔ یہ جامعہ کی انتہائی خوش قسمتی اور اس کے لئے فال نیک ہے کہ اسے ذاکر صاحب جیسے مخلص اور ماہر تعلیم کی خدمات حاصل ہوئیں۔

نئے خازن جامعہ —— جناب بشیر حسین زیدی

دوسری خوش کن خبر یہ ہے کہ جناب کرنل بشیر حسین زیدی جامعہ کے خازن مقرر ہوئے ہیں زیدی صاحب کا جامعہ سے ایک طویل عرصے سے گہرا تعلق رہا ہے اور موصوف نے بعض نہایت نازک مواقع پر جامعہ کی بڑی گراں قدر مدد فرمائی ہے۔ موصوف کافی عرصے تک ریاست رامپور کے وزیر اعظم اور کوئی سات سال تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں، علاوہ ازیں قومی کاموں سے ہمیشہ تعلق رہا ہے، اس لئے امید ہے کہ موصوف کے انتخاب سے موجودہ نئے حالات میں جامعہ کو بیش از بیش فائدہ پہنچے گا۔

ماہنامہ تعلیم و ترقی کا خاص نمبر

مرحوم شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی نے تعلیم بالغان کی ترویج و اشاعت کے لئے ادارۂ تعلیم و ترقی کی بنیاد رکھی تو کچھ عرصے کے بعد ادارہ کے نام پر اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا۔ شروع میں صرف اردو میں نکلتا تھا، مگر ملک کی ضرورت کے پیش نظر اب ہندی میں بھی شائع ہوتا ہے۔ آج کل اس کے ایڈیٹر جناب برکت علی فراق اور جناب فیض محمد شاستری ہیں۔ مارچ ۶۲ء میں اس کا سالنامہ شائع ہوا ہے جس میں اختصار کے ساتھ جامعہ ملیہ کی تاریخ اور ارتقاء پر اور تفصیل کے ساتھ ادارۂ تعلیم و ترقی کے مقاصد اور اس کے نشو ونما پر روشنی ڈالی گئی ہے جو لوگ بالغوں کی تعلیم کے متعلق جامعہ کے تجربات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس خاص نمبر کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ اس پرچے کی قیمت دو روپے اور سالانہ چندہ چار روپے ہے۔ ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے خریدا جا سکتا ہے۔

(ع ل ا)

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

Regd. No. D - 768 July, 1963
The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹	بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۴

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

تعلیم کا فلسفہ

پروفیسر محمد مجیب

انسان کو شاید جس بات کا سب سے پہلے احساس ہوا وہ زندگی اور موت کا فرق تھا۔ اور اس وقت سے اب تک وہ موت سے بچنے کی طرح طرح سے تدبیریں کرتا رہا ہے جسم کو تو محفوظ رکھا نہیں جا سکتا تھا، بقا کی صورت صرف یہ ہو سکتی تھی کہ نسل کو قائم رکھا جائے اور اسے قائم رکھنے میں صرف تندرستی کے طریقوں پر بھروسہ نہ کیا جائے، بلکہ ان سے گذر کر ان قدروں کا سہارا لیا جائے، جن کی بدولت زندگی میں معنی اور مقصد پیدا ہوتے ہیں تعلیم کا سلسلہ جب شروع ہوا یہیں سے شروع ہوا۔ اب اگر ہم پیچھے مڑ کر انسان کی ہزاروں برس کی تاریخ کو دیکھیں تو تعلیم کی شکلیں، اس کے طریقے بدلتے ہوئے نظر آئیں گے، اس میں نئی وسعتیں پیدا ہوتی، نئے شوق کارفرما ہوتے ملیں گے، لیکن بنیادی طور پر اس کا مقصد وہی رہا ہے جو شروع میں تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تعلیم کا مقصد مقرر کرنا کبھی بھی آسان تھا۔ قدروں کی ترجمانی ہمیشہ کسی نظام حیات کی شکل میں کی گئی جسے شریعت یا دھرم بھی کہہ سکتے ہیں اور اسے قائم رکھنے کی ایک صورت یہ سمجھی گئی کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے دی جائے اور دوسری یہ کہ قاعدے قانون کے اصل منشا کو اس کی ظاہری شکل پر ترجیح دی جائے۔ قدیم مصر، ہندوستان، یونان جہاں کہیں بھی دیکھئے، ظاہر اور باطن کی کشمکش نظر آئے گی اور یہ کشمکش خود معلموں نے پیدا کی، مثلاً قدیم ہندوستان میں عقیدہ، رسم اور دستور کی بنیاد پر دینی زندگی کو ایک خاص شکل دی گئی، مگر ان فلسفیوں نے جن کے تصورات اپنشدوں میں ملتے ہیں یہ کہا کہ یہ تمام رسمیں جو برہمن ادا کرتے ہیں اصل میں انسان کے وجود کا مقصد کہ اس کی ذات اصل وجود میں یعنی اس کی آتما پرم آتما میں فنا ہو جائے ان رسموں کے

ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ یونان میں روایتی مذہب کے مقابلے پر ایسے تصورات لائے گئے ہیں جن پر صحیح زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی اور افلاطون کی مشہور کتاب ریاست میں زندگی کے ایک پورے نظام کا خاکہ ملتا ہے جس کی بنیاد عدل پر رکھی گئی اور جسے قائم رکھنا تعلیم کا منصب قرار دیا گیا۔ مسلمانوں میں قریب ایک ہزار سال سے شریعت اور طریقت، کتابی اور وجدانی علم، عقل اور عشق کی آویزش نظر آتی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں اگر ایک طرف یہ میلان ہے کہ مسلسل تغیر کو بقا کا ضامن قرار دیا جائے تو دوسری طرف اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انسان کو معلوم اور معین عقیدوں یا علمی اور سماجی نظریوں کا پابند رکھا جائے، یا پھر لوگ اس کا گلہ کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ دبدھا میں دونوں گئے، نہ مایا ملی نہ رام۔ تعلیم کے ایسے اصول اور طریقے جن میں قیام اور تغیر دونوں کی قدروں کو ہم آہنگ کیا گیا ہو فرض تو کئے جا سکتے ہیں مگر انھیں عمل میں لانا اسی وقت ممکن ہوگا جب ایسے استاد ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مل جائیں جن کی اپنی طبیعتوں میں نئی اور پرانی قدریں ہم آہنگ ہو گئی ہوں، اس لئے کہ ایسے ہی استاد نئی نسلوں کی رہنمائی کر سکیں گے۔

ایک اور مشکل یہ ہے کہ تعلیم کے مقاصد صرف ذہنی اور روحانی نہیں بلکہ مادی بھی ہیں، انسان کی اخلاقی تربیت کا کوئی طریقہ کامیاب نہیں ہو سکتا اگر اس میں روزگار کے مسئلے کو نظر انداز کیا جائے۔ اب دنیا کے اکثر حصوں میں دینی تعلیم کا وہ مرتبہ نہیں رہا ہے جو دو تین سو برس پہلے تھا، اب اسے شہریت اور اخلاق کی تعلیم کا روپ دے دیا گیا ہے، جس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ خالص مادی اغراض کا مقابلہ کر سکے جب کہ زندگی کا نقشہ صنعت اور کاروبار کی ضرورتیں بناتی اور بگاڑتی ہیں۔ بے شک محسوس کیا جاتا ہے کہ تعلیم کو اخلاقی اور روحانی قدروں سے بے تعلق نہ ہونا چاہیے، اور کہیں کہیں تعلیم کو آزاد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن ایسے ملک بھی ہیں جن میں تعلیم کو اصولاً معاشی اور سماجی اغراض کا پابند کر دیا گیا ہے۔ اس بات کو ہم صحیح سمجھیں یا غلط، تعلیم کا منصب وہی رہتا ہے جو شروع میں تھا، یعنی وہ نظام زندگی کے تحفظ کی ذمہ داری جاتی ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ تعلیم صرف ایک اثر ہے جس کو متضاد مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دین کو قائم رکھنے اور اس کی جڑوں کو اکھاڑنے کے

لئے، انسان کو یہ سمجھانے کے لئے کہ اسے آزادی اور یک سوئی کے ساتھ اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنے مقاصد کے حصول میں مصروف رہنا چاہیئے اور اسے اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ دولت پیدا کرسکے، چاہے اس کی خاطر اسے اپنی شخصیت کو قربان کرنا پڑے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ تعلیم کا ایک الگ فلسفہ ہے، اس کے اپنے مقاصد ہیں، اپنا نصب العین ہے، وہ سراسر خادم نہیں بلکہ ایک حد تک مخدوم بھی ہے؟

اس سوال کا جواب سب کی طرف سے نہیں دیا جا سکتا، اسے ہر ایک کو اپنے لئے اور اپنی ذمہ داری پر دینا چاہیئے۔ میں خود اپنی استعداد کو دیکھتا ہوں تو ایک قصہ یاد آتا ہے جو ایک دوست نے کچھ دن ہوئے سنایا تھا کہ بنگال کے مشہور عالم ودیا ساگر سے ان کے ایک معتقد ملنے کے لئے کلکتہ آئے، وہ شہر سے واقف نہ تھے، اسٹیشن سے نکلے تو ان کی نظر ایک جوان پر پڑی جو بظاہر بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا، انھوں نے اس سے ودیا ساگر کا پتہ پوچھا، اس نے کہا کہ ودیا ساگر کا پتہ کسی کو معلوم نہیں، چلئے میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔ بیچارہ مسافر صبح چھ بجے سے سہ پہر کو چار بجے تک نوجوان کی رہنمائی میں بھٹکتا رہا، جب آخر کار ودیا ساگر کے مکان پر پہنچا اور ان کو اپنی بپتا سنائی تو وہ ہنس کر بولے کہ میں اس نوجوان کو اچھی طرح جانتا ہوں، یہ فلکیات کا ماہر ہے، آسمان کے جغرافیہ سے بہت اچھی واقفیت رکھتا ہے، زمین کے جغرافیہ کو بالکل نہیں سمجھتا۔ جو لوگ تعلیم کے مقاصد کی کھوج کرتے ہیں وہ اکثر اس کی فلکیات میں گم ہو جاتے ہیں، ان کے فکر میں دنیا کی حیثیت سیاروں میں ایک سیارے کی سی ہو جاتی ہے، وہ وقت کا حساب اس انداز سے لگاتے ہیں کہ رات دن کیا، صدیاں ایک پل سے بھی کم معلوم ہوتی ہیں، کائنات کے کیمیائی تغیرات کا حال اس طرح بتاتے ہیں کہ آدمی کو بھوک اور پیاس کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر کیا وہ لوگ جو صرف اس دنیا کی بات کرتے ہیں اور آسمان کی طرف دیکھنا بھی غیر ضروری ٹھہراتے ہیں ہمیشہ مفید اور معاملہ کی بات کہتے ہیں؟ اس کا حال آپ کو مختلف ملکوں کی تعلیمی رپورٹوں سے معلوم ہو جائے گا اور جن ملکوں میں تعلیم اور معاشی اغراض کا رشتہ بہت قریبی اور مضبوط کر دیا گیا ہے اور اس کا نتیجہ عام خوشحالی

اور بے روزگاری کا انسداد ہوا ہے ان ملکوں میں ذہنی بے چینی کے آثار اور خودکشی کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے دراصل دنیا میں کوئی اپنا گھر بنا کر سکون سے نہیں رہ سکتا جب تک کہ وہ آسمان میں بھی اپنا گھر نہ بنائے۔ یہ مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے کہ اس آسمانی مکان کے لئے مسالا کہاں سے آئے اور اس کے نقشے کی منظوری کس سے اور کس طرح لی جائے لیکن یہ دشواری ایسی نہیں ہے کہ جس کا کوئی حل نہ ہو۔ آخر دہلی میں کارپوریشن کے ہوتے ہوئے بھی گھر بن ہی جاتے ہیں۔

معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لئے پھر اسی مقام پر چلیے جہاں سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کیا انسان نے جب صحیح زندگی کے ابتدائی خاکے بنانے اور انھیں نئی نسل کے دلوں پر نقش کرنے کے لئے تعلیم کو ذریعہ بنایا تو اس کے دل میں بھوک اور خوف کے عالم میں سلامت رہنے کی خواہش کے سوا کوئی اور محرک نہ تھا؟ کیا اس کے وجدان نے اسے یہ نہیں بتایا کہ بقا کی آرزو دراصل فنا کی آرزو ہے اور انسان زندہ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے جسمانی وجود کو مادی وجود کی ایک کیفیت کہہ سکے؟ کیا ہر زمانے میں ہر معلم نے موجودہ نظام زندگی کی قدروں کا احساس ایک ہی طریقہ پر ایک ہی انداز سے دلایا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ تعلیم کے اصل مقصد کی جستجو دین کی جستجو تھی۔ جس طرح دین نہیں بدلا۔ تشریحیں بدلتی رہیں، ویسے ہی تعلیم کا اصل مقصد ایک رہا۔ اسے حاصل کرنے کی تدبیریں بدلتی رہیں۔ گویا تعلیم کا منصب یہ تھا کہ وہ انسان کو اپنے خالق سے یہ پوچھنے پر آمادہ کرے کہ اسے پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا اور اسے جو جواب ملے اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی گذارے، تعلیم کے طریقے یہ طے کرنا سکھاتے رہے کہ کون دین دار ہے اور کون گمراہ، کون عقلمند ہے اور کون بے وقوف، کون کامیاب ہے، کون ناکامیاب اور یہی طریقے انسان کو اس کا اطمینان دلاتے رہے کہ اس کے خالق نے جس مقصد سے اسے پیدا کیا تھا، وہ پورا ہوتا ہے تعلیم کے فلسفی کے لئے یہ بڑا کام باقی رہا کہ وہ انسان میں اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے کا شوق پیدا کرتا رہے اسے گفتگو کے آداب سکھائے اور اسے اطمینان دلاتا رہے کہ گنہگاروں کی دنیا میں تائب کے لئے ہمیشہ جگہ رہے گی۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

کشفِ حجابات

حضرت روش صدیقی

زندگی، جب سے شناسائے محالات ہوئی
سچ تو یہ ہے کہ خود اپنے سے ملاقات ہوئی

پردۂ غم جسے سمجھا تھا وہی خاموشی
کل تری بزم میں موضوعِ حکایات ہوئی

ہم کو اے قافلۂ شوق یہ کیا یاد رہے
کہ ہوئی صبح کہاں اور کہاں رات ہوئی

تیری دزدیدہ نگاہی کا خیال آتے ہی
دل میں اک روشنیٔ کشفِ حجابات ہوئی

اس قدر سہل کہاں مرحلۂ سوز و گداز
رات بھر شمع کا جلنا بھی کوئی بات ہوئی

پاسِ آدابِ محبت کہ یہاں راز و نیاز
مدتوں، بادِ صبا سے نہ کوئی بات ہوئی

جس کی محفل کو روش جنتِ فردا کہیے
کل اسی خسروِ خوباں سے ملاقات ہوئی

(غیر مطبوعہ)

مُسلم حکومتوں میں غیر مُسلم وُزراء

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

اسلام نے ان تمام غیر مسلموں کو جو نظام اسلامی کے تحت زندگی بسر کرنا قبول کریں "ذمی" قرار دیا تھا یعنی ان کے جان و مال عزت اور مذہب کے بقاء و حفاظت کی پوری ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد کی گئی تھی۔ اس کے معاوضہ میں ان سے ایک حقیر سالانہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جسے "جزیہ" کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ حکومت کی مذکورہ خدمات کی "جزاء" یا بدلہ ہوتا تھا۔ یہ رقم کسی صورت میں بھی ۴۸ درہم سالانہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی یعنی ایک روپیہ ماہوار۔

اس حقیر رقم کی ادائیگی کے بعد، ان کو ہر قسم کا اعتماد، اطمینان اور تحفظ حاصل تھا۔ مصر، شام، عراق اور اسپین میں عیسائی یہودی اور قبطی، فارس میں مجوسی اور ہندوستان میں ہندو پوری آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی تقریبات مناتے تھے، اپنے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کرتے تھے، اپنی عبادت گاہیں اور مدارس تعمیر کرتے تھے ان کو اپنے ملی و مذہبی معاملات میں نہ صرف پوری آزادی حاصل تھی بلکہ مسلم حکمرانوں کی مدد اور سرپرستی بھی۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کا پرسنل لا محفوظ تھا۔ وہ اپنے مقدمات اپنے ہی حاکم سے فیصل کراتے تھے۔ یہ حکام اپنے ہی مذہب کے حاکم اعلیٰ سے وابستہ ہوتے تھے جس کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس طرح اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہر اہل ملت کا اپنا مخصوص ملی نظام قائم تھا۔

آدم متنر نے تصریح کی ہے،

"عہد حکومت عباسیہ میں، دار الخلافہ بغداد میں، خلیفہ کی طرف سے دوسرے اہم ترین عہدہ داروں

کی طرح نسطوری اور یعقوبی عیسائیوں کے لئے الگ الگ لاٹ پادری مقرر کئے جاتے تھے، جنھیں جاثلیق کہتے تھے۔ ان دینی رئیسوں کے تحت ان دونوں اہم عیسائی فرقوں کا مذہبی نظام قائم تھا۔

اسی طرح یہودیوں کا مذہبی نظام بھی قائم تھا۔ رئیس یہود کو **ملک** (بادشاہ) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ یہودیوں سے اپنے طور پر ٹیکس وصول کرتا تھا جس کا نصف حصہ خود رکھ لیتا تھا اور نصف بیت المال میں بھیج دیتا تھا۔ بغداد کا یہودی حاکم اعلیٰ "راس الجالوت" کہلاتا تھا۔

بلاد فارس میں مجوسیوں کو بھی یہی حقوق دیے گئے تھے۔ ان کے مذہبی سردار کو بھی شاہانہ القاب سے ملقب کیا جاتا تھا اور اس کے اہل مذہب اسے بھی مذہبی ٹیکس ادا کرتے تھے۔"[1]

گویا ممالک اسلامیہ میں اسلامی حکومت کے تحت، غیر مسلموں کے مختلف فرقوں کی اپنی اپنی دینی ریاست قائم تھی جس کے تحت وہ اپنے مذہبی احکام کے مطابق اپنی زندگی کا نظام بناتے تھے۔

سلاطین اسلام نے غیر مسلموں کے پرسنل لا میں مداخلت میں جو احتیاط برتی ہے غیر اسلامی حکومتوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مثلاً عام قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مال و جائداد چھوڑ کر مر جائے اور اس کا کوئی شرعی وارث موجود نہ ہو تو وہ مال خزانہ حکومت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی قانون آج بھی تمام متمدن ملکوں میں رائج ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں اسلامی حکومتوں کا طرز عمل دیکھئے۔ اسلامی حکومتوں نے غیر مسلموں کے متروکہ مال کو انکی ملت کے ہی سپرد کرنا ضروری قرار دیا۔

مقتدر باللہ عباسی نے اپنے زمانہ میں بغداد کے قاضی یوسف بن یعقوب سے ذمیوں کے متروکہ اموال کے سلسلے میں سوال کیا تو قاضی صاحب کا جواب یہ تھا کہ: ——

۱؎ **Adam Metz** بواسطہ التاریخ الاسلامی السیاسی ج ۳ ص ۳۰۱۔

"رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوتی۔
سنت رسول اللہؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلم میت کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کے مال
کے وارث اس کے اہل ملت ہی ہوں گے خزانہ عام میں داخل نہ ہوگا"[۱]

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لاوارث مسلمانوں کے متروکہ مال سے تو غیر مسلم ذمی استفادہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بیت المال میں داخل ہو جاتا تھا۔ اور بیت المال سے فائدہ حاصل کرنے کا حق مسلم اور غیر مسلم سب کو تھا۔ مگر لاوارث غیر مسلموں کا چھوڑا ہوا مال ان کے مخصوص دینی نظام کے تحت صرف ان ہی کے مفاد میں صرف ہوتا تھا۔ مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

مسلم حکومتوں میں غیر مسلموں کا عمل دخل کس حد تک تھا؟ آیئے اس پر ایک نظر ڈالیں۔

عہد خلافت راشدہ میں غیر مسلموں کو نظم و نسق حکومت میں دخیل نہیں بنایا گیا۔ حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حیرہ کے نصرانیوں میں سے ایک غلام ہے جو انشاء پرداز، اور کلام شعراء و ادباء کا حافظ ہے۔ آپ اسے اپنا کاتب (سکریٹری) بنا لیجئے"

حضرت عمرؓ نے انکار فرما دیا اور کہا "اگر میں ایسا کروں تو مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ہمراز بنا لوں گا" یہ دراصل تو قرآن کریم کی ایک آیۃ کی طرف اشارہ تھا۔ لیکن یہ اس زمانہ کا واقعہ تھا جب خلافت اسلامی کی بنیادیں اٹھ رہی تھیں اور ایرانی اور رومی اس نو تعمیر عمارت کو گرانے کے لئے ہر قسم کی سازشوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ انہی سازشوں کا شکار ہوئے۔

مگر عہد خلافت راشدہ کے بعد، جب اسلامی حکومت کو استحکام حاصل ہوا، فاتحین و مفتوحین میں تمدنی و معاشرتی روابط قائم ہوئے، ازدواجی تعلقات نے غیریت کے پردے اٹھا دئے، ملک میں امن و اتحاد کی فضا قائم ہوگئی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ غیر مسلم اسلامی حکومت کے نظام سے بے تعلق رہیں؟

---

[۱] کتاب الوزراء للصابی ص ۲۴۸۔

اسلامی حکومت میں خلیفہ یا سلطان کے بعد سب سے بڑا منصب "وزیر" کا ہے۔ اس کے بعد کاتب (چیف سکریٹری) اور والی (گورنر) وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ عہد عباسی میں یہ سوال فقہی حیثیت سے فقہاء اسلام کے سامنے آیا کہ "آیا اسلامی حکومت میں غیر مسلم وزارت کے عہدہ پر فائز ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

عباسی حکومت میں وزارت کے جو مختلف انداز چل رہے تھے ان کے پیش نظر فقہاء کرام نے وزارت کی دو قسمیں قرار دیں۔ (۱) وزارت تفویض اور (۲) وزارت تنفیذ للماوردی ۴۵۰ھ نے ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

وزارت تفویض اور وزارت تنفیذ میں اختیارات کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ:

(۱) وزیر تفویض۔ اپنی رائے سے ملکی معاملات و مقدمات کے فیصلے کر سکتا ہے۔ (۲) والی (گورنر) اور عامل (کلکٹر) وغیرہ اپنے حکم سے مقرر کر سکتا ہے۔ (۳) صلح و جنگ کے مسائل اپنی رائے سے طے کر سکتا ہے (۴) بیت المال میں اپنے اختیار سے تصرف کر سکتا ہے۔

وزیر تنفیذ، کو ان اہم ترین معاملات کو بطور خود سرانجام دینے کا استحقاق نہیں ہے، بلکہ ان معاملات میں وہ جو کچھ کرے گا "سلطان" کے حکم سے کرے گا۔ ان چار معاملات کے علاوہ دیگر سیاسی و ملکی مسائل میں اس کو مکمل اختیارات حاصل ہیں۔

اختیارات کے اس فرق کی وجہ سے "غیر مسلم، غلام، احکام شریعت اور آئین سیاست سے ناواقف، وزیر تفویض نہیں ہو سکتا۔ البتہ وزیر تنفیذ ہو سکتا ہے۔[۱]

---

[۱] الاحکام السلطانیہ ص ۲۶، لابی الحسن علی بن محمد البصری۔ علامہ ابن خلدون نے بھی اپنے مقدمہ میں وزارت کی ان دونوں قسموں سے بحث کی ہے! اور آخر عہد عباسی میں وزراء کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض وزراء سلاطین پر غالب آجاتے۔ درحقیقت حکومت کا نظم و نسق ان ہی کے ہاتھوں میں ہوتا۔ یہ وزراء تفویض کہلاتے۔ بعض سلاطین کی ماتحتی میں ان کی رائے سے حکومت کا نظام چلاتے۔ یہ وزراء تنفیذ کہلاتے۔ (دیکھئے مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۲۰۷)۔

بہرحال فقہاء کرام کے سامنے تو یہ بحث مسئلہ کی حیثیت سے بعد میں آئی۔ مگر امراء اسلام نے ان کے فیصلہ کا انتظار نہیں کیا اور نہ فیصلہ کے بعد ان کی مقرر کردہ شروط کا کچھ زیادہ لحاظ کیا بلکہ انھوں نے سیاسی و انتظامی مصالح کے پیش نظر غیر مسلموں کو بے تکلف وزارت اور دوسرے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنا شروع کر دیا اور جو جوہر قابل نظر آیا اسے تاج حکومت کی زینت بنا لیا۔ اس معاملہ میں تقدم کا فخر حضرت امیر معاویہ کو حاصل ہے۔

امیر معاویہ نے ایک عیسائی کو اپنا چیف سکریٹری مقرر کیا اور ایک دوسرے عیسائی ابن آثال کو حمص کے صوبہ کا فنانشل کمشنر مقرر کیا۔ ایک یہودی ماسرجویہ بھی امیر معاویہ کے دربار میں معزز منصب پر مامور تھا۔

عبدالملک بن مروان کا چیف سکریٹری بھی ایک عیسائی ابن سرجون تھا۔

سلمویہ بن بنان جو عیسائی تھا خلیفہ معتصم باللہ کا مقرب ترین درباری امیر تھا۔ معتصم کا کوئی فرمان اس کے دستخطوں کے بغیر صادر نہ ہوتا تھا۔ سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود اس کی عیادت کے لئے گیا اور اس کی حالت نازک دیکھی تو بے اختیار رونے لگا۔ جب اس کے مرنے کی خبر آئی تو معتصم نے حکم دیا کہ اس کا جنازہ شاہی محل میں لا کر رکھا جائے اور عیسائی مذہب کے مطابق وہیں اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے۔ اس نے سلمویہ کے غم میں سارے دن کھانا نہیں کھایا۔

ابن الفرات خلیفہ مقتدر باللہ (۲۹۵۔۳۲۰) کا وزیر با تدبیر تھا۔ اس نے اپنے عہد وزارت میں ایک عیسائی کو محکمہ فوج کا افسر اعلیٰ بنا دیا۔ علی بن عیسیٰ نے (جو ایک دوسرا با رسوخ امیر تھا اور ابن فرات کے بعد عہدہ وزارت پر فائز ہوا) اس سے شکایت کی کہ "تم نے خدا کا خوف تو کیا ہوتا، لشکر اسلام کا کمانڈر انچیف تم نے ایک نصرانی کو بنا دیا، مجاہدین اسلام اور غازیان دین اس کی دست بوسی کرنے اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے پر مجبور رہیں۔

ابن الفرات نے جواب دیا' یہ اقدام سب سے پہلے میں نے ہی تو نہیں کیا پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ الناصر الدین اللہ نے اپنے چیف سکریٹری اسرائیل نصرانی کو لشکر کا سپہ سالار بنایا تھا اور معتضد نے ملک بن الولید نصرانی کو بنایا تھا۔

علی بن عیسیٰ نے کہا۔ انھوں نے بھی اگر ایسا کیا تو اچھا نہ کیا۔ ابن الفرات نے جواب دیا۔ میرے لئے ان دونوں کا طرز عمل اقتداء کے لئے کافی ہے خواہ تمھاری رائے میں وہ غلط ہی ہو۔[1]

عضد الدولہ بویہی (۳۶۷ - ۳۷۲) جو خلیفہ عباسی الطائع کے عہد میں حکومت کے دروبست پر قابض ہوگیا تھا اور مسجدوں میں شاہنشاہ اعظم کے لقب کے ساتھ اس کا نام خطبہ میں لیا جاتا تھا اس نے اپنا وزیر ایک عیسائی نصر بن ہارون کو مقرر کیا تھا اور اسے اجازت دی تھی کہ وہ آزادی کے ساتھ حکومت کے خرچ پر گرجے اور خانقاہیں تعمیر کرائے اور بیت المال کے روپے کو آزادی کے ساتھ اپنی ملت کے غربا وفقراء پر خرچ کرے۔[2]

مصر کے سلاطین فاطمین کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ نصاریٰ اور یہود کو اقتدار حاصل رہا۔ اس دور کے مشہور ترین وزراء میں یعقوب بن کلس ہے۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ وہ بغداد کا ایک یہودی تھا بڑا ذہین وفطین اور عیار وطرار تھا۔ کافور اخشیدی کے عہد میں مصر میں وارد ہوا۔ کافور نے اس کی ذہانت وفطانت خصوصاً انتظام اراضی کے سلسلہ میں اس کی قابلیت کو بھانپ لیا اور کہا اگر یہ شخص مسلمان ہوتا تو وزارت کے قابل تھا" یعقوب تک یہ بات پہنچی تو مسلمان ہوگیا پھر وہ مصر سے فرار ہوکر مغرب پہنچا اور ان یہودیوں کے گروہ میں شامل ہوگیا جو معز الدولہ کے حامی تھے معز نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی مصر آیا۔

معز کے بعد اس کا بیٹا عزیز تخت حکومت پر متمکن ہوا تو یعقوب کا آفتاب اقبال نصف النہار پر پہنچ گیا، بقول ابن خلکان "دنیا اس پر امنڈ آئی، لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کے دروازہ پر آپڑے، اس نے بڑی لیاقت سے آئین حکومت کی تدوین اور نظام ریاست کی تشکیل کی اور اس تدبر سے حکمرانی کی کہ کسی کو مجال سخن نہ رہی۔[3]

---

[1] کتاب الوزراء للصابی ص ۹۵۔ واضح رہے کہ اس روایت کا ناقل "الصابی" خود بھی غیر مسلم ہے۔

[2] ابن الاثیر ص $\frac{۶}{۲۵۵}$ [3] ابن خلکان ص $\frac{۲}{۳۹۱}$۔

عزیز نے بھی اس پر لطف و کرم کی بارش برسادی۔ گراں مایہ القاب وخطابات سے نوازا اور عطایا و ہدایا کے اس کے قدموں میں ڈھیر لگا دیئے۔ صرف اس کی سالانہ تنخواہ ایک لاکھ اشرفی تھی، چار ہزار غلام اس کی ڈیوڑھی پر حاضر رہتے تھے منجملہ دیگر ساز وسامان کے اس کے پاس ایک ہیرا تھا جس کی قیمت چار لاکھ اشرفی تھی[۱]۔ شعراء مصر نے بھی اس کی مدح میں قصائد کے انبار لگادیئے ممتاز شاعر ابوالرقعمق کے اکثر مدحیہ قصائد اسی کی شان میں ہیں۔ اس کا مشہور قصیدہ۔

کل یوم له علی نُوَب الدهر وکرّ الخطوب بالبذل غارة

(وہ ہر روز مصائب وحوادث دہر کے لشکروں پر اپنی جود وکرم کی فوج سے حملہ آور ہوتا ہے) اسی سے متعلق ہے۔

مگر دوستوں کے ساتھ دشمن بھی ہوتے ہی ہیں۔ ایک شاعر حسن بن بشر الدمشقی اس زمانہ میں ہجو گوئی میں ممتاز تھے۔ وہ یعقوب سے ناراض ہوئے اور اس لطیف انداز میں اس کی ہجو لکھی[۲]

(نصرانی بن جاؤ کہ نصرانیت دین حق ہے۔ ہمارے اس زمانے کا یہی فتویٰ ہے
تین خداؤں کے لئے عزت وجلال کا اقرار کرو ان کے سوا اوروں کو چھوڑ دو کہ وہ بیکار ہیں
وزیر یعقوب باپ ہے اور خلیفہ عزیز بیٹا ہے اور فضل (امیر لشکر) روح القدس ہے)

اسی عزیز نے عیسیٰ بن فسطورس نصرانی کو اپنا چیف سکریٹری بنا لیا تھا اور ایک یہودی منشا کو ملک شام میں اپنا نائب السلطنت قرار دیا تھا۔ ان دونوں عظیم المرتبت عہدیداروں کی وجہ سے یہود ونصاریٰ کو بڑا اقتدار حاصل ہوگیا اور انھوں نے مسلمانوں کو ذلیل کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ تک

تنصّروا فالتنصر دین حق علیه زماننا هذا یدل
وقل بثلاثة عزوا وجلوا وعطّل ما سواهم فهو عطل
فیعقوب الوزیر اب وهذا العزیز ابن وروح القدس فضل

[۱] ابن خلکان ص۱۹۳ [۲] ابن خلکان ص۱۹۳ ۔

مسلمانوں کی فریاد پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی غیر مسلم امرائے سلطنت نے دروازہ روک رکھا تھا۔ آخر اہل مصر نے ایک پرلطف تدبیر کی۔ انھوں نے کاغذ کا ایک پُتلا بنایا اور اسے اس راستہ پر جہاں سے بادشاہ گزرنے والا تھا کھڑا کر دیا۔ اس پتلے کے ہاتھ میں ایک درخواست رکھ دی۔ درخواست میں لکھا تھا:

"قسم ہے اس ذات کی جس نے یہود کو منشا کے ذریعہ عزت دی اور نصاریٰ کو عیسیٰ بن نسطورس کے ذریعہ اقتدار عطا کیا اور مسلمانوں کو تیرے ہاتھوں ذلیل کیا، تو میری فریاد سُن!"

تدبیر کامیاب ہوئی۔ بادشاہ عزیز ادھر سے گزرا تو اس نے سواری روک کر پتلے کے ہاتھ میں رکھی ہوئی درخواست لے لی۔ بہت شرمندہ ہوا اور ان دونوں عہدیداروں سے بازپرس کی۔[۱]

حاکم بامر اللہ (۳۸۶ - ۴۱۱ھ) نے اپنے عہد حکومت میں عیسیٰ بن نسطورس کو معزول کر دیا تاہم اس کا دربار عیسائی سکرٹریوں اور اس کا محل عیسائی طبیبوں سے بھرا رہا۔ ۳۸۵ھ میں اس نے اپنے استاد برجوان کو اپنا وزیر بنایا۔ پھر ۳۹۰ھ میں حسین بن جوہر کو۔ حسین کا چیف سکرٹری بھی فہد بن ابراہیم نصرانی تھا اور بڑی حد تک حکومت کا نظم و نسق اسی کے ہاتھ میں تھا۔

۴۳۶ھ میں خلیفہ مستنصر نے مصر میں صدقہ بن یوسف کو عہدہ وزارت تفویض کیا۔ یہ نو مسلم یہودی تھا۔ اس کا رفیق کار ابوسعد تستری یہودی تھا اور دراصل امور حکومت یہی سرانجام دیتا تھا۔ ان دونوں نے جب بے جا طور پر اپنے اہل ملت کو نوازا تو کسی دل جلے نے ان الفاظ میں صدائے فریاد بلند کی:[۲]

---

[۱] ابن الاثیر ص ۹/۴۲

یہود ہذا الزمان قد بلغوا	غایۃ آمالہم وقد ملکوا
العز فیہم والمال عندہم	ومنہم المستشار والملک
یا اہل مصر انی نصحت لکم	تہوّدوا قد تہوّد الفلک

(اس زمانے کے یہودی اپنی آرزوں کی معراج کو پہنچ گئے ہیں اور بادشاہ ہوگئے ہیں عزت ان کے پاس ہے دولت ان کے پاس ہے، ان میں کوئی وزیر ہے اور کوئی بادشاہ اے اہل مصر میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم بھی یہودی ہوجاؤ کیونکہ آسمان یہودی ہوگیا ہے۔)

یہ چند واقعات جو سرسری طور پر نگاہ میں آئے تاریخ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے متعلق ہیں اور ان عرب ملکوں سے متعلق ہیں جہاں کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام تھی۔ اور صرف منصب وزارت سے متعلق ہیں۔ اسپین ترکی اور ہندوستان میں، شاہان اسلام نے اپنے درباروں میں غیر مسلم وزراء و امراء کا جس کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا، ان کو وزارت، گورنری اور سپہ سالاری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا، ان سے رشتہ داری کے تعلقات پیدا کر کے من و تو کا فرق مٹادیا۔ اس کا ذکر طویل فرصت اور وسیع دفتر کا محتاج ہے۔

غیر کا سہارا

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں دوسروں کے کارناموں سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ان کی عزت میں اپنی عزت سمجھتے ہیں، ان کی شہرت میں اپنی شہرت۔ تعلقات پر اتراتے ہیں اور احباب پر اکڑتے اپنی زندگی سنوارنے کے بجائے سنوری ہوئی زندگیوں میں اپنے خواب زندگی کی تعبیر دیکھ کر ایسا خوش ہوتے ہیں کہ اپنی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ لیکن دوسرے کی سج دھج کو اپنی چمک دمک خیال کر لینے سے سچ مچ تو اپنی رونق نہیں بڑھ جاتی۔ ہماری کمزوریاں، ہماری ہی رہتی ہیں تاوقتیکہ ہم خود انھیں دور نہ کریں۔ کسی دوسرے کا حسنِ صحت، ہماری توانائی کا باعث نہیں ہو سکتا، خواہ ہمارا رفیق ہو، یا ہمدرد۔ اسی طرح دوسروں کی سمجھ بوجھ دوسروں کی ہی رہتی ہے۔ ہماری تعریف سے، وہ ہماری نہیں ہو جاتی۔ ہنر و ہمّت، سے کام لے کر لوگ نام پیدا کرتے ہیں۔ ان کے نام کی مالا جپ کر ہم ہنرمند اور ہمّت والے نہیں ہو سکتے۔ لیکن محرومی اور ناکامی کا احساس جب شدید ہو جاتا ہے تو کمزور طبیعتیں جی چھوڑ جاتی ہیں اور ان کے اندر ہاتھ پاؤں مارنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ اس وقت اپنے آپ کو بہلانے کی ایک صورت یہ بھی نکل آتی ہے کہ دوسرے کی ذات سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے بعد اس کے جمال و کمال کو اپنے لئے وجہ سکون قرار دے دیا جائے۔ اس طرح نام کے سہاروں پر گذر بسر ہونے لگتی ہے۔

یوں تو دنیا کا کاروبار آپس کے میل ملاپ پر چلتا ہے۔ ہماری زندگی کا دارومدار باہمی تعلق پر ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ خلوص و محبت برتنے سے ہی کام بنتا ہے۔ ایثار اور قربانی اعلیٰ صفات ہیں۔ اور انسان کی ترقی میں تخلیق کے ساتھ ساتھ تقلید کا بھی ہاتھ ہے۔ لیکن آسرے کی زندگی

اور بات ہے جب کوئی اپنی ذات کا انحصار، دوسرے کی صفات پر کر بیٹھتا ہے تو واقعی اس کی اپنی شخصیت اپاہج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب وہ سہارے کا محتاج ہوتا ہے۔ اپنی اپنی کمزوریوں کے مطابق سہارے ڈھونڈ لئے جاتے ہیں۔ زندگی میں جس کمی کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے، اسی کے مطابق ایک مخصوص بہانہ اختیار کر لیا جاتا ہے تاکہ اپنے اوپر کوئی حرف نہ آئے۔ اپنے اندر یقین وعمل کی کمی رکھنے والے مختلف جتن کرتے ہیں۔ سماج کے سامنے ان کی کوششیں کچھ اس طور نظر آتی ہیں:

۱۔ کوّا چلا ہنس کی چال:۔ احساسِ کمتری کا شکار، کسی ذات والاصفات کا شیدائی ہو جاتا ہے اس کے قدم پر قدم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو اس معیاری ہستی سے مطابقت دینے میں راحت ملتی ہے۔ یہ جذبہ ہمیں بہت سے اچھے نمونوں کی پیروی کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔ ایک بچہ بہت کچھ اسی طرح سیکھتا ہے۔ وہ اپنی لاچاری اور بے بسی کی بنا پر والدین کو غیر معمولی حیثیت کا مالک سمجھتا ہے۔ ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر نہ صرف ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ والدین کے اعمال کو ہی اپنی کارگزاری خیال کر لیتا ہے۔ عموماً بچوں کو اپنے والدین کی حیثیت اور اہمیت پر ناز بھی ہوتا ہے۔ بچے کے لئے یہ بات بیجا نہیں ہے۔ بُری بات تو یہ ہے کہ جوان آدمی بھی بچوں کی طرح دوسروں کا منہ تکنے لگے اور اپنی حقیقت سے بے خبر ہو کر نقالی پر اتر آئے۔ ایسی صورت میں ہنرمند نہیں بنتا بلکہ بہروپیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر سوانگ اچھا بھی ہوا تب بھی زندگی اچھی نہیں ہو پاتی کیونکہ ملمع سازی سے صرف ظاہری شناہت پیدا ہو سکتی ہے، اصلیت نہیں بدلتی۔ اس طرح کسی نادان کو دھوکے میں تو ڈالا جا سکتا ہے لیکن جوہرِ ذاتی میں اضافہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس مصنوعی زندگی کی بدولت اپنا اصلی روپ بھی خراب ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جس کا کام اسی کو ساجے، اور کرے تو ڈنڈا باجے" اب اگر یہ نوبت نہ بھی آئے تب بھی ہمیں سمجھنا چاہئے کہ "دُم کے سینے میں" "میں تنا ہی کا جگر"

پیدا ہونے سے رہا۔ اور ٹپکے گا وہی ظرف سے جو ظرف میں ہوگا؟

۲۔ عقیدت کا بخار :- اس بخار کی شدت میں اچھے خاصے انسان کے اوسان جاتے رہتے ہیں۔ وہ کسی ذاتِ شریف سے اس قدر مرعوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی سدھ ہی نہیں رہتی۔ اس کی نگاہیں اپنے وجود پر نہیں پڑتیں بلکہ خارجی مرکز پر ٹک کر رہ جاتی ہیں۔ کیونکہ اپنی محبوب شخصیت کے قالب میں اُسے اپنی ذات کی خیالی اور مثالی تصویر کا عکس نظر آجاتا ہے وہ، اس کی پرستش سے اپنی روح کی پیاس بجھاتا ہے۔ اپنے 'معیاری کردار' کا ہر عمل اس کے لئے کرامت ہی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی، اس کی کوئی حرکت بے معنی نہیں کہی جا سکتی۔ لہذا اس ذاتِ بابرکات کا ایک ایک فعل اس کی اپنی ذات کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے۔ اس غیر معمولی تسغف اور لگاؤ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اچھا خاصا کام کا آدمی ڈھنڈورچی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ بس دوسرے کے گن گایا کرتا ہے اور اس میں مگن رہتا ہے۔ جبکہ اس کی اپنی ذات میں گھن لگا ہوتا ہے شخصیت پرستی اور عقیدت مندی کے جذبے میں نیک عمل کی توفیق بھی ممکن ہے۔ بشرطیکہ نمونہ مناسب ہو اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اب اگر "ہے خیال حسن میں، حُسنِ جمال کا سا خیال" تو پھر انجام ظاہر ہے۔ زندگی کا کھوکھلا پن نہ صرف بدستور قائم رہتا ہے بلکہ اگر کچھ جوہر موجود بھی ہوتا ہے تو وہ بھی زنگ آلود ہو کر رہ جاتا ہے۔

۳۔ طلسمِ خیال :- صرف جیتی جاگتی ہستیوں کا دامن ہی نہیں پکڑا جاتا بلکہ ادب کے کرداروں کا بھی ہاتھ تھاما جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ "غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے"۔ اس لئے ناول یا افسانے پڑھتے وقت ہیرو کے کارہائے نمایاں ہی سے اپنی آرزوؤں کے دیوں میں تیل ڈالا جاتا ہے۔ اور دم بھر کو زندگی کے اندھیرے میں چراغ جل اٹھتے ہیں۔ کسی ڈرامے کے کردار کی جرأت و شجاعت کی ایسی داد دی جاتی ہے کہ اپنے دل سے بزدلی اور کم ہمتی کے داغ دھل جاتے ہیں۔ پردۂ سیمیں پر کسی کو سماج سے بغاوت کرتے ہوئے دیکھ کر کچھ اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے زبانِ حال سے فرما رہے ہوں کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ اس طرح زندگی کے اس

"دفترِ بے معنی" کو غرقِ مے ناب" کرنے کا موقع نکل آتا ہے، گو وقتی طور پر ہی سہی۔ کچھ ایسی بھی صورتیں ہوا کرتی ہیں جبکہ دوسروں سے اپنی وابستگی کی مدت کافی دراز کرلی جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی سے اپنی قربت اس قدر سمجھ لی جاتی ہے کہ ان کی ترقی، اپنی ترقی کے مترادف ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک ماں، اپنے ارمانوں کی دنیا، اپنے بچے کے سہارے سے آباد کرتی ہے۔ اور یہ کوئی غیر فطری رویہ بھی نہیں ہے لیکن خرابی تو اس صورت میں واقع ہوتی ہے جبکہ ماں کی جملہ خواہشات کا مظہر، بچہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کا بچے کی زندگی سے کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ کسی طور جلد از جلد اس کا بچہ، اس کی توقعات پوری کرسکے۔ ایسے ہی والدین اپنی اولاد کے لئے رحمت کے بجائے زحمت کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ ان کی بے بنیاد امیدیں، ایسا معیار بچوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں جو ان کی اصل کیفیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے بچے بھی پریشان ہوتے ہیں اور ماں باپ بھی دکھی۔ بہر حال خیالات کا طلسم، وقتی ہو یا دیرپا، وہ طلسم ہی رہتا ہے۔ اور جب بھی ٹوٹتا ہے، حقیقت کی تلخی کچھ اور گراں ہو جاتی ہے۔

۴۔ تعلقات کی دنیا:۔ بھاری بھرکم آدمی سے ناتا جوڑ کر بھی کچھ لوگ اپنی عافیت کا یقین کر بیٹھتے ہیں۔ انھیں اس خیال سے بڑا سکون ملتا ہے کہ چند قابلِ لحاظ لوگوں سے ان کی شناسائی ہے یا اُن تک رسائی رکھتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو عقلِ مصاحت سے کام لیتے لیتے اسی کے ہو رہتے ہیں۔ مصنوعی زندگی کے اس طور عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کا حقیقی کردار دب کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے تعلق کی بنا پر اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگتے ہیں لیکن دنیا انھیں خوب سمجھتی ہے کہ

"ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا"

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اپنے باحیثیت اعزا، اور اقربا کے تذکرے سے دوسروں کی شمع خراشی کیا کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی شخصیت کا لوہا منوانے کی ٹھان لی جاتی ہے۔ اس مزاجی کیفیت کی مضحک صورت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جبکہ لوگ اس معاملے میں دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ نادار مگر قریبی عزیز کے ذکر سے بچتے ہیں مگر مالدار ملاقاتی کا ذکر گھما پھرا کر بار بار ہوتا ہی

رہتا ہے۔ اس طرح سننے والوں پر رعب جمانے کی ترکیب نکال لی جاتی ہے۔ اب یہ سوال تو غیر ضروری سا ہے کہ اس تذکرے سے دوسروں پر کیا اثر ہوتا ہے اور اگر کوئی اثر ہوتا بھی ہے تو اس سے صاحب تذکرہ کو کیا فیض پہنچتا ہے۔ البتہ یہ بات بالکل درست ہے کہ اس تعلق کی بنا پر اس کی اپنی شخصیت میں کوئی چار چاند نہیں لگ جاتے بلکہ اس طرح اپنے آپ کو مغالطے میں ڈال کر کچھ اور خوار ہو جاتا ہے۔ اقبال نے "شیر اور خچر" کے مکالمے میں اس کیفیت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ شیر نے دریافت کیا:

"کون ہیں تیرے اب وجد؟ کس قبیلے سے ہے تو؟" ذرا خچر کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور۔ وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو۔ خچر کا یہ جواب، ایک خاص مزاج و مذاق کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت کے بہت سے لوگ شکار ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی روش پر کسی غیر معقولیت کا شبہ نہیں ہوتا بلکہ ایسے تعلقات کے اظہار میں انھیں اپنی عظمت دکھائی دیتی ہے اور تقویت محسوس کرتے ہیں لیکن دنیا والوں کی نظر میں ان کی طبیعت کا یہ رنگ، انھیں خچر ہی بنائے رکھتا ہے۔

۵۔ دست نگری:۔ دوسروں کے نفس سے اپنے اندر حرارت محسوس کرنے والے واقعی بے سہارا ہوتے ہیں۔ بالآخر وہ خود اعتمادی کی دولت سے کلیتاً محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب وہ ذرا بھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پاتے اور اپنا سارا بوجھ کسی دوسرے کے سر ڈال کر ہی سانس لے پاتے ہیں۔ گویا ان کے اپنے موٹر میں تیل آتا ہی نہیں۔ اب تو انھیں ڈھکیلا ہی جا سکتا ہے۔ اس طرح بری الذمہ ہونے کی ترکیب نکال لی جاتی ہے۔ کبھی کسی ایک دوست پر تکیہ کر لیا جاتا ہے اور کبھی متعدد احباب پر اپنی ذمہ داری بانٹ دی جاتی ہے۔ مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی کوئی گرفت نہ کی جا سکے۔ اس کیفیت کو ایک ہمدم و ہمدرد پر اعتماد و اعتبار کرنے والی صورت سے امتیاز کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مخلص اور صاحب فہم دوست تو خدا کی نعمت ہے۔ آپس کا صلاح مشورہ، اشتراک اور تعاون، زندگی کی مسافت کو بہت کچھ آسان کر دیتے ہیں۔ خرابی تو اس وقت آتی ہے جب کوئی اپنے ہاتھ پاؤں قطعی چھوڑ دیتا ہے اور آسرے کی زندگی

پر قناعت کر بیٹھتا ہے۔

۶۔ ملامت نفس:۔ جب کسی طور کام نہیں چلتا، ہر سہارا تنکے کا سہارا ہی معلوم ہوتا ہے تو طنز یہ انکساری کو بھی آزما کر دیکھا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک اجتماعی رویہ ہوتا ہے جو کسی حد تک ستیہ گرہ کے انداز میں اختیار کیا جاتا ہے۔ زمانے کی ناقدری قابلِ برداشت نہیں رہتی اور اپنی کم مائگی کا احساس کھائے جاتا ہے ایسی صورت میں اپنے آپ کو بُرا بھلا کہہ کر بھی چین حاصل کیا جاتا ہے۔ اپنے معقول فعل تک پر لاحول پڑھی جاتی ہے اور اپنے آپ کو بے جا حد تک نشانۂ ملامت بنایا جاتا ہے۔ اس طرح اپنے اوپر برس پڑنے کا مطلب تو یہی ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دراصل اظہارِ حقیقت نہیں ہے بلکہ زمانے کی نااہلی اور ناقدردانی کی مرثیہ خوانی ہے ہم بہت کچھ ہیں لیکن زمانے کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ وہ ہمیں نہیں پہچانتا۔ اس طرح اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ کر اور اپنے آپ کو جلی کٹی سنا کر اپنی دانست میں دنیا سے انتقام لیتے ہیں۔ ایسے لوگ واقعی قابلِ رحم ہوتے ہیں کیونکہ انھیں دوسروں سے ہمدردی بھی حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ وہ دراصل داد کے طالب ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز چڑانے والا ہوتا ہے۔ زرا زرا سی ناگواریوں پر بچوں کی طرح مچلتے ہیں۔ منشا تو یہی ہوتا ہے کہ ان کی ہر خواہش، دوسرے پوری کریں لیکن منہ سے یہی نکلتا رہتا ہے کہ انھیں کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ شاہراہ عام پر کھڑے ہو کر روتے بھی ہیں اور کہتے بھی جاتے ہیں کہ"

"روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں "منائے" کیوں"

بہرحال اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ایسے تمام سہارے آزمائے جاتے ہیں لیکن سب نام کا سہارا، ہی ثابت ہوتے ہیں۔ "یقینِ محکم" اور "عملِ پیہم" ہی جہاد زندگانی میں کام آتے ہیں خود اعتمادی ہی اصل سہارا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے:

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار — شہرت کی زندگی کا بھروسا ہی چھوڑ دے
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی — رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

نوآبادیات کی آزادی

کے لئے اقوام متحدہ میں ہندوستان کی جدوجہد

جناب سید جعفر رضا ملگرامی

۱۹۴۵ء میں سر ونسٹن چرچل نے جیسے ہی اس رائے کا اظہار کیا کہ وہ برطانوی سامراج کے تخریب و انتشار کو گوارہ کرنے کے لئے بادشاہ کے پہلے وزیر ہونے کا شرف حاصل کرنا نہیں چاہتے ویسے ہی رائے دہندگان نے ان کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا۔ ابھی وہ زندہ ہیں اور انھوں نے دیکھا ہے کہ ان کے جانشینوں نے نہ صرف اس انتشار کو گوارا کیا بلکہ اس عمل انتشار و تخریب میں پیش پیش رہے۔ اور ۱۹۶۲ء کے آخر تک یہ صورت ہوئی کہ متحدہ جنوبی افریقہ اور پرتگال کے انگولا اور موزمبیق صوبوں کو چھوڑ کر افریقہ کا کوئی ملک کسی غیر قوم کے زیر حکومت نہیں رہا۔ گذشتہ پانچ برسوں میں کوئی ۲۳ مختلف نوآبادیاں جن پر کبھی فرانس یا انگلینڈ کا قبضہ تھا آزاد ہوئیں۔ نوآبادیات میں آزادی کا یہ انقلاب جبر و تشدد کے خلاف رواداری بے انصافی کے خلاف انصاف، احساس برتری کے خلاف مساوات، اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف خوش حالی اور سیاسی قید و بند کے خلاف آزادی حاصل کرنے کی انسانی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کونسل عالم وجود میں آئی۔ نوآبادیات کی آزادی کے لئے یہ ایک نیک شگون تھا کیونکہ اس کونسل نے کم از کم ایسے تمام ممالک کو جو گمنامی کا شکار ہو چکے تھے اور آزاد انسانی برادری میں اچھوت کا درجہ رکھتے تھے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا جہاں ان سب نے متحد ہو کر اپنی آزادی کے لئے کوشش کی اور اپنے احساس کمتری کو دور

کرکے اور حکمراں قوم کے مثالی احساس برتری پر ضرب لگا کر قوموں کے مابین مساوات کی عملی شکل پیش کی

اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ کمیٹی نوآبادیات کے حکمراں اور اتنی ہی تعداد میں غیر حکمراں ممبرّن پر مشتمل ہے۔ یہ نوآبادیات کی تعلیمی، سماجی اور معاشی ترقی کی ذمہ دار ہے جس کے لئے حکمراں ممبرّن سے ہر سال رپورٹ طلب کرتی ہے تاکہ ترقی و توسیع کا جائزہ لے سکے اور ان کو ایسے اقدامات سے روک سکے جو ان ممالک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہوں۔ یہ ایک قسم کا وقف بورڈ ہے جو اپنے وقف کی حفاظت اور اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اس کے قیام کے بعد حکمراں ممبر کی حیثیت ایک متولی کی سی رہ گئی ہے جو وقف بورڈ میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ انتہائی دیانت داری سے پیش کرتا ہے لیکن وقف کو اپنے ذاتی فائدے کے لئے کبھی استعمال نہیں کرسکتا۔ عوام کی دقتوں اور پریشانیوں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ کمیٹی غیر جانبدار ممبرّن پر مشتمل کچھ وفود بھی ان ملکوں میں بھیجتی ہے اور ان کی پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں حکمراں ممبرّن کو اصلاح کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عوام کی طرف سے براہِ راست بھیجی ہوئی درخواستوں پر بھی غور و خوض کرتی ہے۔ ان سب اقدامات کا واحد مقصد یہ ہے کہ نوآبادیات تعلیمی، سماجی اور معاشی اعتبار سے اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں عام طور سے قوموں میں سیاسی شعور بیدار ہوجاتا ہے تاکہ خود مختار حکومتیں قائم کرکے ان کو آزاد ملکوں کی برادری میں مساوی حیثیت سے شریک کیا جاسکے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی ٹرسٹی شپ کمیٹی کے قیام کے ۷ ماہ بعد ہندوستان آزاد ہوا۔ یہ آزادی تمام ایشیائی اور افریقی نوآبادیات کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہندوستان نے ٹرسٹی شپ کمیٹی میں ایک ممبر کی حیثیت سے جو کچھ کہا یا کیا اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیمی میدان میں ہندوستان نے "قومی تعلیم" کا نظریہ پیش کیا جس میں وہاں کے عوام کی شرکت لازمی قرار دی تاکہ یہ تعلیم ان کی اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق ہوسکے ورنہ حکمراں قوم کی مسلط کی ہوئی تعلیم عوام پر گراں گزرتی ہے، ان کے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتی اور ان کا شعور کند اور جامد ہوجاتا ہے۔ تعلیم کا ڈھانچہ کچھ ایسا ہونا چاہیئے

جو نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھائے بلکہ روزمرہ زندگی کے طریقے اور اس کے آداب بھی سکھلائے، اگر تعلیم کا مقصد مردوں اور عورتوں کو روزی فراہم کرنا ہے، جمہوری نظام کی بنیادوں کو مضبوط کرنا ہے اور افراد کی تمام ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے تو تعلیم ابتدائی منزل میں حتی الامکان لازمی و مفت، سیکنڈری اور یونیورسٹی میں معیاری اور عورتوں اور سن رسیدہ لوگوں میں مقبول ہونی چاہیئے۔ اگر کسی ملک کو آزادی سے روشناس کرانا ہے تو اس میں تعلیم کا رواج ضروری ہے ایسی تعلیم جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو، خاص طور پر نسلی تعصب سے ورنہ اس کے اعلیٰ مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان نوآبادیات میں ایشیائی افریقی اور یورپین اسکولوں اور کالجوں کا الگ الگ قیام وہاں کے عوام کی مجموعی ذہنی صلاحیتوں کے لئے بڑا مضر ہے کیونکہ ایسی صورت میں ان نوآبادیات میں سماجی اور اقتصادی نابرابری کا تصور راہ پا جاتا ہے۔ یوروپین اسکول ایشیائی اور افریقی اسکولوں کے مقابلہ میں بہر حال سماجی اور اقتصادی اعتبار سے زیادہ بلند و خوشحال ہیں۔ ہندوستان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کانگو میں جبکہ غیر حکمراں قوم کے بچہ پر کرنسی کی ضرب ۲۰۰ اکائیاں خرچ ہوتی تھیں تو حکمراں قوم کے بچہ پر ۱۶۶۶۔ اسی طرح بعض جگہ یہ فرق ۱۸ اور ۱۷۰۰ اکائیوں کا تھا۔ ہندوستان نے اس تفریق کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جب تعلیم معاشی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی ترقی کے لئے ایک لازمی بنیاد قرار پائی ہے تو اس کو نسلی تعصب سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے۔

معاشی میدان میں نوآبادیات کے افلاس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے دو سو برسوں سے حکمراں قوم نے ان کی خوشحالی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے برخلاف ان کی دولت حکمراں ممالک پر صرف ہوتی رہی۔ اور حکمراں ملکوں کو ان کی اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا کبھی خیال نہ آیا اور نہ انھوں نے صنعت و حرفت کی ترقی اور رسل و رسائل کی سہولتوں کو مہیا کرنے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت سمجھی۔ ان کے نزدیک نوآبادیاں خام پیداوار کے گودام اور بنے ہوئے مال کی کھپت کے لئے اچھے بازار سے زیادہ اور کچھ نہ تھیں۔ ہندوستان نے مشورہ دیا کہ ان تباہ شدہ حالات پر قابو پانے کے لئے وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو پچھلی جنگ عظیم

کے نتیجہ میں تباہ حال یوروپ کے لئے کیا گیا تھا ۔ اقتصادی ترقی اور سیاسی آزادی کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ سیاسی آزادی معاشی ترقی کی خود ضامن ہوتی ہے اس لئے اقتصادی پستی کو آزاد کرنے کا بہانہ نہیں بنایا جا سکتا ۔

سماجی میدان میں ہندوستان نے فرقہ وارانہ امتیاز کی بڑی مذمت کی ہے ۔ یہ تفریق زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے تعلیمی میدان میں افریقی ایشیائی اور یوروپین اسکولوں کے الگ الگ قیام کی شکل میں معاشی میدان میں الگ الگ زراعتی فارم کی صورت میں اور خود سماجی میدان میں الگ ہوٹل ۔ الگ جیل خانے الگ ہسپتال ۔ الگ پارک اور دیگر تفریح گاہوں کے روپ میں ۔ بعض نوآبادیات میں درجہ اول کے بازار یوروپین کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں جہاں کسی افریقی کو جانے کی قانونی ممانعت ہے ۔ کچھ یوروپین علاقوں میں افریقیوں کو بغیر پرمٹ داخلہ کی اجازت نہیں ملتی ۔ اس نسلی تعصب کی انتہا یہ ہے کہ ایک ہی عہدہ کے دو نام ہیں اگر اس پہ کسی یوروپین کا تقرر ہوا ہے تو اس کو مثال کے طور پر "ایگریکلچرل آفیسر" کہا جائے گا لیکن اگر اسی عہدہ پر کسی افریقی کا تقرر ہوا ہے تو اس کو محض "فیلڈ آفیسر" کہیں گے ۔ ایک افریقی مجرم کو مقامی جیل میں بند کیا جاتا ہے جبکہ اسی جرم کے یوروپین قیدی سنٹرل جیل بھیج دئے جاتے ہیں ۔ کانگو میں وہاں کے شہریوں کی سب سے زیادہ تنخواہ ایک یوروپین کی سب سے کم تنخواہ سے بھی کم تھی ۔ وہاں یوروپین ملازمین کی تنخواہ ایک لاکھ سے پانچ لاکھ بلجیس فرنیک کے درمیان تھی ۔ اس کے علاوہ ۱۲۵۰ فرنیک بیوی اور ۵۰۰ سے ۱۲۵۰ فرنیک تک ہر بچہ کا الاونس مقرر تھا جبکہ کانگولی ملازمین کی تنخواہ ۱۲ ہزار سے ساٹھ ہزار اور کچھ مخصوص حالات میں ۷۰ ہزار بلجین فرنیک کے درمیان تھی ۔ اس کے علاوہ صرف ۲۰۰ بلجین فرنیک بیوی اور بچوں کو الاونس دیا جاتا تھا ۔ رہوڈیشیا میں ان یوروپین مزدوروں کو جو کانوں کے علاقہ میں باہر کام کرتے تھے ۷۵ پونڈ ماہوار اور اندر کام کرنے والے کو ۹۰ پونڈ ماہوار ملتے تھے جبکہ کانوں کے باہر کام کرنے والے افریقی مزدور کو صرف ۳ پونڈ اور اندر کام کرنے والے کو ۳ پونڈ ۳ شلنگ اور ۳ پنس دیئے جاتے تھے ۔ ان تمام امتیازات کا

جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان نے بتایا کہ یہ سب حکمراں قوم کے احساس برتری کا نتیجہ ہے۔ ان امتیازات کی موجودگی اتنی باعث تکلیف نہیں ہے متنی کہ ان کی قانونی حیثیت بیبلوک دراصل نوآبادیات کے عوام کے لئے اتنا باعث توہین نہیں ہے جتنا کہ ان حکمراں ممالک کے لئے جو تہذیب یافتہ ہوتے ہوئے بھی ان کو قانونی حیثیت سے جائز سمجھتے ہیں۔ نسلی امتیازات انسانی وقار کو اس وقت تک ٹھیس پہنچاتے رہیں گے جب تک ان کو برداشت کیا جاتا رہے گا۔ ہندوستان نے کہا کہ جب تک سیاسی اعتبار سے کسی سوسائٹی کی مختلف نسلوں کو برابری کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا اور اس طرح ان میں ایک قومی تصور پیدا نہیں ہو جاتا اس وقت تک یہ امتیازات ختم نہیں ہو سکتے۔ اس اعتبار سے بھی ان ممالک کو آزاد کرنا لازمی ہے۔

اگر نوآبادیات کی سیاسی ترقی پر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی گئیں۔ تاخیر سے کام لیا گیا اور کہیں کہیں تو جائز مطالبات بغیر کسی فیصلہ کے نظرانداز کر دیئے گئے۔ اس رویہ نے انتشار پیدا کیا جس کو حکمراں ممبروں نے سماجی تعلیمی اور معاشی سدھار سے دبانا چاہا۔ چونکہ یہ سدھار عوام کے تہذیب و تمدن، ان کی طبیعت و مزاج اور ذہنی تقاضوں سے مختلف تھے اور ان سے سیاسی مطالبات بھی پورے نہیں ہوتے تھے اس لئے یہ عوام کی نگاہ میں آزادی کو روکنے کا بہانا بن گئے۔ اس سے انتشار میں اور شدت پیدا ہوئی اور اس نے فسادات کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس سے سیاسی شعور پیدا ہوا، آزادی کے جدوجہد میں جوش و خروش پیدا ہوا اور قومی محاذ مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔

ہندوستان نے نوآبادیات کی تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالات پر مندرجہ بالا تنقیدی اور اصلاحی اقدامات کے علاوہ ٹرسٹی شپ کمیٹی اور اس کے بھیجے ہوئے مختلف وفود میں وقتاً فوقتاً جو خیالات پیش کئے ہیں وہ بھی ان ممالک کی آزادی کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ ان خیالات و نظریات کا خلاصہ یہ ہے :-

١- اگر نوآبادیات کا انتظام ٹرسٹ کے صحیح جذبہ کے تحت کیا جائے تو حکمراں ممبروں کے لئے

بجائے کسی فائدہ کے زیرباری کا سبب بن جائے۔

۲۔ ٹرسٹی شپ کا معاہدہ حکمراں ممبروں کے یک طرفہ فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی فیصلہ ہے۔

۳۔ ان نوآبادیات کے سلسلے میں حکمراں ممبروں کے بجائے جنرل اسمبلی کو کُل اختیارات حاصل ہیں۔

۴۔ حکمراں ممبروں کا قانونی فرض ہے کہ اپنے فائدے کے مقابلے میں نوآبادیات کے فائدہ کو ہمیشہ ترجیح دیں۔

۵۔ سیاسی آزادی بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ معاشی خوش حالی، سماجی مساوات اور تعلیمی ترقی کا ایک ذریعہ ہے۔

۶۔ سیاسی آزادی ملنے سے پہلے جمہوری اداروں مثلاً سیاسی پارٹیوں اور اسمبلیوں کا قیام لازمی ہے۔

۷۔ معاشی اور سماجی پستی کو آزاد نہ کرنے کا بہانا نہیں بنایا جا سکتا۔

۸۔ رائے عامہ کے لئے جہالت کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

۹۔ معاشی اور سماجی ترقیاتی پلاننگ کی طرح "سیاسی پلاننگ" بھی نہایت ضروری ہے تاکہ حکومت تبدیل ہوتے وقت لوگ ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس کو قبول کرنے کے لئے پہلے ہی سے تیار رہیں۔

ان اصولوں کے سلسلے میں حکمراں ممبروں کا ہندوستان سے سخت اختلاف رہا لیکن ٹرسٹی شپ کمیٹی میں ان کو سند قبولیت حاصل رہی۔ یہ اصول اس کمیٹی میں بطور یادگار محفوظ رہیں گے اور خواہ وہ کسی شکل میں اور کسی زمانہ میں رونما ہوں نوآبادیات کو آزادی کے لئے ابھارتے رہیں گے ٹرسٹی شپ کمیٹی اپنے ان فرائض کو جس تیزی سے پورا کر رہی ہے شاید عالم انسانیت اس کے اس احسان سے سبکدوش نہ ہوسکے۔

تنقید و تبصرہ

دیوان عزلت

تبصرہ نگار : جناب قاضی عبدالودود،

دیوان عزلت از سید عبدالولی عزلت سورتی، مرتبہ جناب عبدالرزاق قریشی، سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔ قیمت دس روپے۔

(۱) متن دیوان ۲۲۳ صفحوں میں آیا ہے اور مقدمہ ۱۸۲ صفحوں کا ہے، چونکہ دیوان میں ایسے اشعار جو دو سطروں سے کم میں آئے ہوں، مقابلتہً بہت کم ہیں، تعداد الفاظ مقدمے میں زیادہ ہو تو عجب نہیں۔ کیمبرج کے ایک معلم انگریزی جو اسلوب بیان پر ایک قابل قدر کتاب کے مصنف ہیں طول بیجا سے کام لینے والوں کے لئے یہ سزا تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر ناشر کو بذریعۂ تار اپنے خرچ سے بھیجنے پر مجبور کئے جائیں، یہ تو انہونی ہے، لیکن، فضول گوئی سے بچنے کی کوئی صورت نکل سکتی تو، بہت اچھا ہوتا۔ مقدمۂ مذکور میں غیر ضروری باتوں سے احتراز کیا جاتا تو اس کی ضخامت سو صفحوں سے زیادہ نہ ہوتی۔

(۲) فہرست مآخذ (۱) فہرست میں گارساں دتاسی کی تاریخ شامل ہے، اور اس کے بعض عبارات کا ترجمہ بھی مقدمہ میں ہے۔ قریشی صاحب فرانسیسی سے واقف نہیں، انھوں نے ان عبارات کا کسی سے ترجمہ کرایا ہوگا، اور پوری کتاب ان کی نظر سے نہ گزری ہوگی، لیکن مقدمے کو پڑھنے والے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اس زبان سے آگاہ ہیں اور انھوں نے یہ کتاب بالاستیعاب دیکھی ہے۔

(۲) فہرست میں تذکرۂ عشقی کے نسخۂ آکسفورڈ کے عکس اور "دو تذکرے" کا ذکر ہے، اور مقدمے کے صفحات ۸۳ و ۵۴ میں اس کتاب کے قلمی نسخے کا حوالہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف "دو تذکرے" ان کی نظر سے گزرے ہیں اور یہ تذکرۂ عشقی و تذکرۂ شورش کے نصف اول پر مشتمل ہے۔

عزلت کا ترجمہ اس میں نہیں، قریشی صاحب نے عکس سے اس کی نقل منگوائی ہے۔ غلط فہمی اس جگہ بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۳) فہرست میں تذکرۂ شورش کا قلمی نسخہ شامل نہیں، لیکن اس کا حوالہ ص ۱۰۰ میں ہے، اس کا حال بجنسہٖ تذکرۂ عشقی کا ہے۔

(۴) تذکرۂ کمال کا نام مجموعۂ انتخاب ہے ص ۲۲۹، صحیح نام مجمع الانتخاب ہے۔

(۵) عیار الشعراء از ذکا مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۲۲۸ موصوف کے پاس اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں۔

(۶) بعض کتابوں کے حوالے مقدمے میں ہیں لیکن یہ فہرست سے غیر حاضر ہیں، مثلاً تذکرۂ مسرت افزا (مقدمہ ص ۱۰۱)

(۷) غیر معروف کتابوں سے متعلق اتنے معلومات فراہم کرنے چاہئیں کہ ناظرین بطور خود فیصلہ کر سکیں کہ کسی امر خاص میں کس حد تک اس پر اعتماد ہو سکتا ہے، قریشی صاحب اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ حقیقت السورت میں حوالہ مقدمے میں کئی جگہ ہے، لیکن اس کے بارے میں اس سے زیادہ انھوں نے نہیں بتایا کہ اس کے مصنف شیخ بہادر ہیں اور یہ ۱۳۰۵ھ میں بمبئی کے مطبع شمالی میں چھپی تھی۔

(۳) مقدمے کے کچھ بیانات سے مجھے اختلاف ہے، بعض امور کی طرف قریشی صاحب نے توجہ ہی نہیں کی، یا کی ہے تو محض سرسری طور پر۔ ذیل میں استقصا کی کوشش کے بغیر ایسی باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ گلشن ہند میں شعر ذیل الہام شاگرد عزلت کے نام سے ہے:

اے عندلیب جا کے چمن میں کرے گی کیا باد خزاں سے سب گل و گلزار جھڑ گئے (ص ۵)

گلشن ہند میں اس شاعر کا نام تک نہیں آیا۔ شعر زیر بحث آوارہ کا ہے۔ (تذکرۂ گردیزی)

۲۔ محمد فقیہ درد مند ص ۷۴ و ص ۹۱ درد مند کا مکمل نام محمد فقیہ صاحب ہے۔

۳۔ علی لطف ص ۶۱ لطف کا نام مرزا علی ہے، مرزا نام کا جزو لازم ہے۔ اس طرح نہیں جیسے

مرزا محمد رفیع سودا میں ہے۔

(۴) محمد علی کا خطاب علی وردیخاں وہابت جنگ ص ۲۰ چونکہ اور خطاب بھی تھے، مہابت جنگ کے بعد وغیرہ لکھنا تھا۔

(۵) "سمجھ میں نہیں آتا کہ علی ابراہیم خاں نے کس بنیاد پر یہ لکھ دیا کہ 'با وصف فضیلت اطوار و افوالش خالی از سبکی دہرالی نبود" ص ۶۰ قریشی صاحب غزل (دیوان ص ۱۳۰) اور واسوخت (ضمیمہ ۲۲) کا ایک ایک بربنائے 'ابتذال' نکال دیا ہے' اور سب پہیلیاں اسی وجہ سے شامل دیوان نہیں کیں (دیباچہ)۔ حیرت اس پر ہے کہ اس کے باوجود انھیں علی ابراہیم خاں کا قول سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ ان کی فارسی عبارت کے لئے انھوں نے لطف کے گلشن ہند کا حوالہ دیا ہے۔ علی ابراہیم خاں جس زمانے میں عزلت مرشد آباد گئے ہیں وہاں موجود تھے اور ان کے بارے میں ان کا بیان یقیناً ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ وہ واقعات کی زیادہ چھان بین نہ کرتے ہوں، اور ان کے عہد کا کوئی دوسرا تذکرہ نگار بھی نہیں کرتا تھا، لیکن، وہ غیر ذمہ دار ہرگز نہ تھے۔ عزلت کا ہزالی کی طرف میلان دیوان مطبوعہ کے اشعار ذیل سے ظاہر ہے: رباعیات ۴، ۵، ۷، ۸۔ اشعار ص ۲۰۸، ۱ ص ۲۱۰، ۲ ص ۱۵۸، ۹ ص ۵۱

جو فرض جانتے نہیں ابن علی کا غم
اب لگ پکڑ رہے ہیں وہ سنت یزید کی (۱۹۵)

(۶) "شفیق[1] اور حمید اورنگ آبادی عزلت کے ہم عصر تھے اور انھیں بہت قریب سے دیکھا تھا ان کے بیانات کو ابراہیم اور لطف کے بیانات پر ترجیح دی جائے گی۔" ص ۶۱۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ علی ابراہیم خاں عزلت کے دوران قیام مرشد آباد میں وہیں تھے، ان کے جو تعلقات علی وردی خاں سے تھے، ان کے پیش نظر عزلت کو انھیں قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل تھے لطف نے البتہ عزلت کو کبھی نہ دیکھا ہوگا، لیکن، جیسا کہ خود قریشی صاحب کہتے ہیں، اس کا قول

---

[1] شفیق کو اصطلاحی معنی میں ہمعصر عزلت کہنا درست نہیں، تفاوت عمر بہت تھا۔

علی ابراہیم خاں کے" بیان کی آواز بازگشت" ہے۔ (ص ۶۱) اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قریشی صاحب اسے تسلیم کرتے ہیں کہ عزلت ملامتیہ مشرب رکھتے تھے ص ۴۳ یہ صحیح ہے تو پھر ان سے سنجیدگی کی توقع ہی کیوں ہو۔ علی ابراہیم خاں کو صرف ابراہیم کہنا نامناسب ہے۔

(۷) حمید و شفیق کے جو اقوال جو علی ابراہیم خاں و لطف کے بیانات کے مقابلے میں پیش کیے گئے ہیں علی الترتیب یہ ہیں: "تجنز و اندیشۂ ابتذال اصلاً گرد وپیش او نمگیرد د۔" "در محافل امرا معزز و مکرم اند۔" ص ۶۱ یہ اقوال اور علی ابراہیم کا جو قول اوپر مقدمے سے نقل ہوا ہے متضاد نہیں۔ قول شفیق میں ابتذال فحش گوئی و ہزلی کے معنی میں (قریشی صاحب کے یہاں یہی معنی ہیں) مستعمل نہیں ہوا، بلکہ اس کا وہ مفہوم ہے جو اس کے معاصر میر و آرزو وغیرہ کے یہاں ہے،

۸۔ بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا | کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے
میرے رونے سے نہ تنہا چاہ ہو گئے آتشیں | یار کے کوچے میں بہتے ہیں کئی نالے پڑے
زاہدان پر نہ ڈال لال گلال | چاہیے پاس شرع پر کھ لے

یہ اور کچھ اشعار ص ۱۲۸ میں ایہام کی مثال میں پیش ہوئے ہیں، پہلے اور دوسرے کو اس صفت سے مطلقاً تعلق نہیں (شعر ۲ میں ہو گئے غلط ہے، ہو گئی چاہیے۔) تیسرے میں ایہام ہے، مگر قریشی صاحب کو اس کے مصرع ۲ میں ابرکھ نہیں اب رکھ لکھنا چاہیے تھا۔ اگر واقعی ابرکھ ہے تو اس میں ایہام نہیں۔

(۹) " واسوخت میں۔۔اسے (معشوق کو) جلی کٹی بھی سنائی جاتی ہے اور اسے دوسرے معشوق سے دل لگنے کی دھمکی بھی دی جاتی ہے" ص ۱۵۸ عزلت ۔۔کے دیوان میں تو کوئی واسوخت نہیں، لیکن ۔۔ بیاض میں ایک واسوخت ۔۔ ہے۔ یہ ۔۔ واسوخت کے موجودہ طرز یعنی مسدس کی شکل میں نہیں ہے بلکہ ترکیب بند کی شکل میں ہے" ص ۱۵۹، انھیں اعتراف ہے کہ اس نظم میں معشوق کو دھمکی نہیں دی گئی (ص ۱۶۱) یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ پھر انھوں نے

اسے واسوخت کیوں کہا۔ اگر بیاض میں یہ لفظ بطور عنوان درج تھا تو انھیں اس کا صراحتہً ذکر کرنا تھا۔ یہ صحیح نہیں کہ مسدس کو ترکیب بند نہیں کہتے، مجھے موخرالذکر کی کوئی تعریف ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مسدس پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ واضح رہے کہ ایران میں وحشی اس صنف سخن کا موجب ہے اور اس کے یہاں اس قسم کی جو دو نظمیں ہیں ان میں سے ایک مسدس اور دوسری مثمن ہے، اردو میں پہلے پہل مثمن رائج ہوا، چنانچہ آبرو کے واسوخت کے ہر بند میں ۸ مصرعے ہیں۔ ایران میں تو کبھی اس صنف سخن کا کوئی خاص نام ہی نہیں رہا، اردو میں پہلے اس کو سوز و گداز یا محض ترکیب بند کہتے تھے۔

(۱۰) عزلت .. کا مطالعہ وسیع تھا، اساتذہ کا کلام یقیناً .. پیش نظر رہتا .. ہوگا اس کے علاوہ انسانی خیالات میں نیرنگی کے باوجود یکسانی ہوتی ہے اس لئے مضامین میں توارد ہوتا ہے،" ص ۱۳۱ کلام عزلت سے توارد کی جو مثالیں دی ہیں ان میں یہ اشعار بھی ہیں۔

مقام زندگی سے کوچ کر گئے جلد یار اپنے ۔۔۔ وہ منزل پہنچے اور ہم باندھتے رہ گئے ہیں بار اپنے

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند ۔۔۔ تہی پیمانہ ہا کردند و رفتند، حافظ

وہ گلرو کیا مری بلبل او پر بیداد کرتا ہے ۔۔۔ گئے جب بال و پر تب وا کر آزاد کرتا ہے

حسرت اینست کہ صیاد مرا چند رانی ۔۔۔ در قفس دانست کہ راہ چمن از یادم رفت عالی

پیش پا افتادہ مضامین میں توارد اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ ایک ہوں یا قریب قریب ایک۔ ان اشعار کو توارد کی مثال میں پیش کرنا صحیح نہیں۔ مقام زندگی الخ اور حریفاں الخ میں تو معنوی یکسانی بھی نہیں، حریفاں حافظ نہیں جامی کا شعر ہے، اور اس موقع پر آیا ہے جہاں جامی یہ کہہ رہے ہیں کہ سابقین بہت کچھ کہہ گئے ہیں، اسی سلسلے میں یہ شعر آیا ہے:

ہنوز آں ابر رحمت درفشانست ۔۔۔ خم و خمخانہ با مہر و نشانست

(۱۱) قدرت اللہ شوق دہلی میں کافی عرصہ تک رہے تھے، گمان غالب ہے کہ عزلت

سے ان کی ملاقات ہوئی ہوگی" ص ۳۵، اول تو اس کا ثبوت موجود نہیں کہ شوق دہلی گئے تھے، اور یہ ثابت بھی ہوسکے تو وہ بارہویں صدی ہجری کے عشرۂ ہفتم میں وہاں موجود نہ ہوں گے" اس کے بعد گئے ہوں گے۔ واضح رہے کہ شوق جن کا سال وفات ۱۲۲۴ھ ہے مصحفی وغیرہ کے ہم عصر ہیں۔

۱۲۔ قریشی صاحب عشقی کا ایک قول نقل کرکے لطف کی عبارت درج کرتے ہیں جس کے متعلق انھوں نے یہ لکھا ہے کہ "غالباً عشقی ہی کے بیان کو صاحب گلشن ہند نے . . دہرایا ہے" ص ۵۴۔ لطف کا تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا، تذکرۂ عشقی اس کے بہت بعد مکمل ہوا ہے"۔ لطف عشقی سے واقف بھی نہ ہوں گے، ان کا تذکرہ دیکھنا تو بڑی بات ہے۔

۱۳۔ موسوی خاں صاحب مشکوٰۃ النبوت نے عزلت کا مذہب، امامیہ کا پیرو اور صاحب حقیقت السورت نے انھیں اس مذہب کا مجتہد لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بنا ان کے والد کے مذہب کے متعلق خافی خاں کا بیان ہو، مگر جیسا کہ ثابت ہوچکا ہے وہ سنی تھے مشکوٰۃ النبوت میں ہے کہ عزلت کی قبر دائرۂ میر مومن میں ہے، یہ کہنے سے غالباً اس کے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اس دائرہ میں شیعوں کی قبریں ہیں اس لئے وہاں مدفون ہونا ان کے امامیہ ہونے کا ثبوت ہے لیکن صاحب محبوب الزمن کا قول ہے کہ وہاں سنی بھی دفن ہیں۔ حاکم نے عزلت کو بیدل کے عرس میں دیکھا تھا، امامیہ مذہب والے کو عرس سے واسطہ؟ افضل بیگ قاقشال کا بیان ہے کہ "ملامتیہ مشرب دارد در ریش وبروت تراشیدہ بوضع رندان میباشد" اس مشرب کا آدمی امامیہ مذہب کا پیرو نہیں ہوسکتا۔ دیوان میں اگر اہل سنت کی مدح کے اشعار ہیں، تو "یہ تشیعیت کی دلیل" نہیں، ایک بیاض میں عزلت کی ایک فارسی رباعی ہے جس سے ان کا سنی ہونا ثابت ہے۔ آخر عمر میں وہ شاہ عبدالشکور گجراتی کے طریقۂ قادریہ میں مرید بھی ہوئے تھے ص ۴۲ تا ۴۴۔ مجھے عزلت کے والد کے مذہب سے بحث نہیں، لیکن جس شاعر کے دیوان میں یہ بیت ملے ہیں اس کو غالی شیعہ سمجھنے میں تامل نہ کروں گا:

ص ۶۵

جو سوجھے تو خلیفوں سے ہے روشن کو چہ جنت   چراغاں ان سہ کوروں سے ہوا راہ جماعت میں

طنز صریح ہے، یہ شعر بھی دیکھیے:

لعن یزید خرستی جو بھونکتے ہیں لوگ ۔۔۔ بے شبہ ہیں وہ قوم سگوں میں یزید کی[1] ص ۱۹۵

عزلت کے زمانے میں بعض اکابر علما جو سنی مذہب رکھتے تھے یزید کو برا سمجھنے کے باوجود اس پر لعنت بھیجنے کے روادار نہ تھے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ رویہ مناسب ہے یا نامناسب، کوئی سنی ان لوگوں کے حق میں کسی سنی کے قلم سے ایسا شعر نکل نہیں سکتا۔ اشعار بالا کی روشنی میں اس شعر کو بھی پڑھیے:

عدو تھے مالی اور صیاد گلچیں نے قیامت کی ۔۔۔ خدا لعنت کرے تینوں پہ چھوٹا گلستاں ہم سے ص ۱۰۹

اب قریشی صاحب کے دلائل پر غور فرمایئے: اگر شیعہ کا ملامتیہ مشرب نہیں ہو سکتا تو قادریہ کا کب ہو سکتا ہے؟ بیدل کے عرس میں شعر خوانی ہوا کرتی تھی، اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ اس قسم کی مجلسیں خود شیعوں کے یہاں بھی ہوا کرتی تھیں، (رجوع بہ احوال خواجہ باسط)۔ میر حسن باوجود شیعۂ غالی ہونے کے مجالس فقرا میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس زمانے میں مذہب امامیہ کے پیرووں میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری نہ تھا۔ خواجہ جعفر خود شیعہ تھے، لیکن وہ سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید تھے۔ تذکرۂ ظاہر آبادی سے جس کی تکمیل غالباً بارہویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہے ایران میں اس کا مروج ہونا ثابت ہے۔ شاد عظیم آبادی نے شیعوں کے تصوف کی نسبت حیات فریاد میں جو کچھ لکھا ہے، اس پر نظر ڈالی جائے ــــ دائرۂ میر مومن میں سنی بہت کم مدفون ہیں۔ عزلت کی قبر کا وہاں ہونا قطعی ثبوت نہ سہی لیکن شیعہ ہونے کے اگر اور ثبوت موجود ہوں تو انھیں تقویت دیتا ہے۔ رباعی جو بیاض میں ہے، دیوان فارسی میں ہے یا نہیں، اس کے بارے میں قریشی صاحب ساکت ہیں، جس بیاض سے انھوں نے یہ رباعی لی ہے وہ چنداں معتبر بھی نہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس میں عشق کا ایک شعر عزلت سے منسوب کر دیا گیا ہے

---

[1] "کے" ہونا چاہیے۔

اگر یہ دیوان میں نہیں تو پھر اس کا قرینہ زیادہ ہے کہ کسی اور کی ہے دیوان میں ملے تو میں یہ سمجھوں گا کہ کسی وقت مصلحتاً کہی گئی تھی۔ شاہ عبدالشکور کا مرید ہونا شیعیت کے منافی نہیں، مزید یہ کہ اس کی بنیاد صاحب محبوب الزمن کا قول ہے جو زمانۂ حال کے مصنف ہیں۔ مقدمے کے ص ۱۷ میں ایک عربی عبارت درج ہے جو اس پر مشعر ہے کہ عزلت کے والد سید عبدالشکور کے مرید تھے اگر یہ وہی ہیں جو عزلت کے پیر بتلائے گئے ہیں، تو ان کا عزلت کے آخری زمانے میں زندہ ہونا قرین قیاس نہیں۔ قریشی صاحب کو ان کے بارے میں صراحت سے کام لینا تھا کہ کون ہیں اور ان کا سال وفات کیا ہے۔

۱۴۔ ص ۳۶ میں تین شعر ایک بیاض سے ماخوذ ہیں جن کا تعلق نظام الملک سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان میں نظام الملک کا نام نہیں، اگر بیاض میں بطور عنوان یا کسی اور طرح یہ درج تھا کہ ان کا سروکار نظام الملک سے ہے تو صراحتاً اس کا ذکر کرنا تھا۔

۱۵۔ "صنائع وبدائع کو شعر وشاعری میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔" ص ۱۲۴ اگر صنائع و بدائع ایک دوسرے سے مختلف نہیں تو ان میں سے ایک حشو ہے، اگر مختلف ہیں تو بدائع سے لفظی تکلفات (مثلاً صنعت منقوط وصنعت مہملہ) مراد ہوں گے۔ قریشی نے یہ بات کہاں دیکھی کہ بدائع کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

۱۶۔ "عزلت کے یہاں بہت سے الفاظ جو اب مؤنث مستعمل ہیں مذکر ملتے ہیں، اور اس کے برعکس بھی۔ عزلت نے قربانی، جنگ، دنیا، چشمک وغیرہ کو مذکر اور جوہر، سفر وغیرہ کو مؤنث استعمال کیا ہے۔ مندرجۂ بالا تقریباً تمام الفاظ میر کے زمانے تک اسی طرح استعمال ہوتے تھے۔" ص ۱۴۲ قریشی صاحب کو بتانا تھا کہ یہ الفاظ دیوان کے کن صفحوں میں ملتے ہیں، مگر انھیں اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ انھیں یہ بھی چاہیئے تھا کہ "وغیرہ" پر نہ ٹالتے اور ایسے الفاظ کی مکمل فہرست پیش کرتے۔ ان کا یہ قول کہ یہ الفاظ تقریباً سب میر کے زمانے تک اسی طرح مستعمل تھے جس طرح عزلت کے دیوان میں ملتے ہیں، صحیح نہیں، جنگ کے

سوا جو مذکر و مؤنث دونوں آیا ہے۔ میر یا ان کے معاصرین (دکن سے بحث نہیں) کے یہاں کل الفاظ اسی طرح برتے گئے ہیں جس طرح آج کل زبانوں پر ہیں۔ واضح رہے کہ قریشی صاحب کے دیئے ہوئے الفاظ میں سے کچھ دیوان میں دو طرح مستعمل ہیں، مثلاً جوہر کہ مذکر بھی آیا ہے ص ۱۰۵۔ قربانی جو مذکر آیا ہے وہ اس حیوان (بشمول انسان) کے بارے میں ہے جو قربان ہوا ہو، "رخ قاتل یہ رہے آخر نگاہ چشم قربانی" ص ۱۱۰) اس مصرع میں جنس کی بحث نہیں) اس صورت میں مذکر ہی مستعمل ہونا چاہیئے۔

۱۷۔ قریشی صاحب مسطر کشیدہ، دوشالہ، مادرزاد اور ڈھول کو "غیر فصیح بلکہ ثقیل اور بوجھل" سمجھتے ہیں جن سے "غزل کی لطافت" "مجروح" ہو جاتی ہے۔ ص ۱۳۵، لیکن "ڈھوری لگن" کی لطافت کے وہ قائل ہیں ص ۱۴۱۔ میرا خیال ہے کہ ان کے ناپسندیدہ الفاظ ہر زمانے میں فصیح سمجھے گئے ہیں، اور "ڈھوری لگن" شمالی ہند کے شعرا نے تو کبھی استعمال ہی نہیں کیا، میں خود شعر کہتا تو بھولے سے بھی اسے نہ برتتا۔

۱۸۔ عزلت قادری سلسلے میں مرید تھے اور اس مناسبت سے وحدت وجود کے قائل" ص ۴۴ ثبوت میں جو اشعار دیئے ہیں وہ بالکل اس پر مشعر نہیں کہ عزلت وحدت وجود کے قائل تھے۔ نہ معلوم یہ بات قریشی صاحب نے کہاں دیکھی کہ سلسلۂ قادریہ کے صوفیہ وحدت وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔

۱۹۔ مقدمے میں شفیق کا قول نقل ہوا ہے کہ عزلت کا کلیات فارسی ۱۴ ہزار ابیات پر مشتمل تھا۔ ص ۴۶ و ص ۹۳ اس کے ایک انتخاب کا ذکر کرتے ہیں اور ایک نسخے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی نسبت انھیں علم نہیں کہ کلیات ہے یا اس کا انتخاب۔ پہلے کے متعلق بعض تفاصیل مقدمے میں ہیں، لیکن وہ صراحتہً یہ نہیں کہتے کہ میری نظر سے گزرا ہے، دوسرے کے بارے میں وہ مقر ہیں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ان کا کام جس نوع کا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے کلیات فارسی

مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ۲۴ فارسی شعر نقل کئے ہیں لیکن یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کہ کہاں سے ماخوذ ہیں۔ (ص ۹۴ +) شفیق نے گل رعنا کے نو دس صفحوں میں عزلت کے فارسی اشعار کا انتخاب کیا ہے، یہ اشعار افسوس ہے کہ قریشی صاحب نے نقل نہیں کئے۔

۲۰۔ قریشی صاحب نے مقدمے میں بعض اشعار پر عزلت کے اعتراض درج مقدمے کئے ہیں۔ ص ۵۱ + ۔ مجمع النفائس کے ایک نسخے کے حواشی (نسخہ خدابخش) میں جا بجا عزلت کی تحریریں ہیں۔ (یہ اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ نسخہ مذکور میں یہ عبارتیں خود ان کے قلم کی ہیں یا کاتب نے کسی اور نسخے سے لے کر نقل کر دی ہیں)۔ انھوں نے ملا علی جاوید کے شعر

"یادِ رخ تو در دل اندوہگیں ما چوں تیر غمزۂ تو بود دلنشین ما"

میں رخ کی جگہ قد تجویز کیا ہے۔ ممکن ہے ان حواشی میں اس قسم کی اور اصلاحیں بھی ملیں۔

۲۱۔ ایک جگہ عزلت نے لکھا ہے کہ میں روز عرس بیدل ان کے مزار پر پہنچا کل شعرائے دہلی کا مجمع تھا۔ کلیات بیدل (قریب صد ہزار ابیات) حسب معمول نکالا گیا۔ میرے دل میں آیا کہ میں ان کے مزار پر آیا ہوں اور انھیں خبر نہیں۔ اس کے بعد کلیات بطور تفاول کھولا تو داہنی طرف کے صفحے کا پہلا شعر یہ نکلا، سب نے دیکھا:

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم   کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

۲۲۔ مقدمے قوافی کی بحث تشنہ ہے۔ قریشی صاحب کہتے ہیں کہ چند اشعار میں ر اور ڑ کا قافیہ آیا ہے، لیکن س وض کا قافیہ نہیں۔ ص ۱۳۷۔ یہ صحیح ہے لیکن عزلت کے یہاں تلک الگ وجگ وغیرہ کا قافیہ آیا ہے ص ۲۰۱، قوا کی ایک مثال ملتی ہے: بیند و اتا قافیہ گنڈا وغیرہ۔ ص ۳۱۔ ایطائے جلی کی متعدد مثالیں موجود ہیں، ازاں جملہ ص ۶۱ میں دلبراں قافیہ تباں۔

۲۳۔ ص ۴۷ میں مصرع تجرد خورشید کیا ہے اس کی فلک کو خبر نہیں، کی کی جگہ کے ہونا چاہیئے یہاں کسی کے فلک کو خبر نہیں بطور محاورہ مستعمل ہوا ہے۔

۲۴۔ قریشی صاحب نے متروکات مستعملۂ غزلت کی بحث میں صرف ۶ لفظ دئے ہیں جن ۱۳۸ ۱۹ سطروں میں خاص خاص فارسی ترکیبیں جن سے "کلام میں شگفتگی ورعنائی پیدا ہوگئی ہے" جمع کی ہیں ص ۱۳۸ و ص ۱۳۹، اور ص ۱۴۲ میں "خالص ہندوستانی" الفاظ (۱۳۱) دئے ہیں، مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کون سا لفظ کس صفحے میں ہے۔ ذیل میں مختلف قسم کے مفردات ومرکبات جو مرتب کی فہرستوں اور "فرہنگ" سے غیر حاضر ہیں پیش کئے جاتے ہیں:

رشیلیل ۱۶۳ یہ خسرو کی نثر فارسی میں ملتا ہے، گل ناری ۱۶۶، ششش و پنج حساب ۱۶۴ عیبی ۴۶، شبنمستان ۵۳، کج دار و مریز ۵۶، ریز ریز کرنا، دید اور وا دید، لگانیاں (جمع بگانی) ۸۴، اما ۸۵، نو طرحی عشق سخنگو ۸۷، رنگیلا (با علان نون) ۲۱۹ (دوسرے مقامات میں نون غنہ کے ساتھ)، بدروشی ۹۲، دمو ۱۰۰، ایمانیاں ۱۰۹، سکرات ۱۱۴، دنگ (کذا) و دوال ۱۲۶، وسعت مشربی (۱۳۱، ہوئے مستوں پہ گر تیغ زباں زن شیخ شیخی میں جو اپنے نفس پرور ہونے مردانے (قافیہ) ہوئے ہونے، ۱۳۲، گپ مارنا ۱۳۸، رفو کار ۱۴۰، مدخولہ ہے مادی ۱۴۴، ھگوے پوش ۱۴۵، کچکول ۱۴۸، نوید وصل تو دے ہے کہ شادی (کذا) مرگ ہوں ۱۵۲، دہ داتری، نکتہ وری ۱۵۳، چقماق کسی پر جھاڑنا ۱۵۶، دروزن ۱۵۸، لباسی ۱۶۳) نگھولے (زیادہ تر اسی طرح، ایک آدھ جگہ بگولا) سا عجائب مہر قماش رخت فقر اپنا کہ الفابر میں خاک دشت و سر پھرنے کی طاقی ہے (کذا)، بوسۂ چیپال ۱۶۹، جواب خنک یُدّدولی ۱۷۵، گل کمدن ۱۷۸، خنکخانہ ۱۸۲، طیشی پردانگی دنیا ۲۰۴، ہم تول (قافیہ ڈالواں ڈول) ۲۰۵، مچلکے (۲۱۱)، خمال، چمن رو ۲۱۲، گرم الفتی ۲۱۳، زنانی وضع ۲۱۴، خوشگاہ، زہری ۲۱۵، جیز (ہیز) ۱۷۶، قابوچی ۱۷۷، یوچی، کندے ناتراشیدے (کذا) ۱۳۱ صندلی برن ۱۳۵، ضعیف نالی، الست ۳۹، خزہ پوشی ۵۷، مشکل آسان (مشکل آسان کرنے والا) ۶۳، نزعی ۹۱، بے صبر و تسکینی ۱۴۴، زہر خندی ۱۴۷، ہندو و مسلمین ۳۸، فرشتی حقہ ۶، خدا جانے (مقابل کافر) ۹، دستخطی احباب ۱۳، میری ۱۶، خاموش صفیری، ہولی با ۴۳،

بو کرنا ۲۸، قینچی ۳۰، قیدستان ۴۶، جلوہ وستاں، بلبلستاں ۴۷، قربا دکش ۹، مغز بجانہ تھا ۱۱،
دیوان قضا کی پیش کاری ۱۳، طوف کرنا ۱۴، خونیں نین ۱۵، صاف ضمیری ۱۶، جمشزاد ۱۹، مرزا
منش، امام حلقۂ تسبیح ۳۴، یادزن ۳۹، وحیدی ۴۰، ڈسرنا ۴۴، کون فروشی ۵۱، روشن
طبع ۵۷، دل وحشت پناہ ۲۵، زنجیر خانہ ۵۳، خطوط کیک، کفنی ۴۷، چشم پوشی ۷۵،
زلیتین ۱۲۳، جوروکریا، سوختن ۱۲، کج اقرار ۱۲۰، کینت ۱۱۴، دو دل ۱۱۳، نروالا ۱۵،
جھکڑ ۱۶۳، لپٹا لپٹی ۱۷۷، کیٹی، جپی، نکٹی، مانگناں، گرما تو تو دلو (کذا) یا رنہیں تو تیر ۱۸۶،
پھوٹ پھوٹ کر اس کو نمک نکلا ۱۴، منڈلا رہوں گا ۱۷، بیارا (بروزن دارا = جدا) ۱۸،
مجھ کو گردنی مارا، تیجا ۲۰، کھل جانا، کوئلا (بروزن مرحبا) ۲۱، انگارے (بروزن نگارے
جیا ۲۲، ڈھیرا ۲۳، اندھیاری، گلالی، بھاگ جگانا ۲۶، گنانا ۲۷، سایۂ گر عشق کا
تھا صورت شیر بب پر کبھی (کذا) بے (پہ)، کہانا، رسولی ۳۱، ہت کھنڈا (بروزن درہنگا)
پڑا ۴۳، جڑنا، حقہ گڑگڑانا، ڈھیر ہیں (کثرت سے ہیں) ۵۰، نکتوڑ ۵۴، ادھورا،
ڈھل پڑنا ۵۶، نکتوڑ ۶۲، کڑوی گالیاں، بیسر لوں کا گل کی ہے جلا دمالی الحفیظ (کذا)
۶۲، بنیدھنا (کذا)، جیونا ۶۶، دھندلا، جھاڑ (درخت) ۶۹، ٹیسو کے بندرابن ۷۱،
پان کی بیڑی ۷۲، بھنبھیری، دھمال (بروزن خراب) ۷۳، ٹھگوی (صفت کفنی) ۷۴، نام
جپنا ۷۶، نین بیترہ ہونا ۷۷، بھنور (بھنورا) ۸۳، ڈول ۸۶، ڈو لیگا ریل میں کنعاں سے
لے تا مصر تمام ۹۲، اگون ۱۸۳، پیا پردیس سے مجھ گھر کو دھائے، اک پل میں نین دراوتے ہو
۱۹۵، نچاونا، بلاونا جلاؤنا سا چار ۱۹۶، کرچ (کھرچ) ۲۰۱، بگ پارہ باٹ ۲۲، سات اور
پانچ، عولت کن (عولت کے یہاں) ۲۱۱، کھیڑا ۱۰۰، بادل دھائے ۱۷۹، خوشی سے بینگتی ہیں
کر کلیلے، جھلانا، ساون کال پھنکارے من کہ ڈسنے کو یہ ناگن، بیٹ تولی دسہرے سے میں
گہری کہ ماری من کی شیشی (شیشے ؟) پر دسہری ۱۸۰، نیل کنٹھ، چھیلا، کنٹھ، دشمن کی طرح
بھر بھر سانس ہاینوں، سینا، جھانہ ۱۸۱، ناریاں، جنوں نے آگ کیا دل میں دھکائی ۱۸۱، دھرتی ۱۸۲،

بھیں لو ہیں اڑے ہے جھاڑ جرتی، گلبا نہہ، تھا تنک آسودہ لنظر نید میں لٹو ہو کر ۲۰۴، اگن ۱۸۲،
پیا پردیس سے مجھ گھر کو دھائے، من ہرن ۲۰۵، دلن ہاری ۲۰۸، پاٹ بھرنا ۲۱، درپڑا،
درد پیڑا، اعزاز و مان ۲۱۱، عزلت کن (عزلت کے یہاں)، اس خنک مہر گرم الفتی
بنیاؤ مت ۲۱۸، ہو ہجر کی رات سنناتی ناگن سے پھنکار کیونکر جاوے ۱۱۲،
۱۱۳، سبھی ہیں حق ہے پر عارف میں کیا سیوا (کذا) جھمکا ہے، یکا، دل بیراگی عزلت میں رکھتا
ہے دم ہستی کمر میں اس میاں کے (کی چاہیئے) جیسے سیلی کا منکا ہے کہ یاں تو ایک سوانگی للکھ
یہیوں میں مٹکتا ہے (کذا) ۱۱۴، کھگوا ۱۹۹، ننگاپے (کذا) میں لے عزلت تو جیتا ہوں
اپنی چھاتی کو ۱۲۳، ابیلا بیلا ہونا ۱۳۶، شعلے جھال والے، بگولے سارے میں اٹکل کہنا ۱۳۴،
مکڑتے ۱۳۷، کارواں ہانکنا ۱۳۷، ڈیرا ۱۳۸، باولا، جلنہار ۱۴۰، جلا دل عاشقوں کا
گل رخوں کے ہونٹھوں میں ہے (کذا) ۱۴۵، دھلینڈی مچانا ۱۵۰، کھنکنی ۱۵۱، نجنت ۱۵۲،
سنگھات (باعلان نون) ۱۵۷، تاگا سوئی ۱۵۸، ناکے کی درزن، تجھ کو کیوں جھل (جھل
چاہیئے) لگے ناصح ترا کیا لگتا ہے ۱۶۴، جیری ۱۶۶، دھول ۱۶۷، گھائل (بروزن
قاتل)، جونا چاٹی ۱۷۶، برہن ۱۷۵، تو رکھ ہرنی کو کامن سات دن رین ۱۷۹، بادہ ماسا
بیچ میں پچیس کا نام نہیں ۹۴، الینڈنا ۱۰۵، پہرانا ۱۱۲، ان سنی ۸۶، دودھار اخنجر ۱۱۰،
گت ناچنا ۴۹، جونرا، نبا (نفی) ۵۰، تاگا ۵۱، پھلنے ۳۷، کان پکڑنا ۶۲، لجانا ۶۳
ہتھیلی کا پھپولا ۱۴۵، سینہ در ۱۶۴، بجن بکنا ۱۸۲، (یہ بحث نامکمل رہ گئی، کبھی اور اس
کا تکملہ لکھا جائے گا)۔

۲۵۔ ذ = مذکر، ث = مؤنث، دار ذ ۴، ندی کا پور، چنور ذ ۵، نزمیں ۶،
صندل ذ فلیل ث، رقم ہے صاد کا ۷، ربیت ث، کیک ذ ۱۶، خارستان و جھبڑ ذ ۱۷)
رنگ زرد اور سرشک سرخ تو دیکھ کیا خزاں میں بہار ہے میرا ۱۹، سرد مہری کا نیول
کے جب پڑا سر ملئے سرد چشم پوشی دل یہ عزلت کے دوشالہ ہو گیا ۲۴، کروں کیا ہے یہی

چاک گریباں دستگاہ اپنا ۲۵، دن پڑے اب جول شب قدر آرزو کرنا پڑا ۳۸، آب (آم) ۳۳، لسنت ث ۳۸، میری مراد نہ دی ۵۸، تلاش ذ، یہ شوخیوں سے کرے (کریں) ہیں وہ چشم گلگوں رقص ۶۰، گھونٹ ۶۲، بہار آئی ۸۹، آنکھ بھرا ہی ۱۳۸، منہ پہ زلفیں تبھی بکھرا ہے جھنکارت ۸۴، زہ دامن ث ۱۰۶، گلیا نگیں ۱۰۸، رمز ۱۰۹، ٹین ذ، ٹھیس ت ۱۲۰، لگن لگی ہے۔

۲۶۔ مقدمے میں عروض کی بحث مطلقاً نہیں، حالانکہ دیوان کے متعدد اوزان توجہ طلب ہیں اور یہ بات بھی قابل ذکر تھی کہ ان کے یہاں حروف بہت دبتے ہیں۔ اشعار ذیل کو دیکھیے:

(۱) اس کے ہجر کی تیغ کے زخمی کو اے خضر اب نہ دعا کرو جیتا نہیں
لب پہ جب جان آچکا جاؤ تو جاؤ رہے تو رہو جو ہوا سو ہوا جو ہوا سو ہوا

(۲) میں شاہ اقلیم صحرا ہوں شیروں کے نعرے نقیبوں کے شوروں کے مانند
فوج غزالاں ہے میرے جلو میں گھوڑے ہیں فیلوں کے توروں کے مانند

(۳) گریباں پھٹ گیا خفا ہونے لگا دل بات کھجائے بس کیا کروں میں
سوا چاک قبا کے علاج نہیں عزلت دو جا جنوں کے خیال اوپر

(۴) مری گرم نگاہی سے وہ عرق افشاں بیاپے ہووے ہے حیا کی قسم
مری مژگاں کا سایہ حسن پیرہن ہے وہ بت کو حباب خدا کی قسم

۲۷۔ مقدمے میں اس کا ذکر نہیں کہ عزلت نے سودا (ص ۵۱) اور فغاں (ص ۱۳۰) کے ایک ایک مصرع کی تضمین کی ہے۔

متن دیوان ۳ نسخوں پر مبنی ہے، اغلاط جن کی ظاہراً مرتب کو خبر نہیں موجود ہیں، ذیل میں ان کی نامکمل فہرست دی جاتی ہے:

(۱) میرے نزع کو نہ ادسے کہو ہوا سو ہوا ص ۲۵ = مری نزع کو نہ اس سے لخ۔

(۲) باد پہ چلی ہے لسنت کی ص ۱۵۲، باد کی جگہ باؤ ہو گا۔

(۳) کوں ص ۱۷۳ = کون

(۴) اس خسر (خ س ر) کا کئی روز میں انسان بنے گا ص ۱۳، ناموزوں، خسر کی جگہ خرچاہیے

(۵) جیسے ساون میں ہو کانٹے پہ پھیری کا مزا ص ۱۶ گل کا ہر رگ ہے ساون کی پھیری۔
بلبل ص ۷۲۔ دونوں مصرعوں میں قافیہ پھیری ہے۔

(۶) ہمارا مطلب دل کو تری بلا پوچھے ص ۱۲۱ لفظ اول ہمارے ہوگا۔

(۷) حضرت دل مدظلہ مرشد و اوستاد ہے ص ۴ اوستاد بروزن نوشباد ہے، اس طرح پڑھا جائے تو مصرع ناموزوں ہے، عزلت نے استاد لکھا ہوگا۔

(۸) تیرے لقا ص ۱۲۹ = تری لقا۔

(۹) نگیں کے طرز ص کی چاہیے۔

(۱۰) ہو رہو کتنی دن اوروں کے گلے کا ہار تم ص ۷۸، کتنی کیا بلا ہے؟ کتنے ہوگا۔

(۱۱) ص ۱۲۲ میں مخلط (ہر دو ظ) آیا ہے، یہ مخطط کی خرابی ہے۔

(۱۲) معنی باریک عزلت کہنے میں آتے نہیں ٹوٹے تھے مضمون نازک ٹھیس سے تقریر کی۔
ص ۱۲۰ تھے کی جگہ ہے درکار ہے۔

(۱۳) دیکھو سفیانوں نے یا بنی کیا ہاتھ اٹھایا ہے ص ۱۶۵ ناموزوں سفیانوں کے عوض سفیانیوں چاہیے۔

(۱۴) نہ پوچھو اس کی کیفی آنکھ کو سرمے نے گھیری ہے ص ۱۶۶ پوچھو = بوجھو (۱۵) دبلاؤں ہوا اب ہم سے گیا بادش بخیر ص ۴۹ ناموزوں، اس سے قطع نظر پہلا لفظ دبلاؤں ہوگا۔

(۱۶) اے عزلت ایکے برس فصل برشگالی سے ص ۱۳۶ برشگالی = برشگانی۔

(۱۷) بے ستوں ص ۱۲۵ = بیستوں۔ اور جگہ بھی بے ستوں۔

(۱۸) یارم اس بزم سے یہ زہر کا نکر (قافیہ شعر سابق پکڑ) جلئے ص ۱۳۷، نکر = نکڑ۔

(۱۹) چمن سب بن گیا میخانہ اور دوکاں کیا پی (کیا اور پی الگ الگ) کے ص ۱۴۵۔ آخری الفاظ دوکاں کیا بی کی، ہیں۔

(۲۰) ڈھلندی پنچمیں کے دن وہ بیروا پچاتا ہے ص ۱۵۰، ابتدائی الفاظ ڈھلینڈی پنچمی

(۲۱) سنجاف (س ن ج ا ف) سرخ بہت سجھے کوئی گرد اس کے داماں کے" ص ۱۳۴، سنجاف بر وزن نقاب، ایک جگہ اور۔ صحیح لفظ سجاف بدون نون ہے، اور دونوں جگہ یہی چاہیئے۔ سنجاف بروزن کمخاب اردو والوں کا تصرف ہے، اس کی یہاں گنجائش نہیں۔

(۲۲) خصم جو مقراض گلچیں ہیں تیرے اے سر و قد ص ۱۱۸ جو = جوں، تیرے = تیرے۔

(۲۳) جس بحر میں یہ پڑتے ہیں باٹ، اور ہے ص ۱۵۱ پڑتے = پیرتے، باٹ = پاٹ؟

(۲۴) اوس کی جولاں کی ہوا سے گئی ہے برباد (اور) اوس پر ص ۵۹ اور اضافہ مرتب، لیکن مصرع یہ ہو جب بھی ناموزوں اور ہو جب بھی۔

(۲۵) جہاں تمھیں کہوے یار عزلت تمھارے دل میں بسے ہے اور
کہاؤ تجد کے انڈے دیتے ہو دیر میں مثل میا رک
ص ۶۹ پر ہر دو مصرع ناموزوں

(۲۶) دو ہو ہو (دو الگ ہو اور ہو ملے ہوئے)

تب ہی تج دیئے ذوق عیش زندگانی کو
مرنے سے عمر کھجرے کی طرح کھا گئی جوانی کو

ص ۱۰۔ دو ہو ایک ساتھ اور ہو ان سے الگ ہونا چاہیئے، کھجرے = کھچڑی۔

(۲۷) ل سنگدلوں سے سینہ صافی عزلت کیوں ہے
رنگ آیا اسے مٹکا بھی دیکھا یار سے جیوں تھا تیوں ہے؟ ص ۱۷۷

حاشیے میں ہے کہ "یہ حقیقت میں قطعہ ہے، کیونکہ اس کا وزن رباعی کے مروجہ اوزان سے خارج ہے"۔ یہ بیعت اول ہے ایک رباعی مستزاد کی۔ مصرع ا میں عزلت الخ اور

مصرع ۲ میں جیوں الخ اضافے ہیں جو مستزاد میں ہوا کرتے ہیں۔ رنگ غالباً رنگ
اور پارے بارے ہے - ۲۸۔

(۲۸) قیل وقال قافیہ قیل ص ۱۵۸، قال وقیل چاہیے۔

(۲۹) سر پر پڑی ہے مرے اب فکر ٹوٹ ص ۳۷ پر = پہ

(۳۰) عبیر ۱۵ = ابیر

(۴) ضمیمہ۔ ضمیمے میں بیاضوں اور تذکروں سے وہ اشعار لیے ہیں جو دیوان میں نہیں
۱۳۷ اشعار غزل کے خواہ غزلیں مکمل ہوں یا نامکمل، ان میں فردیات بھی شامل، واسوخت
مثمن کے ۱۵ بند، ایک بند کا ایک شعر جیسا کہ اوپر آچکا ہے، درج نہیں ہوا۔ اغلاط۔

(۱) لیک دلبری عاشق سوں تجھے کام بھی نہیں ص ۲۲۱۔ دلبری غلط، صحیح دلداری

(۲) اچیلا ص ۲۰۰ = اچپلا۔

(۳) تاجان ہوئی عدول حکمی تونے کہا تو مرگئے ہم ص ۲۰۵
مصرع ۲ ناموزوں، مصرع ۱ میں ابتدائی الفاظ یوں ہیں، تاجاں نہ ہوئی
دوسرے مصرع میں کہا کے بعد مر کا اضافہ ضروری ہے۔ یہ شعر عزلت کا نہیں
شاہ رکن الدین عشق دہلوی کا ہے، اور ان کے دیوان کے کئی نسخوں میں موجود ہے
تذکروں میں بھی ان کے نام سے ملتا ہے۔

(۴) میں دوا ناآہ کیوں نہ کروں ص ۲۷، دوا نا کے بعد 'ہوں' کا اضافہ چاہیے۔

(۵) بستار ص ۲۱۰ = بستار۔

(۵) فرہنگ۔ سو سے کچھ زیادہ الفاظ بعنوان فرہنگ۔ (ص ۲۲۴ تا ۲۲۷) دیے
ہیں، بعض اور ان کے معانی الفاظ مثلاً کلف، نہالی کے معانی درج کرنے کی ضرورت نہیں
متعدد الفاظ کے معانی غلط ہیں یا کم از کم جس شعر کی طرف فرہنگ میں اشارہ ہے (فرہنگ
میں حوالہ صفحہ) اس میں وہ معنی نہیں بیٹھتے:

۱- قودخاصے کا ہاتھی ص ۴۴ - فوج غزالاں ہے میرے جلو میں گھومے ہیں فیلوں کے قوردوں کے مانند، ایک جگہ یہ لفظ اور آیا ہے - اور اسی طرح - یہاں قطار کے معنی میں آیا ہے -

۲- چکارا قوی ہیکل توانا ص ۲۰۵ ہوا ہے شیر وچیتا ہے دل میں کیا عزلت رقیب کون چکارا ہے من ہرن کی قسم - شعر میں صفت ایہام برتی گئی ہے، چکارا ایک قسم کا ہرن ہے -

۳ - نہالی لحاف ص ۵۲ نہالی بستر اور توشک ہے لحاف نہیں -

۴- پکھال کیچڑ ص ۱۳۶ ایک قسم کی مشک ہے -

۵ - ملنگ بنجو ص ۱۶۲ ایک قسم کا فقیر ہے -

۶- نردچوسر کی گوٹیوں کی چال ص ۲۱۰ - نردچال نہیں، ایک کھیل کا نام ہے -

کچن کے معنی پستان اور ادھرن کے ہونٹ لکھے ہیں، یہ دونوں لفظ بطور جمع میں مستعمل ہوئے ہیں اور کچن اور ادھرن دونوں جمع ہیں، قریشی صاحب نے جس طرح لکھا ہے اس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے - واضح رہے کہ عزلت نے ہندی نظم میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، اردو میں نہیں -

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے میری یہ تحریک ہے کہ وہ عزلت کی مثنوی راگ مالا بھی شائع کرے، اور اس کے ساتھ دیوان عزلت اور اس کے مقدمے کا تکملہ بھی ہو - متن کی درستی میں دو اور نسخوں سے جس سے اب تک کام نہیں لیا گیا مدد لی جائے، فضول تنقیدی بحثیں نکال دی جائیں اور زبان کی جامع بحث شامل کی جائے -

قریشی صاحب پر میں نے بہت سے اعتراضات کئے ہیں، لیکن انھوں نے محنت کی ہے اور ان کا کام آج کل کتابوں کی ترتیب و تصحیح کی جو عام سطح ہے اس سے پست نہیں -

الرحیم (ماہنامہ)

اڈیٹر : پروفیسر محمد سرور

ناشر : شاہ ولی اللہ اکیڈمی. صدر، حیدرآباد (پاکستان)

زیر تبصرہ ماہنامہ جون ۱۹۶۳ء میں جاری ہوا ہے۔ اس کے پروفیسر محمد سرور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا اردو کے اچھے مصنفوں میں شمار ہوتا ہے، دور کے ماہنامہ جامعہ کے مضمون نگاروں اور جامعہ ملیہ کے ممتاز طلبائے قدیم میں سے ہیں، جامعہ میں ایک طویل عرصے تک معلمی کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی ترویج و اشاعت کے لئے جامعہ میں جب بیت الحکمت کا قیام عمل میں آیا تھا تو آپ ہی اس کے نگراں مقرر ہوئے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس غرض سے جب پاکستان میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی قائم ہوئی تو اس کے نظام کاروں کی نظر انتخاب پروفیسر سرور صاحب پر پڑی اور انھیں اکیڈمی کی تصنیف و تالیف کا نگراں اور ماہنامہ الرحیم کا مدیر مقرر کیا۔ ہمیں امید ہے کہ موصوف کے تبحر علمی، مولانا عبید اللہ سندھی کی رفاقت اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے سے گہری دلچسپی اور واقفیت کی بنا پر اکیڈمی اور ماہنامہ دونوں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

ماہنامہ الرحیم کے اس وقت چار شمارے پیش نظر ہیں۔ باوجود اس کے کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفے و حکمت سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، مگر ان شماروں میں فکر ولی اللہی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت ٹھوس اور پرمغز مضامین شائع ہوئے ہیں مگر جیسا کہ مدیر محترم نے اگست کے شذرات میں شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے اردو ترجموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی اشاعت کو عام کرنے کے لئے ان کی زبان عام فہم اور ان کا اسلوب آسان ہونا چاہیئے۔ ان مضامین کی زبان اور اصطلاحات کو بھی مزید آسان کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ زیادہ بہتر ہو اگر ان مباحث کو جدید رجحانات و افکار کی روشنی میں اور آجکل کی رائج اصطلاحات میں پیش کیا جائے۔

سالانہ چندہ آٹھ روپے اور ایک پرچہ کی قیمت ۷۵ نئے پیسے ہے۔

ع۔ ل۔ ش

مذہبی تعلیم

مذہب ایک قانون اور ضابطے کا پابند ہوتا ہے۔ اس کی اپنی شریعت ہوتی ہے تعلیم فی نفسہ عقائد کا ساتھ نہیں دے سکتی علم کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہوتی ہے۔ مذہب، پرستش کا قائل ہے، تعلیم پرسش کی لیکن تعلیم سے مخصوص نظریات کی تائید حاصل کی جاتی رہی ہے۔ مدتوں کلیسا نے یہی کام کیا ہے۔ آج بھی یہ صورت پیش آجاتی ہے جب کوئی سماج کلیتاً کسی ایک فلسفۂ حیات یا مکتبۂ خیال کا مدعی بن بیٹھتا ہے۔ تسلطانی نظام ہو یا اشتراکیت، سب ہی اپنا ہی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمہوریت میں تعلیمی ادارے اکثریت کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ یہاں بھی غیر جانب داری اور رائے عامہ کا نام لے کر ایسے طور طریقے برتے جا سکتے ہیں جو ایک طرفہ ہوں۔ مذہب کو خواہ کتنا ہی مدلل اور واقعیت پسند بنا کر کیوں نہ پیش کیا جائے، یہ خطرہ برابر لاحق رہتا ہے کہ پرستارانِ مذہب اپنی عقیدت مندی کے مطابق استاد سے اظہار خیال کے طالب ہونے لگیں اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں جمہوریت اور سائنس کے تقاضے پورا کرنے کے لائق ذہن تعمیر نہ ہو سکے۔ ایک جمہوری تعلیمی نظام بھی عملاً معتقدات کا شکار ہو سکتا ہے۔ اساتذہ کے اپنے احساسات، مذہبی رسومات، تہذیبی معاملات، بہرحال اپنا اثر رکھتے ہیں۔ پروپیگنڈے کے ذریعے جان بوجھ کر اثر پذیری کے اصولوں کے تحت دوسروں کو اپنا ہم خیال بنایا جاتا ہے اپنی ماہیت کے اعتبار سے مخصوص نظریات کی حامل یک طرفہ تعلیم اور پروپیگنڈہ دونوں فلسفۂ تعلیم کے منافی ہیں لیکن تعلیم محض حصولِ واقفیت کا نام نہیں ہے۔ اس کا منصب ذہن کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر ہے۔ تعلیمی آزادی سے مراد ہے نظامِ تعلیم کا غیر جانب دارانہ رویّہ، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ اس رجحان کو اس طور برتا جائے کہ واضح طور پر سماجی احساسات ابھر

سیکس تعلیم میں اگر یک رنگی کو دخل نہ ہونا چاہیئے تو بے رنگی بھی کیسے گوارا کی جا سکتی ہے۔ ایک بے اثر اور بے فیض تعلیم کیونکر اپنا منصب پورا کر سکتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کو جائز اور قابل تائید جانبداری کا قائل ہونا چاہیئے۔ اگر ایک طرف بچوں میں تنقید و تبصرہ کا مادہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ کسی ناجائز پروپیگنڈے کی زد میں آکر نہ رہ جائیں تو دوسری طرف پروپیگنڈے کو اس حد تک مفید بھی خیال کیا جا سکتا ہے جہاں تک کہ وہ جمہوری نظامِ تعلیم کی ترقی کا سبب بنتا ہے۔ جائز اور قابلِ تائید جانبداری کا مطلب یہ ہے کہ جو مقاصد ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں اور جن ذریعوں کو اپناتے ہیں، ان کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ گویا تعلیم کو بھی تہذیب کی طرح، ان اقدار کو ابھارنا چاہیئے جن کو تجربے کی بنا پر انسانی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم گاہوں میں ان کی آبیاری کے ساتھ ساتھ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش برابر جاری رہنی چاہیئے۔ استاد کو ہمیشہ اپنا ذہن پوری طرح صاف رکھنے کی ضرورت ہے اور اسے اپنی بات اس طرح کہنی چاہیئے کہ طلبہ اس کے ذاتی خیالات سے باخبر ہو جائیں اور اس پر غور کر سکیں استاد کو جمہوری طور پر رہنمائی کرنے کے لئے ذہنی اور اخلاقی دیانت داری برتنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا تعلیم کے ذریعے سماج بدل سکتا ہے؟ رجعت پسندوں کا یہ خیال رہا ہے کہ مدرسے شاذونادر ہی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ تو تقلید اور تتبع ہی کر سکتے ہیں لیکن روشن خیال اور معتدل نظریے کے حامی اس بات کو نہیں مانتے۔ دراصل تعلیم نے سماجی اقدار کو مستحکم بھی بنایا ہے اور سماج کے بدلنے کا فرض بھی پورا کیا ہے۔

یہ بات دراصل اس پوری تہذیب پر منحصر ہے جس کا ایک جزو تعلیم ہے۔ تعلیم کا اثر اس تقویت پر منحصر ہوتا ہے جو ان تہذیبی عناصر کی بنیاد پر اسے حاصل ہوتی ہے جن سے اس کی شیرازہ بندی ہوئی ہے۔

فطری اخلاقیات کے قائل اپنے آپ کو قوانینِ قدرت کا پابند بتاتے ہیں لیکن اس بنا پر یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اقدارِ عالیہ سے قطعی بے نیاز ہیں۔ حقیقتاً ایک غیر مذہبی آدمی مدرسے کو اخلاقی اقدار ہی کا مظہر اور مرکز دیکھنا چاہتا ہے۔ فطری اخلاقیات میں قوانینِ قدرت اور انسانی قدرت انسانی تجربے کی بات آتی ہے وہاں بالخصوص سماجی اور قدرتی فنون کے نتائج کی روشنی میں

معاشرے کے اصول مرتب ہوتے ہیں۔ اخلاق میں وہ افعال شامل کئے جاتے ہیں جنھیں انسان نے صدیوں پرانے تعلقات کی بنا پر اپنی فلاح و بہبود اور مسرت و عشرت کا ذریعہ سمجھا ہے۔ اس لئے اگر کوئی ادارہ غیر مذہبی عقائد کا علم بردار بنتا ہے، تو وہاں اخلاقی کردار کو اپنے اور اپنے بزرگوں کے عمل کے آئینے میں دیکھ کر سیکھتے ہیں۔ ایک قدیم اور پختہ تہذیب، مختلف عقائد مذاہب اور سیاسی نظریات کا زور لئے ہوتی ہے۔ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ نوجوانوں کے ذہنی خلفشار کو دور کر کے انھیں مفید مشاغل کی طرف لایا جائے۔ تعلیمی اداروں کو اپنے لئے ایک تخلیقی اور تعمیری مسلک متعین کرنا چاہیے۔ یہ مسلک کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں متعدد جواب دئے جا سکتے ہیں لیکن ہر ایک نامکمل ہوگا تاوقتیکہ اتنی بات کہی جائے کہ نوجوانوں کو دیس کا وفادار اور انسانیت کا پرستار بنانا چاہیئے۔ اُن کے اندر قوتِ فکر بڑھانی چاہیے، تاکہ وہ معاملات پر غور کر کے اپنا نتیجہ خود نکال سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تعلیم اپنا منصب پورا کرنے سے قاصر رہے گی۔

ہماری مرکزی حکومت نے ۱۹۵۹ء کے اختتام پر مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی جس کے صدر شری پرکاش جی تھے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں موجودہ معاشرت میں انحطاط کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اخلاقی پستی کو دور کرنے کے لئے اقدامات تجویز کئے ہیں۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی اور اس کی سفارشات پر عام طور پر عمل کرنے کے لئے کہا گیا لیکن فوراً ہی اس سلسلے میں کوئی خاص کارروائی نہیں کی جا سکی۔ کسی ایک نہج پر پہنچنے کی غرض سے چند ماہ ہوئے مرکزی وزارت تعلیم نے مختلف اداروں سے اس کمیٹی کی مختلف سفارشات کے بارے میں استفسار کیا تاکہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے بارے میں باضابطہ اور متفقہ طور پر کوئی مطمح نظر قائم ہو سکے۔ اس کمیٹی نے شخصی کردار کو بلند کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور اقدار عالیہ کے برتنے کی تاکید کی ہے۔ ہمارے سماج میں اخلاقی گراوٹ کے مظاہر کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور انھیں سماجی تعلقات کی ابتری کا ایک اہم سبب بتایا گیا ہے دیس کے مختلف العقائد لوگوں میں آپس کے بُعد کو دور کرنے کی غرض سے مختلف مذاہب کی تعلیم کو ضروری

سمجھا گیا ہے تاکہ طلبہ ان سب کی اخلاقی قدروں سے روشناس ہو جائیں۔ اس غرض سے مختلف مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کے حالاتِ زندگی بتانے کے لئے کہا گیا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طلبہ کو صحیح تعلیمی مواد فراہم کرنے کی اشد ضرورت ہے مادری زبان اور تاریخ کی درسی کتابیں اس باب میں خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن صرف کتابوں کی طرف توجہ کرنے سے کام پورا نہیں ہو جائے گا۔ رپورٹ میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ مدرسے کا کام شروع کرنے سے قبل طلبہ کا اجتماع کیا جائے اور اخلاقی تعلیم کا ہفتے میں ایک گھنٹہ ضرور رکھا جائے۔ یہ اقدامات ایک علامتی فعل کی حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں لیکن کسی طرح کافی نہیں کہا جا سکتا۔ اس رپورٹ میں صبح کے وقت طلبہ کے اجتماع میں دھیان گیان کی خاطر کچھ منٹ کی خاموشی کو بھی سراہا گیا ہے کہیں یہ عمل تو محض ایک رسم بن کر رہ جانے کا خطرہ لئے ہوئے ہے۔ اور کچھ مفید نظر نہیں آتا۔ اہم بات تو یہ ہے کہ سارے مدرسے کی فضا، اخلاقی اقدار کی نشو و نما کے لئے ساز گار بنائی جائے۔ اساتذہ کا اخلاق اور کردار مدرسے کے اندر بہت کچھ مناسب ماحول بناتا ہے لیکن مدرسہ پھر بھی بچے کی زندگی پر ایک متعینہ اور محدود حد تک ہی اثر ڈالتا ہے۔ سماج کے اثرات مدرسے سے کہیں زیادہ ہیں۔ جب بچے کے اردگرد ہر جگہ اخلاقی پستی کا دَور دورہ ہو تو اس کے اندر اقدار کا پاس پیدا کرنا دشوار ہے۔ بہرحال جہاں تک مدرسوں کا تعلق ہے وہاں مختلف فرقوں کے اساتذہ کی موجودگی مناسب ہے۔ اقلیتوں کی نمائندگی مدرسے کے عملے میں ضرور ہونی چاہیئے کیونکہ اخلاقی تعلیم کا جذباتی ہم آہنگی اور آپس کی مفاہمت سے بڑا قریبی تعلق ہے مختلف مذاہب کی واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی بھی صحیح معلومات نہایت ضروری ہے عموماً ہمارے طلبہ توہمات اور رسومات کو مذہب سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ ہماری جمہوریت سیکولر ہے۔ مدرسے کی تقریبات اور رسومات میں مذہبی رنگ ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ریاستی امور میں مسند نشینی، یوم تاسیس یا کسی افتتاح کے موقع پر کسی خاص مذہبی رسم کو جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ اس طرح دوسرے مذہب کے

لوگوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ مذہبی تعلیم کی اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مخصوص خوشحال طبقوں کی نمائندگی کرنے والے مدارس جنھیں 'پبلک اسکول' کہا جاتا ہے، طلبہ کے کردار کی تشکیل کے لئے مناسب ماحول پیدا کرتے ہیں اور انھیں دیس کے عام مدرسوں کو اپنے لئے نمونہ بنانا چاہیئے۔ لیکن یہ تجویز ایک غلط اندازے اور احساس کی دین معلوم ہوتی ہے۔ پبلک اسکولوں کو اپنے مادی وسائل کی فراوانی اور طلبہ کے سرپرستوں کی حیثیت کی وجہ سے کچھ بنیادی اقدار پیدا کرنے کا موقع ضرور حاصل ہو گیا ہے لیکن یہ اقدار دراصل مغربی تہذیب کی سطحی نقالی کی بدولت آئی ہیں۔ دراصل ضرورت یہ ہے کہ ہماری تعلیم، ہماری تہذیب کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو جس میں سائنسی دنیا کی روح بھی پھونک دی گئی ہو۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تہذیب کی ٹھوس بنیادیں، عالم گیر ہوتی ہیں۔ آج دنیا کو ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو اپنی اقدار کے اعتبار سے کسی جغرافیائی حدود کے اندر محدود نہ ہو، جہاں آزادانہ طور پر تبادلہ خیال ہو سکے اور جہاں انسان دوستی کا درس دیا جا سکے۔ اخلاقی قدروں کی ترویج، اور کردار کی تشکیل، کہنے سے کچھ ایسے ہی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

'معلّم'

کوائف جامعہ

گوشۂ جگر کا افتتاح

حضرت جگر مرحوم کی کچھ یادگار چیزیں ان کے بے تکلف اور جگری دوست جناب تسکینؔ قریشی صاحب کے پاس تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان چیزوں کو کسی علمی اور تعلیمی ادارے میں محفوظ کر دیا جائے تو مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے میں بڑی مدد ملے گی اور اگر کوئی صاحب ان پر کام کرنا چاہیں گے تو ان کو اکٹھا مواد مل جائے گا۔ حضرت جگر کا جامعہ ملیہ سے بڑا گہرا اور پائدار تعلق رہا ہے۔ "شعلۂ طور" کو مکتبہ جامعہ نے جس اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا اُس وقت غالباً کسی اور کا کلام اس قدر دیدہ زیب اور خوب صورت شائع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جناب تسکینؔ نے امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب سے "گوشۂ جگر" کے قیام کی خواہش ظاہر کی ان دونوں بزرگوں نے اس تجویز کو بڑی خوشی سے منظور کیا اور حضرت جگر کی تیسری برسی کے دن، ۹ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس کا افتتاح فرمایا۔ افتتاح کی کارروائی تلاوت قرآن حکیم سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے گوشۂ جگر کے قیام کا اعلان فرمایا۔ اس کے بعد جناب تسکین قریشی صاحب نے ایک مختصر تقریر کے بعد امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں حسب ذیل چیزیں پیش کیں:۔

۱۔ مسودہ غزلیات شعلۂ طور و آتش گل (جمع کردہ قیسی فاروقی)

۲۔ بیاض غزلیات (مع انڈکس مرتبہ تسکینؔ قریشی صاحب) ۱۱ عدد

۳۔ ڈائری، ۲ عدد

۴۔ نوٹ بک (یادداشت) جس میں پتے بھی درج ہیں۔

۵۔ مسودہ آتش گل (مرتبہ تسکین قریشی صاحب)

۶۔ آتشِ گل مطبوعہ پاکستان (مع ہندوستانی ایڈیشن)

۷۔ مسودہ مکتوبات جگر (مرتبہ قیسی فاروقی) غیر مطبوعہ

۸۔ اصل خطوط جگر بنام تسکین قریشی صاحب (جو مکاتیب جگر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں)

ان کے علاوہ مرحوم کی پان کی ڈبیہ، عینک، سپاسنامے اور کچھ کتابیں ہیں جو مرحوم کو پیش کی گئی تھیں۔

اس کے بعد مرحوم کے چند ریکارڈ سنائے گئے، پھر جناب ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب، استاد جامعہ کالج اور جناب رشید نعمانی صاحب، استاد آرٹس انسٹی ٹیوٹ نے مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر مضمون پڑھ کر سنائے۔ آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مختصر سی تقریر کی۔ یہ تقریر اور دونوں مضامین، انشاءاللہ جامعہ کے اگلی اشاعت میں شائع کئے جائیں گے۔

اس مختصر تقریب میں جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کے علاوہ میرٹھ کے کچھ معززین نے، جو حضرت تسکین کے ساتھ تشریف لائے تھے اور دلی کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

یوم اساتذہ

۵ ستمبر کو جامعہ میں یوم اساتذہ منایا گیا۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ جامعہ کے تمام تعلیمی اداروں کے نمائندوں نے تقریریں کیں، جن میں استادوں کی ذمہ داریوں، ان کی معاشی اور سماجی حالت، ان کے حقوق اور فرائض اور ملک کی تعلیمی حالت پر روشنی ڈالی گئی۔ آخر میں صدر جلسہ نے اس دن کی اہمیت اور خصوصیت کو بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ آج راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن کا یوم پیدائش

ہے۔ موصوف کا کسی سیاسی دَل سے کبھی بھی تعلق نہیں رہا ہے، اگر آج ہماری ریاست کے سب سے بڑے عہدہ دار ہیں، اس لئے کہ ایک معلّم کی حیثیت سے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ ملک کی خدمت کی ہے۔ آپ نے ملک کی تعلیمی حالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں شبہ نہیں ہمارے یہاں تعلیمی حالت اچھی نہیں ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد اس میں کافی سدھار ہوا ہے اور اس نے اچھی خاصی ترقی کی ہے۔

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائٹل: دیال پریس دہلی

gd. No. D - 768 October, 1963

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

۴۹ – (۵)

جامعہ

امعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ | قیمت فی پرچہ
چھ روپے | پچاس نئے پیسے

جلد ۴۹ | بابت ماہ نومبر ۱۹۶۳ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

ہز ہائنس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ کا گراں قدر عطیہ

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جگر مرحوم کو خراجِ عقیدت

ڈاکٹر ذاکر حسین

جنابِ شیخ الجامعہ[1]۔ شکر گزار ہوں کہ اس صحبت میں شرکت کے لئے آپ نے مجھے یاد فرمایا شکرگزار ہوں کہ ایک موقع آپ نے اور دیا کہ ایک رنگیں نوا شاعر، ایک خوش خو، خوش خیال و خوش خصال انسان، ایک پیکرِ محبت و شرافت، ایک مردِ غیور و خوددار، ایک مجسمۂ خلوص و استغنا، ایک عزیز دوست اور کرم فرما، حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی مرحوم و مغفور کی یاد پر عقیدت کے دو پھول چڑھا سکوں۔

اس کارخانۂ ہستی کا دستور ہے کہ جو آتا ہے جاتا بھی ہے، ضرور جاتا ہے اور بلا استثنا جاتا ہے۔ مگر آدمی کی بھول کا کچھ عجیب حال ہے کہ جب بھی یہ یقینی حادثہ پیش آتا ہے تو ایک دھکا سا لگتا ہے، مگر پھر بھول ہونے لگتی ہے، مگر حادثہ کا ایک نقش ذہن پر رہتا ہے جو طرح طرح سے بار بار اُبھر آتا ہے۔ جگر صاحب جب دنیا سے رخصت ہوئے تو ایسا ہی دھکا پہنچا اور سخت دھکا۔ اور یہ شعر یاد کر کے بھی دل کا دکھ کم نہ ہوا کہ

قریبِ منزلِ آخر ہے الفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند آ ہی جاتی ہے

یا اس خیال سے کہ

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

---

[1] گوشۂ جگر کے افتتاح کے موقع پر ۹ ستمبر ۶۳ء کو یہ صدارتی خطبہ پڑھا گیا تھا۔

آج جو آپ نے یہاں بلایا تو وہ حادثہ کی یاد پھر تازہ ہوگئی، مگر آج کچھ ایسا لگا کہ جگر صاحب تو زندہ ہیں، زندوں سے زیادہ زندہ۔ اور ان کا یہ شعر یاد آیا۔

دل کو سکون روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

جو موت دوست کا پیام بن کر آتی ہے وہ موت زندگی پر ہنس سکتی ہے کہ وہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتی ہے، ایک نئی زندگی کا پیام، ایک نئی زندگی کا دروازہ، حال اور مستقبل کی حد فاصل نہیں ان کا دریچۂ واصل۔ مرنے والے کو زندگی ہی میں اس کا یقین تھا:

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیے بہانا

وہ اسی بشارت اجل کا بہانہ تھا۔ خدا اسے شاعر دلنواز اور عاشق پاک طینت کو اپنی بخششوں سے نوازے۔ وہ تو ہم سے رخصت ہو کر روح کائنات سے پیوستہ ہو چکا، لیکن اس نے اپنی روح کی تڑپ، اپنی نظر کی پاکی، اپنے دل کی گرمی کے انمول خزانے اپنے کلام میں محفوظ کر کے ہمارے لئے چھوڑ دیے ہیں اور اپنی محبت، اپنے خلوص، اپنی مروت کی یادوں سے ہمارے دلوں کو سجا گیا ہے۔ ان سے کام لینا ہمارا کام ہے۔ جگر تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ہمیں بھی اس جاودانی زندگی میں شریک ہونا چاہیئے۔ اس مرکز علم وادب میں اس جگر گوشہ کی ترتیب اسی کا سامان ہے۔ میں کارکنان جامعہ کو مبارکباد دیتا ہوں اور جناب تسکین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کے تعاون سے یہ گوشہ جامعہ ملیہ میں مرتب ہو رہا ہے، جس جامعہ سے اس کا میں شاہد ہوں جگر صاحب کو بہت گہرا تعلق خاطر تھا۔

جگر مرحوم کا سلوک خوردوں کے ساتھ

جناب سید ابوالکاظم قیصر زیدی

("گوشۂ جگر" کے افتتاح کے موقع پر یہ مضمون پڑھا گیا)

ضابطۂ اخلاق کا ایک ادنیٰ سا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی مریضانہ کیفیت میں مبتلا ہو جائے جس میں متعدی اثرات ہوں تو مریض خود ہی اس کا اہتمام کرتا ہے کہ جن کو وہ عزیز رکھتا ہے ان سے دور رہ کر، بے تعلق ہو کر، ان کو اس مریضانہ کیفیت سے بچاتا ہے۔ میری کم علمی اور ادبی بے بضاعتی نے مجھے گم نامی کی اس ہی منزل میں پہنچا دیا ہے جس میں یہ مریضانہ کیفیت موجود ہے اور میں اپنے کسی محترم عزیز اور ذی شرف کرم فرما کے ساتھ اپنا ذکر کرتے ہوئے اس ہی لئے ڈرتا ہوں کہ میری گم نامی کی آلودگی کہیں اس کے دامن کو بھی نہ چھو جائے۔ مگر جگر مرحوم جس شرف کے مالک تھے اس کے بارے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ان کا شرف ان تمام غیر معروف وابستگیوں کے تذکرے سے بڑھتا ہی جائے گا۔ ہاں اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ ذکر کرنے والے کو گم نامی کی جو سعادت میسر ہے۔ وہ کم ہو جائے گی۔ میں جگر مرحوم سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے ملا اور پھر جب تک موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کو ہم سے چھین نہیں لیا ملاقات کا یہ شرف بار بار ملا۔

مدتوں میں ایک مسلسل خیال بناتی ہے حقائق کے طلسم ... موت اک آن میں افسانہ بنا دیتی ہے

اس مدت مدید میں، ادبی سفر میں شریک کارواں رہا اور کبھی مادی سفر کی رفاقت بھی میسر ہوئی۔ پہلی ملاقات قرول باغ کے ایک غیر معروف گوشہ میں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت جگر اس عالم میں ہیں جس میں تعارف اور ملاقات محض بے معنی ہوتی ہے مگر ان کے کلام کے مطالعہ کی بدولت یہ بھی جانتا تھا کہ میں جگر سے جب بھی ملوں گا ان کو ایک مدہوشی کے عالم میں پاؤں گا۔ ایک ایسی مدہوشی کے عالم میں جو کبھی بےخبری کی حدوں کو نہیں چھوتی ہے سرشاری کی ایک ایسی کیفیت میں جس پر صد جہانِ عقل و ہوش کو نچھاور کیا جا سکتا ہے۔ میں

حاضر ہوا محمود علی خاں صاحب (جامعی) کے مستقر کے ایک مختصر سے کمرے میں، رسمی سلام کا جواب جس انداز سے پایا وہ بہت مایوس کن تھا — جگر مرحوم منگلور ضلع سہارنپور کے ایک بزرگ حضرت شاہ عبدالغنی رحمت اللہ علیہ سے نسبت ارادت رکھتے تھے، میں ان ہی کے آستاں سے آیا تھا، میں نے اپنا نام بتلاتے ہوئے اس قریہ کا نام بھی لے دیا اور میں جو چاہتا تھا وہی ہوا۔ جام مے کی سرشاری، شہر محبوب کا نام سن کر ایک وارفتہ والہانہ کیفیت میں بدل گئی اور دوسرے ہی لمحہ میرے ہاتھوں کو ان کے لرزتے ہوئے ہونٹ مس کر رہے تھے کیونکہ ان کے شیخ کے آستانہ کو میں ان سے چھو آیا تھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور میرے نام کی ترکیب میں کچھ شاعرانہ جھلک پا کر مجھ سے کچھ اشعار پڑھنے کی فرمائش کی۔ میری جواں عمری کی شوخی، اندیشہ دیکھئے کہ میں اپنے ایسے دو اشعار پیش کر بیٹھا جو نہ صرف یہ کہ جگر مرحوم کی معروف زمین میں تھے بلکہ ایک مصرع بھی جو کا توں موجود تھا۔ میرے بیان کو سچ ہی مان لیجئے کہ میں نے جب یہ اشعار کہے تھے تو جگر کی غزل میری نظر سے نہیں گزری تھی اس کا نغمہ میرے کانوں میں نہیں گونجا تھا۔ میرے اشعار یہ تھے

اے تغافل سے دیکھنے والے　　　　دل کی دنیا تباہ ہوتی ہے

جو مسرت نے پھول برسا دے　　　　ایک وہ بھی نگاہ ہوتی ہے

اور اس جرأت کا نتیجہ کسی ندامت میں مبتلا ہونا نہ تھا بلکہ میں اپنا دوسرا قطعہ اس مسرت کے جذبہ سے پیش کر رہا تھا کہ پہلے قطعہ کو شرف پسندیدگی عطا ہوا ہے اور پھر بیس سال سے زیادہ مدت میں یہ ہوا کہ جس مشاعرے میں جگر مرحوم موجود ہوتے اس میں بجائے اس کے کہ یہ خوف پیدا ہو کہ شعر و ادب کے اس آفتاب کے مقابل ہمارے ٹمٹماتے چراغ اپنا وقار کھو دیں گے یہ یقین اور اعتماد پیدا ہو جاتا کہ سامعین سے خراج تحسین اس لئے پائیں گے کہ جگر اپنی خصوصی نوازش کو کام میں لاتے ہوئے فرمائش کے طور پر کوئی اشارہ ضرور کریں گے اور ان کا یہ اشارہ ناموافق فضا، کو بھی سازگار بنا دے گا اور اس طرح اس آفتاب کی پوری تابناکی میں یہ چراغ بے نور نہ ہو سکے — میں نے خوردوں کے ساتھ جگر مرحوم کی دلنوازی کے اس سلوک کو دیکھا ہے جو ان کو عز و شرف عطا کرتی تھی اور صاحبانِ عز و جاہ سے وہ بے پروا سلوک بھی دیکھا ہے جو غیر محسوس طور پر درجات کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔ میں نے جگر کی مدہوشی میں ہوش کی تمام حسین کروٹیں دیکھی ہیں۔ ان کی کرمفرمائی اور بندہ نوازی کی یادوں کی بدولت اس لمحہ میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ

قدم قدم مری ہمت بڑھائی جاتی ہے　　　　نفس نفس تری آہٹ سی پائی جاتی ہے (جگرؔ)

ملا محمد صوفی مازندرانی

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

بانکی پور کی فہرست[۱] میں لکھا ہوا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے "محمد صوفی" نام کے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر کے ایک کے شعر کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مؤلف صحف ابراہیم نے صوفی مازندرانی، صوفی شیرازی، صوفی کرمانی، صوفی اردستانی، صوفی آملی اور صوفی ہمدانی چھ ہمنام شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ آتشکدہ میں صوفی اصفہانی نام کے ایک شاعر کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ صوفی کشمیری نام کے بھی ایک شاعر گزرے ہیں۔ مجمع النفائس میں ان صوفی کو شیراز کا بتایا گیا ہے۔ نیز اس کے مؤلف کو یہ نہیں معلوم کہ صوفی شیرازی اور صوفی کرمانی دونوں ایک ہی ہیں یا الگ الگ۔ البتہ تقی داعدی نے صرف صوفی مازندرانی اور صوفی استراجاری دو شاعروں کا نام دیا ہے۔

ملا محمد صوفی متخلص بہ محمد و صوفی مازندران کے شہر آمل میں پیدا ہوئے۔ مگر غالباً بچپنے ہی میں شیراز جا کر رہنے لگے تھے۔ وہ صرف شاعر اور صوفی ہی نہ تھے بلکہ سیاح بھی تھے۔ پہلے انھوں نے پورے ایران کا دورہ کیا اور اس کے بعد شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اپنے وطن سے ہندوستان آئے اور یہاں آ کر گجرات کے شہر احمد آباد میں سکونت اختیار کی۔ گجرات سے صوفی کئی دفعہ حج کے لیے گئے اور غالباً یہیں سے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی جاتے رہتے تھے۔ اور مدتوں کشمیر میں بھی رہے تھے۔ بلکہ بعض تذکرہ نویسوں کے کہنے کے مطابق تو انھوں نے کسی زمانہ میں اسے اپنا وطن بھی بنا لیا تھا۔ ہند میں رہ کر ان کو اپنا وطن اور دوست و احباب برابر یاد آتے رہے جو ایک فطری چیز ہے۔

---

[۱] ج ۳، ص ۶۰

[۲] ۹۶۳ — ۱۰۱۴ ہجری، ۱۵۵۶ — ۱۶۰۵ عیسوی

یہاں انھیں شاہی امرا کے ساتھ رہنے کا بھی موقع ملتا رہا۔ مگر فطرتاً وہ درباری زندگی اور درباری شاعری کے عادی نہیں تھے اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے۔

گجرات میں صوفی کو میر سید جلال بخاری[1] کی دوستی اور استادی کا شرف حاصل ہوا نیز یہیں ان کی اور نظیری کی ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں میں اچھے خاصے تعلقات تھے جو بعد میں اتنے خراب ہوئے کہ نظیری[2] کی عادت کرنا بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ البتہ ان کے جنازہ میں ضرور شرکت کی۔

جہانگیر[3] کو ملا محمد صوفی سے ملنے کا اشتیاق ہوا تو اس نے ۱۰۳۴ ہجری، ۲۵-۱۶۲۴ عیسوی میں انھیں بلا بھیجا۔ صوفی اس سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر راستہ ہی میں سرہند میں انتقال کر گئے اور وہیں مدفون بھی ہوئے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صوفی نے اثنار راہ میں سرہند میں انتقال کیا۔ البتہ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ جس وقت جہانگیر نے انھیں بلوایا تھا اس وقت وہ کشمیر میں تھے اور وہیں سے چلے۔ مگر تذکرۃ الشعرا میں ہے کہ جہانگیر نے لاہور سے خط لکھ کر انھیں بلوایا اور وہ اس سے ملنے کے لئے احمد آباد سے روانہ ہوئے۔ اور یہی بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ احمد آباد سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے اور راستہ میں سرہند میں انتقال کر گئے۔ تذکرۃ الشعرا میں ان کے روانہ ہونے اور انتقال کا سال ۱۰۳۰ ہجری دیا ہوا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ صوفی نے ۱۰۳۵ ہجری (۲۶-۱۶۲۵ عیسوی) میں انتقال کیا جیسا کہ اس مادۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔

مجردانہ یکی شد بحق محمد صوفی

بانکی پور کی فہرست میں لکھا ہوا ہے کہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ[4] میں یہ ہے کہ وہ ۱۰۳۸ ہجری تک زندہ رہے۔ بیل کا خیال ہے کہ وہ ۱۰۳۸ ہجری، ۱۶۲۵ عیسوی کے بعد تک زندہ رہے اور کشمیر میں مقیم تھے۔ مگر یہ دونوں باتیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں۔ انتقال کے وقت صوفی کی عمر ستر برس سے کم نہ تھی۔

---

[1] سید جلال متخلص بہ رضائی (۱۰۰۳-۱۰۵۷ ہجری، ۹۵-۱۵۹۴—۴۷-۱۶۴۶ عیسوی) صدارت کے عہدہ اور ششہزاری دو ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوئے۔ [2] وفات: ۱۰۲۳ ہجری، ۱۶۱۳ عیسوی۔
[3] ۱۰۱۴—۱۰۳۷ ہجری، ۱۶۰۵—۱۶۲۷ عیسوی [4] ۹، ص ۱۶۵۔

دل از وصل جوانان شاد دارم　　　اگرچہ عمر بر ہفتاد دارم

تقی اوحدی صوفی سے کئی بار ملے تھے اور وہ ان کے متعلق ان الفاظ میں لکھتے ہیں: "شیراز میں برابر ان سے ملنے کا موقع ملتا رہتا تھا ..... آج کل وہ گجرات میں مقیم ہیں ..... احمد آباد میں بھی برابر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا ..... ۱۰۰۵ ہجری میں اجمیر میں بھی ان سے ملاقات ہوئی"۔[۱] مؤلف میخانہ بھی صوفی سے ملا تھا اور ان کے متعلق کہتا ہے: "مجھے شعرا سے ملنے کی بڑی خواہش رہتی ہے۔ خوش قسمتی سے ان جیسے سعادت مند انسان سے اجمیر میں ملاقات ہوئی۔ دیکھنے سے محسوس ہوا کہ ایک روشن ضمیر انسان فقیروں کے لباس میں ملبوس ہے۔ وہ ایسے درویش خصلت ہیں کہ انھوں نے دنیاوی شان و شوکت کو طلاق دے دیا ہے۔ نیز وہ ایسے باحوصلہ ہیں کہ دنیا سے بالکل مستغنی ہیں اور دولت مندوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے دل میں کہا: خدا کا شکر ہے کہ ایسی بزرگ شخصیت سے ملنے کا موقع مل سکا۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے گفتگو شروع کی اور پھر طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ پندرہ سال مکہ معظمہ میں رہے۔ اور اس عرصہ میں وہ ہر سال پیغمبرؐ کے قبر کی زیارت کے لئے مدینہ جایا کرتے تھے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا حصہ ہو جہاں وہ نہ گئے ہوں۔ انھوں نے فرمایا: "آج کل میں نے گجرات کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ کبھی کبھی وہاں سے دوسرے شہروں کی طرف بھی چلا جاتا ہوں۔ یہ سفر میں نے خاص کر قطب المحققین خواجہ معین الدین کی قبر کی زیارت کے لئے کیا ہے"۔.. جس زمانہ میں وہ اجمیر میں تھے... اس وقت جہانگیر بادشاہ ... بھی وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ مولانا محمد صوفی کسی امیر کے خود نہیں ملے۔ البتہ بعض امرا اپنی طرف سے انھیں اپنے گھر لے گئے، پھر بھی ان کی حالت یہ تھی کہ کسی امیر کے گھر جاتے وقت پشیمانی محسوس کرتے تھے۔ وہاں وہ زیادہ گفتگو بھی نہیں کرتے تھے .... جب دیکھا کہ بڑے بڑے لوگ ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو وہ اجمیر سے چلے گئے اور اس طرح ۱۰۲۴ ہجری میں وہ گجرات واپس ہو گئے"۔[۲]

---

[۱] فہرست ص ۵۴ ص ۳۴۵ - ۳۴۶ -

روز روشن میں لکھا ہوا ہے کہ "محمد آملی اگرچہ صوفی مشرب اور درویش وضع تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ درشت گو، کم اختلاط اور بدمزاج بھی تھے"[۵۱] غالباً اسی تند طبعی اور درشت گوئی کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض کی صوفی نے ہجو بھی کی ہے۔ صوفی پر آزاد خیال، دہریہ اور لامذہب ہونے کا بھی الزام لگایا گیا تھا کم از کم شروع میں صوفی شراب کے ضرور عادی رہے ہوں گے۔

شب شبینہ شراب باید خورد — می چوں آفتاب باید خورد
گوشۂ خلوتی بباید جست — با محمد شراب باید خورد

آپ اپنے زمانہ کے بڑے معزز شاعروں میں سے تھے۔ اقبال نامہ جہانگیری میں صرف دس شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ ہفت اقلیم میں لکھا ہوا ہے کہ "شعر در غایت جودت وہمواری دارد۔"

صوفی کے آثار میں سب سے زیادہ اہم "بتخانہ"[۵۲] ہے جس میں ایک سو چھبیس شاعروں کے دیوانوں سے انتخابات دئے گئے ہیں۔ مؤلف میخانہ لکھتا ہے: "مولانا نے فرمایا کہ جس کو میری شعر فہمی کا امتحان کرنا ہو، وہ میرے انتخاب کو دیکھے کہ میں نے کس طرح قدما کے اشعار سے ساٹھ ہزار شعروں کا انتخاب کیا اور اس کا نام بتخانہ رکھا ہے.... میں نے خود وہ بتخانہ دیکھا ہے"[۵۳] میں نے اس کتاب کا نام میخانہ و بتخانہ" رکھا ہے۔ بتخانہ ۱۰۱۰ ہجری، ۲-۱۶۰۱ عیسوی میں حسن بیگ خاں کی مدد سے جو ۱۰۰۷ ہجری، ۹۹-۱۵۹۸ عیسوی میں گجرات کے بخشی بنا کر بھیجے گئے تھے تالیف ہوا مگر اس کے بعد ۱۰۲۱ھ ۱۳-۱۶۱۲ء میں عبداللطیف بن عبداللہ عباسی گجراتی[۵۴] نے اس میں اضافے کئے "یعنی خلاصہ احوال شعرا"

---

[۵۱] ص ۶۱۵۔ [۵۲] نسخہ خطی شمارہ ۳۶۶، بوڈلین لائبریری۔ [۵۳] ص ۳۴۷۔

[۵۴] عبداللطیف گجراتی لشکر خانی پہلے لشکر خاں کے پاس رہے۔ اس کے بعد انھیں شاہجہاں کے دربار سے دیوانی تن کا عہدہ، عقیدت خاں کا خطاب اور ہزاری چار سو سوار کا منصب ملا۔ آخر میں حاسدوں کی وجہ سے شاہی ملازمت سے ہٹنا پڑا۔ آپ نے مثنوی مولوی روم پر بڑی اچھی شرح لکھی ہے۔

کے عنوان سے شعرا کے مختصر حالات لکھے اور ایک مقدمہ کا اضافہ کیا۔

بتخانہ کے بعد "ساقی نامہ" کی باری آتی ہے جو ۱۰۰۰ ہجری، ۹۲-۱۵۹۱ عیسوی میں تصنیف ہوا۔ اور جس کی تذکرہ نویسوں نے بڑی تعریف کی ہے۔ مؤلف عرفات عاشقین لکھتا ہے: "ان کا ساقی نامہ بڑا مشہور ہوا۔"[1] اور صاحب میخانہ کہتا ہے: "مولانا نے فرمایا... جس شخص کو میری شاعری کا درجہ معلوم کرنا ہو وہ میرے ساقی نامہ کو دیکھے کہ کیسا کہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کا کہنا بالکل صحیح ہے۔"[2] میخانہ میں پورا ساقی نامہ[3] دیا ہوا ہے جس سے کچھ اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

بدہ ساقی آن می کہ جوش آورد　　　زمان و زمین در خروش آورد

جہان آن چنانست در عہد ما　　　کہ تن بی سر و خاک تن بی کدخدا

نہ برجای خویش اندرین خیر و شر　　　کلہ زیر پا کفش بالای سر

نہ میخانہ معمور نہ می خانقاہ　　　نہ چیزی ز طاعت نہ خطا از گناہ

چنان خوار و زارم درین روزگار　　　کہ گوئی مرا نیست پروردگار

دیوان محمد صوفی کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔[4] اس میں سب سے پہلے قصیدے ہیں۔ اس کے بعد غزلوں کی باری آتی ہے۔ تیسرا نمبر ساقی نامہ کا ہے۔ سب سے آخر میں رباعیاں ہیں۔

مجموعۂ ملا صوفی کے نام سے ایک قلمی نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں موجود[5] ہے جو بہت خوبصورت اور زرافشاں ہے۔ یہ نسخہ غالباً کشکول ہے اور خود صوفی کا کشکول ہے۔ نیز اس میں نثر و نظم اور عربی فارسی دونوں کا انتخاب ہے۔ نظم میں اوحدی، سنائی، عراقی، مولوی معنوی، میر حسین سادات، سعدی، ابوالعلا، قاضی صفی الدین علی، ابوبکر الخارزمی، حضرت عائشہ، عزالدین محمود الکاسی، قطران، لامعی گرگانی، منوچہری، جنید، خواجہ افضل، قطران بن منصور، خیام، قاضی میر حسین میبدی، عطار، عطائی، شاہ قاسم انوار، شیخ فخرالدین عراقی، نظامی، شافعی، ابن قاضی، شیخ محمد مغربی،

---

[1] فہرست ص　[2] ص ۳۴۴　[3] ۲۱۸ بیت

[4] نمبر ۳۰۱　[5] نمبر ۵۶۰۔۱۴۳/۷

قطب محی وغیرہ کے اشعار کا انتخاب ہے۔ نیز نثر ونظم میں عین القضات، مرصاد العباد، کیمیائے سعادت اصطلاحات صوفیہ، نفحات، رسالہ اخوان الصفا، شرح گلشن راز، رسالہ شق القمر خواجہ صاین الدین علی ترکہ سپاہانی، شرح سعید الدین فرغانی، ترجمہ عقبات امام عراقی، نفحات ابوبکر واسطی، مثنوی، فتوحات، مقامات حریری، شرح میمنہ فارضیہ، تاویلات، قاموس، اخلاق جلالی، اخلاق ناصری، مجموعۂ شیخ امین الدین کازرونی، شرح تعرف، ملل ونحل، ذخیرۃ الملوک سید علی ہمدانی، تاج المآثر تفسیر سورۂ یوسف از خواجہ معین الدین چشتی، تفسیر یوسف از ملا معین خوسی، لوائح، نفحات خواجہ ابوالوفا خوارزمی جیسی کتابوں اور قطب محی، خواجہ افضل، قاضی میر حسین میبذی، حاتم اصم، غزالی، سید علی ہمدانی، حجۃ الاسلام، حرمی، خواجہ معین الدین، ابوالحسن الرودی، شیخ ابوالعباس، القصاب الآملی محمد المعروف بابن القنادی وغیرہ جیسے مصنفوں کے آثار سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

اس کشکول کے آخر میں خود صوفی کا کچھ کلام بھی ہے۔ اصل نظم شروع ہونے سے پہلے نثر میں ایک تمہید ہے۔ اس تمہید کے بعد سب سے پہلے قصیدوں[۱] کی باری آتی ہے جن میں سے کچھ پیغمبر محمدؐ کی مدح میں ہیں۔ ایک قصیدہ میں ابوالقاسم نام کے ایک شاعر کا ذکر ہے جنھوں نے صوفی کو اپنا قصیدہ بھیجا تھا اور جو غالباً صدر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ایک قصیدہ میں صوفی نے اپنی شاعرانہ عظمت پر فخر اور ہند میں پڑے رہنے پر افسوس ظاہر کیا ہے:-

در فصاحت چو امرء القیسم | در بلاغت چنانکہ سحبانم
گر نسائح رواست من بندہ | روح مسعود سعد سلمانم
اگرای باد بگذری بعراق | بازگو حال من بیارانم
در زمین سیاہ ہند کنول | ہمچو یوسف بچاہ کنعانم

ایک قصیدہ بہت ہی دلچسپ ہے جس میں پہلے تو ایک نصیرا نامی شخص کی ہجو کی گئی ہے:-

بظاہر صورتش ہندی لباس است | بمعنی سیرتش ایران شعار است

---

[۱] ہ، عدد ۳۶۰ شعر۔

پھر گجرات کے معشوقوں اور خاص کر ہندو حسینوں کی توصیف کر کے ایک شہیدی نام کے آدمی کا ذکر کیا ہے جو کسی کے عشق میں پڑ کر بدحال ہو گیا تھا:-

گجرات آرزو با خود مبر دل | کہ آنجا دلربا بیش از شمار است
شہیدی را شنیدی حال چون شد | کہ آں قصہ محل اعتبار است

آخر میں سورت کے با وفا لوگوں کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ کیوں انھوں نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا:-

مقر من از اں شد شہر سورت | کہ دانستم کہ ایں دار القرار است
جمال اینجا ندارد با وفا جنگ | صباحت با ملاحت میز یار است

آخر میں غزلوں[۵۱] کی باری آتی ہے جن کا آغاز بانکی پور والے دیوان کے شعر سے ہوتا ہے۔ حافظ[۵۲] کا ہر غزل گو مداح ہے اور صوفی بھی اس سے مستثنی نہیں ہیں:-

رفتن بطرف میکدہ با سازم آرزوست | دیوان حافظ و می شیراز م آرزوست

نیز ان کو اپنی شاعری پر ناز ہے:-

نقش است نظم بندہ محمد بخون دل | بر صفحۂ زمانہ بس این یادگار ما

صوفی بڑے ریختہ مگر کم گو شاعر تھے۔ ان کے اشعار زیادہ تر رواں اور سلیس ہیں۔ نیز بعض اشعار بہت بلند اور قابل ذکر ہیں:-

نمی دانم من این ارض و سما را | نہ خود را می شناسم نی خدا را
مطرب بگو کہ پردۂ این متقی شکست | ساقی بدہ کہ توبۂ این پارسا شکست
تا فلک خاک ابن زمینم کرد | بادہ و مشتری قرینم کرد
بیا تا ساکن میخانہ باشیم | حریف ساغر و پیمانہ باشیم

مؤلف میخانہ کے قول کے مطابق صوفی کے اس دیوان میں جو اس وقت لوگوں میں رائج تھا

---

[۵۱] ۱۷ شعر۔ [۵۲] وفات: ۷۹۱ ہجری، ۱۳۸۹ عیسوی۔

پندرہ سو شعر تھے لیکن اس کے علاوہ تین ہزار متفرق شعر بھی تھے۔ تقی اوحدی نے بھی ان کے اشعار کو پندرہ سو کے لگ بھگ بتایا ہے۔

فہرست مآخذ

ملا محمد صوفی مازندرانی : مجموعۂ ملا محمد صوفی، نسخۂ خطی شمارہ ۵۶۰/۴۳/۷، نیشنل میوزیم، نئی دہلی

محمد صالح کنبو : شاہجہاں نامہ، مجلس ترقی ادب، لاہور

مرزا محمد علی کاتب : تذکرۂ کاتب، نسخۂ خطی شمارہ ۲۴۲۰، رضا لائبریری، رام پور۔

احمد علی ہاشمی : مخزن الغرائب، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳، خدا بخش لائبریری، بانکی پور

غلام علی آزاد : ید بیضا، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۱، خدا بخش لائبریری، بانکی پور

سراج الدین علی خاں آرزو : مجمع النفائس، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۶، خدا بخش لائبریری بانکی پور

لطف علی بیگ آذر : آتشکدۂ آذر، مطبع فتح الکریم (۱۲۹۹ ہجری)

تقی اوحدی : عرفات عاشقین، نسخۂ خطی شمارہ ۵۳۲۴، کتاب خانہ ملک، تہران

ملا عبد النبی فخر الزمانی قزوینی : میخانہ، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۲۶ء

: تذکرۃ الشعرا، نسخۂ خطی ۲۳۹۱ (مصنف نامعلوم)، رضا لائبریری رامپور

مولوی مظفر حسین صبا : روز روشن، مطبع شاہجہانی بھوپال

معتمد خاں : اقبال نامۂ جہانگیری، کلکتہ، ۱۸۶۵ء

امین احمد رازی : ہفت اقلیم، نسخۂ خطی شمارہ ۸۹۸، نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی

رضا قلی خاں ہدایت : مجمع الفصحا، مطبع میر باقر، ۱۲۹۵ ہجری

Abdul Muqtadir : Catalogue of Arabic and Persian Manuscripts in the Oriental Public Library at Bankipur, Baptist Mission Press, Calcutta.

Thomas William Beale : The Oriental Biographical Dictionary. Calcutta, 1881.

غزل

جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی

انساں سے ہیں بلند شجر بولتے نہیں
دیتے ہیں سایہ اور ثمر بولتے نہیں

ہوجاتے ہیں جو اہلِ خبر بولتے نہیں
سب کچھ وہ جانتے ہیں مگر بولتے نہیں

آنکھوں سے کام لیتے ہیں اکثر زباں کا
دیکھا یہی کہ اہلِ نظر بولتے نہیں

آثار صبح نو تو ہو یدا ہیں ہر طرف
لیکن یہ کیوں طیورِ سحر بولتے نہیں

لاف و گزاف بے عملی کی دلیل ہے
ہوتے ہیں کام کے جو بشر بولتے نہیں

کرنیں نہ کہیئے ان کو ضیائیں ہیں نور کی
یہ کیا کہا کہ شمس و قمر بولتے نہیں

کھل جائیں مفلسوں کی زبانیں تو کیا عجب
جب مفلسوں سے صاحب زر بولتے نہیں

کوئی بھی منہ لگے تو نہیں کھولتے ہیں منہ
ہر بزم میں تو اہلِ ہنر بولتے نہیں

بے مایگیٔ امنؔ کا کھلتا نہ کچھ بھرم
محفل میں بیٹھے رہتے اگر بولتے نہیں

جگر کی شخصیت کے چند پہلو

جناب نواب سید شمس الحسن

داغ جگر کی اشاعت کے بعد میری موجودگی میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے میرے والد محترم شمس العلماء نواب سید علی حسن صاحب مرحوم سے جگر صاحب کے رنگ تغزل کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ انھیں اس جدید شاعر سے ملنے اور ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور بعد کو سید صاحب موصوف نے جب انھیں "داغ جگر" کا ایک نسخہ لا کر دیا تو یہ اشتیاق ملاقات اور بھی بڑھ گیا۔ حالانکہ والد مرحوم آج کل کے شعرا سے کچھ زیادہ حسن ظن نہیں رکھتے تھے اور ہمیشہ مجھے یہ تاکید فرماتے رہتے تھے کہ صحیح مذاقِ شاعری پیدا کرنا ہے تو قدیم اساتذہ کے دیوان دیکھا کرو۔ اتفاق سے اس زمانہ میں جگر صاحب کا لکھنؤ آنا ہو گیا اور میرے ایک کرم فرما وصل بلگرامی مرحوم نے مجھے سب سے پہلے نیاز فتح پوری صاحب کے یہاں ایک مختصر اور مخصوص ادبی صحبت میں جگر صاحب سے ملنے اور ان کے کلام سننے کا موقع فراہم کر دیا۔ جگر صاحب کے دلکش کلام کو ان کے مخصوص انداز میں سن کر کچھ ایسا گہرا اثر ہوا کہ میں نے وہیں وصل صاحب سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ جگر صاحب کو دوسرے ہی روز ضرور میرے غریب خانہ 'بھوپال ہاؤس' میں لائیں گے۔ میں مضطرب تھا کہ والد مرحوم سے ان سے جلد سے جلد تعارف کرا دوں اگرچہ جگر صاحب ایک رند مشرب اور میرے والد مرحوم بے حد ثقہ آدمی تھے، ایسی حالت میں مجھے شاید اس تعارف کی جسارت نہ ہوتی اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ انھیں جگر صاحب سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے اور علامہ سید سلیمان مرحوم ان کا غائبانہ تعارف بہت اچھے الفاظ میں کرا چکے ہیں۔ بہرحال حسب وعدہ وصل صاحب جگر صاحب کو لے کر دوسرے ہی دن میرے یہاں پہنچ گئے۔ گھر کے چھوٹے بڑے اس نئے شاعر کو سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ جگر صاحب ہلکے سُروں میں تھے۔

انھوں نے جب اپنا کلام پڑھنا شروع کیا تو ہر شخص پر خواہ بڑا ہو یا چھوٹا ایک "سکر" کی حالت طاری تھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ در و دیوار سے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ ہر ایک کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو "غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا"۔ واقعہ یہ ہے کہ جگر صاحب کا ایک ایک شعر "رہزن تمکین ہوش" تھا۔ بہر حال جگر صاحب نے اپنی پہلی آمد پر بھوپال ہاؤس میں کئی غزلیں سنائیں لیکن تسکین پھر بھی نہ ہوئی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ غزل سب سے پہلے سنائی۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے پیے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں
شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے مظہر تمام رنگینیوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
وہ روئے رنگیں وہ موجۂ نسیم کہ جیسے دامان گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم عرق عرق میں نہا رہے ہیں
یہ مست بلبل بہک رہی ہے قریب عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دست رنگیں بڑھا رہے ہیں
یہ موج دریا یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
بہار و رنگ و شباب ہی کیا ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شش جہت ہے زباں پہ شور تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

جب وہ یہ اشعار اپنے مست انداز میں سنا رہے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے تمام فضا اسی رنگ میں ڈھل گئی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کی روح ان کے نغموں میں تحلیل ہو گئی ہے۔ جگر صاحب کی اس پہلی ہی ملاقات نے والد مرحوم اور مجھے ان کا ایسا شیفتہ بنا دیا کہ جگر صاحب کچھ ہی دنوں کے بعد "بھوپال ہاؤس" ہی کے ہو کر رہ گئے۔ "زاہدان خشک" والد صاحب اور جگر صاحب کے ایسے قریبی روابط اور تعلقات کو دیکھ کر حیران تھے، ظاہر بین نگاہیں اس معنوی اشتراک کو نہ دیکھ سکیں جو ان دونوں کے اندر غیر مرئی طور پر موجود تھا۔ غرض کہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا ہم لوگوں کے تعلقات جگر صاحب سے وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ یہ موقع مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت اور وسعت پر روشنی ڈال دی جائے، تاکہ جگر صاحب کی زندگی کا ہر پہلو نمایاں ہوتا جائے۔ جگر صاحب کسی بڑی سی بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور انھوں نے کسی کی امارت اور وجاہت ظاہری کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہیں کیا، یہاں تک کہ حیدرآباد، ٹونک اور بھوپال ایسی ریاستوں میں بھی انھوں نے اپنی آزادی اور خودداری کی شان کو بدرجۂ کمال برقرار رکھا۔ وہ اگر جھکے تو اسی کے سامنے جس میں انھوں نے علم و تقویٰ، بے پناہ خلوص اور کردار کی بلندی پائی اور اس معیار کو قائم رکھنے میں انھوں نے امیر و غریب کی تفریق بھی روا نہ رکھی۔ میرے والد محترم کے متعلق ان کے تاثرات کا اندازہ ان کے خطوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ جگر صاحب مجھے اپنے خط مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۳۲ء میں لکھتے ہیں۔

"عزیز شمس۔ السلام علیکم۔ احساسات کا جواب احساسات ہی ہوا کرتے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اس سے زیادہ کچھ کہوں تمھیں معلوم ہے کہ جناب نواب صاحب کے ساتھ مجھے کس قدر نسبت قربی حاصل ہے یقین کرو تم سے زیادہ میں نواب صاحب کے احساسات پاکیزہ کا رازدار ہوں۔ ہاں تم نے بہت ہی مرغوب کن مسئلہ پیش کیا ہے، میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ گنہگار ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ خود کو گنہگار سمجھتا ہوں، میاں میں جبر کا قائل ہوں اور صرف جبر کا۔ لیکن اپنے گناہوں کو اپنے

ساتھ منسوب کرتا رہتا ہوں اور شاید یہ ہی جبر ہو

مجرم بنا ہوا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں میں وہ ہوں تو نے نظام خود جس کی آرزو کی

میرے ایک بہت ہی باذوق اور عزیز دوست بھوپال ہاؤس آئے ہوئے ہیں۔ کاش تم یہاں ہوتے میں اس حد تک تو ادعا نہیں کر سکتا جس حد تک تم نے کیا ہے تاہم یہ یقین سمجھو کہ ایک بہت لطیف کمی محسوس کرتا رہتا ہوں۔ ایک مطلع ہی سن لو۔ آہ۔

مٹا کر ہمیں آپ پچھتایئے گا۔ کمی کوئی محسوس فرمایئے گا

نواب صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ تم نے میرا کوئی مصرع سن لیا ہے۔ میں نے لکھ دیا انشاء اللہ جلد اس کی کاپی روانہ کردوں گا۔ جواب کا منتظر۔ بہت مخلص جگر"

ایک دوسرا خط جو خورشید صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم اسکول بجنور نے والد صاحب مرحوم کے نام لکھا تھا اس سے جگر صاحب کے ان تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے جو وہ ان کے متعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے خط مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۶ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت جگر کے بارے میں کیا عرض کروں۔ مجھے جہاں تک اندازہ ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ میرا اندازہ قطعی صحیح ہے وہ یہ کہ حضرت جگر کو ہندوستان بھر میں صرف دو ہستیوں سے لگاؤ ہے بالفت ہے عشق ہے۔ اس تعلق کو خواہ کسی لفظ سے تعبیر کیا جائے وہ صرف ان ہی دو بزرگوں سے ہے۔ باقی اوروں سے ان کی محض شناسائی ہے۔ ایک جناب والا سے اور دوسرے جناب اصغر سے۔ میں اس کیفیت قلبی کا اندازہ نہیں کر سکتا جو ان پر آپ کے تذکرے کے وقت گزرتی ہے۔ وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور بعض وقت ان زحمتوں، تکلیفوں۔ روحانی کلفتوں اور اذیتوں کا احساس کر کے جو ان سے آپ کو پہنچتی ہیں، تقریباً آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر خود ہی جھنجلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نواب صاحب قبلہ کو جو اذیتیں میں نے دی ہیں مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھا اس لئے کہ ان کو مجھ سے بہت زیادہ محبت ہے۔ آپ خود اندازہ کریں کہ ان الفاظ میں کون کون کیفیات قلبی مضمر ہیں۔"

ترک شراب کے سلسلے میں جگر صاحب اپنے سوانح حیات میں لکھتے ہیں:-

"شمس العلماء نواب علی حسن خاں صاحب مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ ان کی دو باتیں مجھے کبھی نہیں بھولتی ہیں۔ شعرائے لکھنؤ کے بارے میں آزادانہ رائے کا اظہار کرتا تھا اس لئے کہ شعرا میں گروہ بندی سے مجھے نفرت ہے۔ ایک دن بہت شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ جگر تمہیں جو کچھ کہنا ہو بھوپال ہاؤس میں کہا کرو۔ باہر کچھ نہ کہا کرو۔ یہاں قتل تک ہو جاتے ہیں۔ ایک اور بات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہے۔ میں بھوپال ہاؤس میں بہت بیمار تھا۔ ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور بہت گلوگیر لہجے میں فرمایا۔ جگر میرے بڑھاپے پر رحم کرو اور شراب ترک کر دو۔ مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اس زمانہ ہی میں میں نے ترک کر دی تھی۔"

یہ حقیقت ہے کہ میرے والد مرحوم کو جگر صاحب سے والہانہ محبت تھی اور جب تک جگر صاحب بھوپال ہاؤس سے باہر رہتے وہ بیتاب رہا کرتے تھے۔ جگر صاحب بھی ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ والد مرحوم نے مرض الموت میں ایک دن فرمایا کہ جب میں پلنگ پر لیٹا ہوں جگر صاحب اور ان کے اشعار بیساختہ یاد آنے لگتے ہیں۔ اسی حالت میں کچھ دیر وہ جگر صاحب کے یہ اشعار بہت لطف کے ساتھ پڑھتے رہے۔

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے — جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے
مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے — کبھی آ کے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے
مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا میں اگرچہ ہوں ترا نقش پا — ترے جلوے جلوے کی ہے بقا مرے شوق نام بنام سے
تری چشم مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں — یہ تمام ہوش یہ سب جنوں اسی ایک گردش جام سے
مجھے چاہیے وہی ساقیا جو برس چلے جو چھلک چلے — ترے حسن شیشہ بدست سے تری چشم بادہ بجام سے

میرے والد مرحوم کا انتقال نومبر ۳۶ء میں ہوا۔ چاند کے حساب سے یہ رمضان المبارک کا زمانہ تھا۔ اس وقت بدقسمتی سے جگر صاحب دورے پر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جب وہ بھوپال ہاؤس پہنچے اس وقت ان کا جو حال تھا وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ جگر صاحب باتیں کرتے کرتے اس صوفہ کی کرسی سے لپٹ گئے۔ جس پر عموماً والد مرحوم ہال میں بیٹھا کرتے تھے اور انہوں نے زار زار رونا شروع کیا۔ دیر تک ان کی حالت غیر

ان کا غم دیکھ کر ہم لوگ اپنا غم بھول گئے ۔ اسی طرح جبکہ ان کے انتقال کو دو تین برس گذر گئے تھے میں نے اپنے چند اشعار بغرض اصلاح جگر صاحب کو دکھلائے ۔ ایک شعر پر تیر کا نشان لگا کر میری بیاض پر انھوں نے یہ فقرہ عجیب حالت کرب میں لکھ دیا۔ "ہائے نواب صاحب یاد آ گئے" یہ صفحہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے میرے والد مرحوم نے اپنا غیر مطبوعہ کلام انھیں بغرض نقد و تبصرہ دیا تھا۔ بدقسمتی سے نہ آج تک شائع نہیں ہو سکا۔

اس موقع پر اگر برسبیل تذکرہ میں اپنے ذاتی تعلقات کو جو جگر صاحب کے ساتھ رہے مختصراً بیان کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہ ابتدا ہی میں بتا چکا ہوں کہ میری ملاقات جگر صاحب سے ۲۹ء میں کہاں اور کیسے ہوئی ۔ جتنا وقت گذرتا گیا تعلقات میں اضافہ ہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ جگر صاحب خاندان سے کوئی الگ فرد ہیں ۔ انھوں نے شعلۂ طور کی طبع اول میں جہاں اپنے چند قریبی احباب مثلاً محمود علی خاں صاحب جامعی جلیل قدوائی صاحب وغیرہ کے متعلق اپنے دلی احساسات کا اظہار کیا تھا وہاں میرے متعلق بھی چند مخلصانہ اور ہمت افزا جملے تحریر فرمائے تھے ۔ افسوس ہے کہ شعلۂ طور کا وہ پہلا اڈیشن میرے پاس موجود نہیں اور باوجود تلاش کہیں سے دستیاب نہ ہو سکا ۔ بہرحال جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے اس عبارت میں جو مجھ سے متعلق تھی اس میں انھوں نے میرے شاعرانہ ذوق اور شوق سخن کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مصرع لکھا تھا: "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" جگر صاحب کی یہ دعا قبول ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو مگر انھوں نے مجھے قابل اعتنا سمجھا باعث ممنونیت ہے ۔ جگر صاحب سے میرے تعلقات میں کبھی غیریت نہیں پیدا ہوئی اور شروع سے ایک سطح پر رہے ۔ ان تعلقات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مجھے ان کے ذریعہ ادبی حلقہ سے متعارف ہونے کا موقع ملا ۔ اور بعض اہم ادبی شخصیتوں سے قرب کا موقع ملا ۔ اور میرا گھر علمی مرکز کے ساتھ ساتھ ایک ادبی مرکز بن گیا۔

جگر صاحب نہ صرف خلوص کے پیکر تھے بلکہ بہت وضعدار بھی ۔ ان کے قدردانوں کی کمی نہ تھی ۔ بڑے بڑے صاحب حیثیت حضرات کی تمنا رہتی کہ جگر صاحب ان کے مہمان ہو جائیں لیکن انھوں نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ لکھنؤ آئیں تو بھوپال ہاؤس کے سوا کہیں قیام کریں۔ جب کبھی دہلی جاتے تو میرے بھتیجے

بہنوئی سید مرتضیٰ علی مرحوم کی یہاں قیام کرتے۔ میرے بھانجے شاہ تاج الدین نے بتایا کہ جب وہ حیدرآباد دکن میں تھا تو معلوم ہوا کہ جگرؔ صاحب آ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں ریاست کے سربرآوردہ حضرات کا ہجوم تھا۔ ان لوگوں نے کسی رئیس کی یہاں ان کے قیام کا انتظام کیا تھا جب جگرؔ صاحب ریل سے اترے تو ان کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ سب کو چھوڑ کر بڑی شفقت کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جگرؔ صاحب سے کہا کہ آپ میرے یہاں ٹھہرنا پسند کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ یقیناً میں تمھارے ہی یہاں ٹھہروں گا جب استقبال کرنے والے حضرات نے ان کو ان کی مقررہ قیام گاہ پر لیجانا چاہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں شاہ تاج الدین سلمہ کے یہاں ٹھہروں گا۔ بھوپال ہاؤس کے کسی فرد خاندان کے ہوتے ہوئے اور کہیں نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے تو بھوپال ہاؤس کا کتا بھی عزیز ہے۔ انھوں نے اپنی وضعداری کو اس حد تک نبھایا کہ تقسیم کے بعد باوجود اس کے کہ میں پاکستان ہجرت کر کے چلا آیا۔ اور بھوپال ہاؤس سوائے ایک حصہ مکان کے جس میں میرے برادر بزرگ نواب سید امیر حسن صاحب مرحوم بے سر وسامان اور پریشان حالی کی زندگی گذار رہے تھے۔ شرنارتھیوں کا مسکن بن گیا تھا۔ جگرؔ صاحب وہیں قیام کرتے رہے۔ اس وضعداری کی داستان میرے کرم فرما سید صدیق حسن صاحب آئی سی ایس کے الفاظ میں سن لیجیے۔ وہ اپنے مضمون بہ عنوان جگرؔ، تحریر فرماتے ہیں۔

" جگرؔ لکھنؤ آتے تو بھوپال ہاؤس میں ٹھہرا کرتے۔ ملک کے بٹوارے کے بعد بھوپال ہاؤس کے زیادہ تر افراد پاکستان چلے گئے اور اس کا بڑا حصہ سرکاری قبضہ میں آگیا۔ صرف ایک چھوٹی سی جگہ پسماندگان کے حصہ میں رہ گئی۔ کوئی تین سال کا ذکر ہے مجھے معلوم ہوا کہ جگرؔ لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ بیمار ہیں اور بھوپال ہاؤس میں ٹھہرے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بھی آپ کی دوستی کا شرف رکھتا ہوں، غریب خانہ پر ٹھہریے۔ کہنے لگے میں اس گھر میں نہ جانے کب سے ٹھہرتا چلا آیا ہوں۔ یہاں سے چلا جاؤں گا تو ان حضرات کی دل شکنی ہوگی اور میں کسی قیمت پر گوارہ نہیں کر سکتا۔ چونکہ ان کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ آرام وسکون سے رہیں۔ ان کو آمادہ کرنے کے لئے نہ جانے کتنی دلیلیں پیش کی گئیں، کس کس طرح سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانے بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ آئندہ جب آئیں گے

تو حبیب صاحب کے یہاں یا میرے یہاں ٹھہریں گے۔"

پاکستان کے قیام کے بعد وہ بسلسلہ مشاعرہ کراچی آئے مگر میرے یہاں قیام ممکن نہ ہو سکا جگر صاحب کو علم تھا کہ میں کتنے مختصر فلیٹ میں رہتا ہوں۔ انھیں میرے حالات کا شدید احساس تھا۔ میں اس کرب کو بیان نہیں کر سکتا جس کا اظہار وہ اشارات اور کنایات میں کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے جب میری بڑی لڑکی کا نکاح ۱۹۴۹ء میں ہوا تو وہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے تقریب میں شرکت کی بلکہ خاموشی سے ایک صاحب کو ساتھ لے کر بہانہ سے صدر بازار گئے۔ اور جو بہتر سے بہتر قیمتی سے قیمتی جائے کا سیٹ مل سکتا تھا لا کر بطور تحفہ لڑکی کے لیے دیا جو آج تک اس نے بطور یادگار کلیجہ سے لگا رکھا ہے۔ بہر حال جب پندرہ بیس برس کی وہ لطیف اور دلنواز صحبتیں جو مجھے دوران قیام لکھنؤ میں میسر آتی رہیں، یاد آتی ہیں تو خود جگر صاحب کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آ جاتا ہے۔

ذوق صورت ساز و شوق جلوہ ساماں داشتم　　یا د ایامے کہ منزل منزل جاں داشتم

مختصراً یہ کہ اصغر صاحب مرحوم و مغفور کے بعد جگر صاحب کا گہرا تعلق ہم لوگوں سے رہا۔ اصغر صاحب مرحوم اور والد مرحوم کی یہ انتہائی خواہش رہی کہ جگر صاحب رندی سے توبہ کر لیں۔ اس کوشش میں میری حقیر جد و جہد بھی شامل رہی۔ جگر صاحب جب حالت نشہ میں ہوتے تو وہ ان بزرگوں کے سامنے آنے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ میں جس دور کا ذکر کر رہا ہوں وہ جگر صاحب کے رندی کے شباب کا زمانہ تھا۔

جگر صاحب باہمہ رندی و سرمستی ایک مذہبی دل و دماغ کے انسان تھے اور انتہائی نشہ کی حالت میں بھی ان کی یہ خصوصیت جھلکتی رہتی تھی۔ انھوں نے اپنی رندی کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا بارہا وہ نشہ میں زار زار روتے یہاں تک کہ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا اور چلا اٹھتے تھے کہ میرا خدا کیوں میری شراب چھڑا نہیں دیتا۔" ان کی رندانہ زندگی سے یہ صاف نظر آتا تھا کہ ان کی رندی "اضطراری" تھی "اختیاری" نہ تھی۔ ان کی زندگی پر بیک وقت دو اثرات کارفرما تھے۔ ایک تو ان کی خاندانی شرافت نیز وہ نسبت روحانی جو انھیں شاہ عبد الغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست اور اصغر صاحب گونڈوی کی ذات بابرکات سے بدرجہ کمال حاصل تھی۔ دوسرے وہ نازک حالات

جو کارسازِ حقیقی نے ان کی فطرت کو ودیعت کیے تھے۔ ان احساسات کے فروغ میں ان کے خاندان کی تباہی اور معاشقانہ نامرادیوں کو بہت دخل رہا اور وہ ایک صبر آزما کش مکش کے دور سے گزرے واقعہ یہ ہے کہ انھیں اصغر صاحب نہ مل جاتے تو حالات جگر صاحب کو نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتے۔ اصغر صاحب کو جگر صاحب سے والہانہ محبّت تھی اور جگر صاحب کے دل میں اصغر صاحب کے لئے بے پناہ عقیدت۔ جگر صاحب کی "تعمیرِ شخصیت" میں اصغر صاحب گونڈوی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان اثرات کا احاطہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے اصغر صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اصغر صاحب ایک بہت بڑے شاعر تو تھے ہی اور شاعری میں بھی ایک منفرد رنگ کے مالک لیکن اس کے علاوہ وہ اپنے اندر بڑی روحانی عظمتیں رکھتے تھے۔ اصغر صاحب ایک صوفی باصفا تھے اگرچہ انھوں نے اپنی روحانیت کو کبھی نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عام نگاہوں سے خود کو چھپاتے رہے بقول جگر صاحب۔

بقدرِ ظرف مئے بندگی کا جوش رہا — کسی جبین سے نہ ٹپکی کسی جبیں میں رہی

اصغر صاحب کی مجھ پر بے حد شفقت تھی اور آج تک ان کی شخصیت کے گہرے اثرات میرے دل پر ہیں۔ بہرحال یہ موقع ان تفصیلات کا نہیں۔ مجھے جو بات لکھنا ہے وہ یہ کہ جگر صاحب کی زندگی پر اصغر صاحب کی غیر معمولی شخصیت مکمل طور پر اثر انداز تھی۔ چنانچہ جگر صاحب۔ کہتے ہیں۔

نگاہ حضرت اصغر کی ہے ودیعت خاص — قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

حریمِ حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر — جو بیٹھو باادب ہوکر تو اٹھو باخبر ہوکر

یہ اشعار غمازی کررہے ہیں کہ جگر صاحب کی نظر میں اصغر صاحب کا کیا مقام تھا ایک بار خود جگر صاحب نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ "ایک صاحب جو مجھے اور اصغر صاحب کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے انھیں کئی دفعہ مجھے دیکھ کر اصغر صاحب کا شبہ ہوا اور وہ فرق محسوس نہ کرسکے"۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جگر صاحب اور اصغر صاحب کی شکل و صورت میں بین فرق تھا۔ شاید یہی واقعہ اس شعر کا محرک ہوا جو جگر صاحب نے کہا ہے۔

جدھر سے میں گزرتا ہوں نگاہیں اٹھتی جاتی ہیں مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

یہ اشتیاق اصل میں اس کی معنوی نسبت کا نتیجہ تھا جو انھیں اصغر صاحب کے ساتھ بدرجہ اعلیٰ حاصل تھی۔ اس بنا پر بعض ناواقف حضرات سمجھتے ہیں کہ جگر صاحب شاعری میں بھی اصغر صاحب کے شاگرد تھے۔ حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ

"سب ہیں ایک بادہ بے کیف کے پینے والے"

اصغر صاحب کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ یاد آگیا جس سے اصغر صاحب اور جگر صاحب کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

اصغر صاحب لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور تھوڑے ہی فاصلہ پر میرے مکان سے ان کے عزیز دوست متین الدین صاحب مرحوم وکیل کا مکان تھا یہاں اصغر صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ جگر صاحب عالم ہوش میں تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اصغر صاحب آئے ہوئے ہیں۔ آیئے چل کر مل آئیں۔" چنانچہ میں اور جگر صاحب ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر کے قیام کے بعد اصغر صاحب خود ہی میرے والد مرحوم سے ملاقات کے خیال سے واپسی میں ہم لوگوں کے ساتھ بھوپال ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ اثنائے راہ میں جگر صاحب نے یکایک اصغر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں کہا کہ "اصغر صاحب کیا بات ہے۔ میں اتنی دعائیں کرتا ہوں۔ آخر خدا میری دعا کیوں نہیں سنتا اور میری شراب کیوں چھٹ نہیں جاتی"۔ اصغر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "یہ بات صحیح نہیں۔ تم دل کے ایک گوشہ سے دعا کرتے ہو۔ مکمل دعا کرو تو مکمل قبولیت بھی ہو۔ مکمل دعا یہ ہے کہ تم سر سے پاؤں تک دعا بن جاؤ۔ ناقص دعا کرتے ہو تو مکمل قبولیت کی توقع کیوں کرتے ہو"۔ خود بقول جگر صاحب۔

خام ہے جو طلب و شوق کا اعجاز جگر ہر نفس عشق میں جب تک نہ رگ جاں ہو جائے

جگر صاحب کے کردار کے متعلق اگر کچھ کہنا ہو تو یہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جگر صاحب نے انسانی قدروں کا ہمیشہ احترام کیا۔ خوش اخلاقی، دردمندی، انکسار اور وضعداری ان سے کبھی جدا نہیں ہوئیں۔ نشہ میں بھی انھوں نے بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ

لحاظ رکھا۔ تعلقات میں بھی ان کی شاعری کی طرح آمد ہی آمد تھی آورد نہ تھی۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور ان کی خوش اخلاقی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہر ایک سے اس طرح ملتے تھے کہ اسے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ اس کو کسی دوسرے سے کم سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ باہمہ رندی انھوں نے ایسی محفلوں میں جہاں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہو کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ وہ عورتوں کے معاملہ میں بہت محتاط تھے اور ایسی محفلوں سے بہت گھبراتے تھے جہاں خواتین کا اجتماع ہو۔ وہ اپنی افتادِ طبیعت کے لحاظ سے قدامت پسند تھے اور عورتوں مردوں کے اختلاط کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے تھے، اگرچہ بادلِ ناخواستہ ایسی محفلوں میں شرکت کر لیا کرتے تھے۔ عورتوں کی بے پردگی کا جب ذکر آجاتا تو وہ بہت دلچسپ بات کہا کرتے تھے کہ "ان ظالموں کو خبر نہیں۔ نگاہیں حسن کو چیر لیا کرتی ہیں۔" جگر صاحب کی زندگی کا جب زمانہ یاد آتا ہے تو سینکڑوں واقعات نظر کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔

جگر صاحب کے وہ احباب جنھیں نہ صرف ان کی شاعری سے محبت تھی بلکہ ان کی ذات سے بھی، ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ انھیں شغلِ شراب سے کیسے باز رکھا جائے۔ نئی نئی تدبیریں کرتے، مگر ناکام رہتے۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے کہ انھیں جب بھی طلب ہوتی تو غیب سے ایسا سامان ہوتا کہ جیسے قدرت ہی ان کو پلانے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر ہم انھیں باتوں میں یا کسی اور تفریحی مشغلہ میں لگا دیتے۔ تو خلافِ توقع کوئی نہ کوئی ایسے "مہربان" آن ٹپکتے جو پورے یقین دلانے کے بعد ان کو لے جاتے اور ان کا کلام سننے کے معاوضہ میں شراب پلا کر جائے مقام پر چھوڑ جاتے۔ اکثر یہ اہتمام کیا جاتا کہ ان کے پاس کوئی روپیہ پیسہ رہنے پائے مگر تہی دستی کے باوجود ان کی مطلوبہ چیز ان کو مل جاتی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ دن کا کافی وقت گذر چکا تھا اور کوئی "مہربان قسم کے صاحب" ان سے ملنے نہیں آئے تھے اور ان کی جیب بھی خالی تھی۔ ہم لوگ مطمئن تھے کہ آج کا دن تو خیریت سے کٹ جائے گا۔ پھر بھی آنکھیں چوکنا تھیں کہ وہ خود کہیں باہر نہ چلے جائیں۔ لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ جگر صاحب تھوڑے ہی وقفہ کے بعد مست چلے آرہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آتشیں سیال کہاں سے مل گئی۔ یہاں تک کہ باہر گئے نہیں جیب میں پیسہ تھا نہیں پتہ

لگایا تو معلوم ہوا کہ جگر صاحب مکان کی فصیل پھلانگ کر میخانے پہنچے، اور وہاں ان کے کسی مہربان نے پہلے سے شراب خانہ میں روپیہ جمع کرا دیئے تھے کہ جگر صاحب آئیں تو انھیں "ٹھرا" دے دیا جائے، وہ جب پی کر آتے تو عجب انداز ہوتا تھا۔ شیروانی کاندھے پر ایک طرف لٹکی ہوئی، ایک جیب شیروانی سے باہر اور دوسری جیب سے ایک بڑی بوتل بنیے دروں نیمے بروں سر لگائے جھانکتی نظر آتی۔ ٹوپی ترچھی لگائے اس میں سے پریشان بال اِدھر اُدھر بے ترتیبی کے ساتھ نکلے ہوئے۔ لب پر ندامت کے ساتھ فاتحانہ تبسم۔ آتے اور تھوڑے فاصلہ پر کھڑے ہو کر غور سے دیکھتے اور بے ساختہ کہہ اٹھتے "شمس صاحب میں پی آیا"۔ ایک دن اسی حالت نشہ میں قرآن پاک کی یہ آیت شریف "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ" زور زور سے پڑھنا شروع کی اور بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔ جب "حَرِيصٌ عَلَيْكُم" کا لفظ آتا تو چیخ چیخ اٹھتے۔ یہ تو خیر ان کی عام عادت تھی کہ جام اٹھانے سے پہلے بسم اللہ کہتے جگر صاحب کی رندی کیونکہ اضطراری تھی اس لئے انھوں نے اعتدال یا خاص اہتمام مے نوشی کو ہمیشہ اپنے مسلک رندی کے خلاف سمجھا۔ ان کا نظریہ رندی یہ تھا کہ "بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے"۔ اور بقول ریاض خیرآبادی مرحوم وہ اس کے قائل تھے "جیسی پائی شراب پی لی"۔ بعض وقت ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ثاقب لکھنوی مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا تھا۔

افراط مے کشی نے کیا مجھ کو جز و مے ساقی نے میری روح کو کھینچا شراب میں

جگر صاحب کی رندی کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ جب کثرت مے نوشی کی وجہ سے ان پر زوردار حملہ درد کا ہوتا تھا تو اس وقت بھی وہ ہراساں نہ ہوتے بلکہ ان میں ایک عجیب قسم کی خود اعتمادی جھلکتی نظر آتی تھی ایک دن متواتر کئی روز تک مسلسل پینے کی وجہ سے ان کے سینے میں شدید درد کا دورہ پڑا اور ایسی حالت ہو گئی کہ مجھے رات ان پر گزرنے مشکل معلوم ہوتی تھی۔ میں تمام شب ان کے پاس رہا اور دعا کرتا رہا۔ اس وقت ان کے احساسات کی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب بغرض عیادت تھوڑے وقفہ کے لئے آگئے تھے انھوں نے یہ دیکھ کر کہ جگر صاحب آنکھ بند کئے ہوئے ہیں۔ ایک رسالہ اٹھایا اور انھوں نے رسالہ کا ایک ورق الٹا تو اس کی خفیف صدا سے بھی دل پر چوٹ لگی اور بے ساختہ بول اٹھے کہ خدا کے واسطے اس کو رکھیے

اسی شب میں انھوں نے حالت کرب میں بڑی معنی خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا کہ "شمس صاحب میں بغیر توبہ کے مروں گا نہیں آپ اطمینان رکھیں"۔ انھوں نے جس اعتماد اور یقین کے ساتھ ایسے حالات میں یہ فقرہ ادا کیا وہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ اور یہ کتنا سچا فقرہ تھا جو انھوں نے کہا تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ جب وہ شراب منگاتے اور وہ بھی گھٹیا قسم کی تو ہم لوگ کسی نوکر سے کہہ دیتے کہ اس میں پانی ملا دو تاکہ کچھ تو اس کی تیزی کا اثر کم ہو جائے لیکن وہ منہ لگاتے ہی پہچان جاتے۔ سخت برہم ہوتے اور بے ساختہ کہتے کہ یہ شراب کے ساتھ شرک ہے۔" ایک اور واقعہ جو کراچی پولیس کے انسپکٹر عزیزی محمد علیم خاں نے بیان کیا قابل ذکر ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے اور ان کا آنا جانا بھوپالی ہاؤس میں تھا ان دنوں میں ایک بار وہاں گیا تو گھر کے اور لڑکوں کے ساتھ وہ بھی جگر صاحب کے پاس گئے۔ جگر صاحب مست و سرشار چارپائی پر گھر کے صحن میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں قاری احمد علی صاحب (ابن حاجی محمد مصطفیٰ خاں صاحب مرحوم) ان سے ملنے آگئے۔ جگر صاحب نے اسی عالم مستی میں ان سے قرآن شریف کی کوئی آیت سنانے کی فرمائش کی۔ قاری احمد علی صاحب نے یہ دیکھ کر کہ جگر صاحب دوسرے عالم میں ہیں خوش اسلوبی سے یہ فرمائش ٹالنا چاہی مگر جگر صاحب بری طرح مصر ہوئے تو انھوں نے سورہ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ بس آیات قرآنی کا سننا تھا کہ جگر صاحب تڑپ کر پلنگ سے اتر کر زمین پر سربسجدہ ہو گئے اور ہچکیوں سے رونے لگے۔ ختم تلاوت کے بعد بھی دیر تک سجدہ ہی میں پڑے رہے جب سر اٹھایا تو آنکھیں روتے روتے سرخ تھیں اس کے بعد انھوں نے قاری احمد علی صاحب سے کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں لکھ لو۔ انھوں نے کہا کہ فرمائیے۔ میں لکھ لوں گا۔ جگر صاحب نے کہا کہ نہیں ابھی قلم نکالو اور کاغذ پر لکھو۔ چنانچہ انھوں نے کاغذ اور قلم نکالا تو جگر صاحب نے کہا کہ لکھو۔

"جو شے حاصل ہو جائے وہ بت ہے اور جو نہ ملے وہ خدا ہے۔"

بہر حال جب وہ پیتے تو کئی کئی روز متواتر پیتے رہتے۔ بہ مشکل کسی وقت ان کے منہ میں غذا جاتی ایسے وقت میرا قدیم ملازم "اللہ رکھو" جس کی وہ اکثر چھپ کر وقت بے وقت اعانت کرتے رہتے تھے جگر صاحب کو بڑی خوشامد سے میز پر بٹھاتا تو وہ اس کو بھی زبردستی اپنے ساتھ میز پر بٹھاتے وہ ان کو

نوالے بنا بنا کر کھلاتا تو کبھی جگر صاحب خود اس کو کھلانے لگتے۔ اس دور میں جبکہ انھیں خود شراب کے لئے ہمہ وقت پیسہ کی ضرورت ہوتی اگر کوئی پریشان حال آجاتا خواہ ان کا جاننے والا ہو یا نہ ہو تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا بہت خاموشی سے دے دیتے اور خود ان کے پاس نہ ہوتا تو دلوا دیتے۔ ایسے وقت اضطراب اور دردمندی کی وہ ایسی تصویر بن جاتے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ ان سے کہا گیا کہ یہ شخص جو سوالی ہے۔ آپ کی مروت اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کی مدد کہاں تک درست ہے۔ مگر وہ یہی کہتے کہ جو کچھ بھی ہو میں اس کی دل شکنی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ایک تلخ اور تکلیف دہ حقیقت ہے کہ حالت رندی میں لوگوں نے ان کے ساتھ "دوستی" اور قدردانی کے پردہ میں بہت ظلم کئے، ناجائز فوائد اٹھائے اور طرح طرح سے انھیں نقصانات پہنچائے۔ واقعی اس دنیا میں سچے دوست کتنے نایاب ہیں۔ وہ تو یہ کہیئے کہ ان کا حافظہ بہت قوی تھا ورنہ بہت سا کلام ضائع ہو چکا ہوتا کیونکہ اکثر ان کی بیاضیں بھی یار لوگ اڑا دیا کرتے تھے۔ اگرچہ زیادہ حصہ کلام ان کا دست برد سے بچ گیا۔ پھر بھی بہت سا ابتدائی کلام ان کا ضائع ہو گیا۔ چنانچہ جگر صاحب اپنی خود نوشت میں تحریر کرتے ہیں کہ "میری زندگی کا ہر ہر شعبہ سخت پریشان اور کج مج واقعہ ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایۂ کلام ضائع ہو گیا۔ اور کس قدر اغیار نے فائدہ اٹھایا۔" اس کے علاوہ وہ لکھتے ہیں کہ "شعر و ادب کے متعلق نثر میں متعدد طویل و مختصر مضامین جو میرے ذاتی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھے افسوس کہ ضائع ہو گئے بہر حال جگر صاحب کی مروت اور نزاکت احساس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے۔ جو انھوں نے خود مجھے سنایا تھا کہ کسی شہر میں (نام یاد نہیں) ایک مشاعرہ تھا۔ میں اس وقت تک اتنا روشناس نہیں ہوا تھا جتنا اب ہوں۔ میں مشاعرہ میں موجود تھا۔ ایک صاحب نے جو مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھے انھوں نے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ میری ہی ایک غزل اپنی کہہ کر سنانا شروع کر دی۔ میں ان کا منہ دیکھنے لگا لیکن میں نے نہ اس وقت اور نہ ختم مشاعرہ کے بعد ان سے ایک لفظ اس کے بارے میں کہا کہ مبادا انھیں تکلیف ہو اور میری وجہ سے ندامت" جگر صاحب موجودہ معاشرہ کا یہ رنگ دیکھتے تو ان کے احساسات پر بہت چوٹ لگتی۔ وہ اپنے کو عالم مستی میں اور بھی ڈبو دیتے۔

حرم و دیر میں رند (ک) کا ٹھکانا ہی نہ تھا　　وہ تو یہ کہئے اماں مل گئی میخانے میں　(جگر)

جگر صاحب کے اخلاقی کردار کی بلندی میں نے چند ہی لوگوں میں دیکھی ہے۔ انھوں نے گناہ کو گناہ سمجھا اور اپنی خوبیوں پر کبھی ناز نہیں کیا۔ وہ ہر تصنع اور تکلف سے بالا تھے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود اپنی انفرادیت کی آڑ میں اپنے ہم عصر شعرا سے کبھی نفرت نہیں کی اور نہ ان کی تحقیر بلکہ ہمیشہ ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ ہر طرح ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کریں۔ طبیعت میں مزاح تھا اس لئے کبھی بے تکلف دوستوں میں کوئی بات ایسی کہہ دیں وہ الگ بات ہے ورنہ کبھی کسی شاعر کی ذرا سی تحقیر برداشت نہیں کر سکتے تھے ان کی یہ روش اپنے دوستوں کے ساتھ ہی نہ تھی بلکہ ان لوگوں کے ساتھ بھی تھی جو ان سے ادبی چشمک رکھتے تھے۔ اور ان کی مقبولیت دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتے رہتے تھے۔

جگر صاحب کے دور رندی میں ایسے وقفے بھی آتے رہتے (اگرچہ وہ دیرپا نہ ہوتے تھے) جب وہ ترک مے نوشی کرتے ان کے ایسے ہی وقت کی وہ مشہور عام غزل مسلسل ہے جو "شکست توبہ" کے نام سے موسوم ہے۔ غزل کی رنگینی کے ساتھ اس میں تسلسل سے ترک توبہ کی نفسیاتی کیفیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے جس سے جگر صاحب کی شخصیت اور تاثرات رندی کے ارتقائی منازل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

مقام توبہ پر مستقل طور پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کے اشعار میں ایسے آثار ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رندانہ زندگی کے ناخوشگوار اثرات کو شدت سے محسوس کرنے لگے ہیں اور وہ کسی تازہ تغیر کے منتظر ہیں۔

ساقی نے جو بخشا تھا لطف بامرار　　وہ جرعہ بھی زہراب ہے معلوم نہیں کیوں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر　　میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

یہ پوری غزل ان کے ذہنی انقلاب کی نشان دہی کر رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت ان کا شعور بتلانے سے قاصر ہی کیوں نہ رہا ہو کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ مگر جگر صاحب کا دور رندی اصغر صاحب کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا۔ اور اصغر صاحب کا یہ قول پورا ہو کر رہا کہ "جگر چاہے جہاں پھرتے رہو تھیں لوٹ کر

یہیں آنا پڑے گا" یہ جملہ ایسا صحیح اور جامع تھا کہ ایک طرف وہ "تجدید ملاقات" پر منتہی ہوا اور دوسری طرف ترک مے نوشی پر۔ جگر صاحب اپنی منزل اصلی کی طرف ایسے واپس ہوئے کہ پھر قدم نہ ہٹے۔

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں (جگر)
اٹھا چکا ہے بہت ناز بادہ و ساغر شکست نشہ سے اب لذت شراب اٹھا (")

جگر ہی جگر تھے۔ مگر ایک نئے لباس میں۔ شورش وہی تھی مگر اک موج تہ نشین کی صورت میں، بیخودی وہی تھی مگر خودی کے ہوش کے ساتھ۔ پہلے وہ زندگی کو خراج دے رہے تھے۔ اب زندگی ان کو خراج دے رہی تھی۔ پہلے سوسائٹی ان کا احتساب کر رہی تھی اب وہ سوسائٹی کا احتساب کر رہے تھے۔

ضمیر اور کردار کی ہم آہنگی، ظاہر و باطن کی یک رنگی، مافی الضمیر کا بے لاگ اظہار یہ ہمہ جہتی صداقت جگر کے کیرکٹر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کو منافقت کے پردے میں چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی، جو محسوس کیا وہ بانگ دہل کہا اور جو کہا وہ ان کے اندرونی احساس کا صحیح اور سچا اظہار تھا۔ (سید صدیق حسن مرحوم)

اپنے سے بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کا لحاظ کرنے میں جگر اپنی نظیر آپ تھے، کسی بزرگ کے سامنے گھنٹوں سر جھکائے مودب بیٹھے رہنا انھیں ہرگز گراں نہ گزرتا تھا اپنے سے کسی بہت ہی چھوٹے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو جانا اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا ان کا خاص شیوہ تھا، بچوں سے گھل مل کر باتیں کرنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ جذب و کیفیت کے انسان تھے اور معمولی سے معمولی واقعہ سے بھی بہت جلد متاثر ہو جاتے اور اس حالت میں ان کی آنکھوں میں نمی سی جھلکنے لگتی اور وہ اکثر سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیتے۔

(وجاہت علی سندیلوی)

پریم چند کے کچھ نسوانی کردار

محترمہ صالحہ عابد حسین

منشی پریم چند ہمارے ان اِنے گِنے ادیبوں میں ہیں جن کا اردو ادب ہمیشہ مرہونِ منت رہے گا اور جن کی دلکش و دلگداز تخلیقات ادب کا بیش بہا سرمایہ اور صاحبانِ ذوق کے لئے سرمہ نگاہ رہیں گی۔

پریم چند کے اصلیت سے بھرپور زندگی کے مرقعے، ان کا دلنشیں اندازِ بیان، نبضِ حیات پر ان کی گرفت، انسانی جذبات کے اتار چڑھاؤ کی تصویر کشی ان کے فن کی خصوصیات ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر ان کا بے پایاں خلوص جو ان کے ہر فن پارے میں جاری و ساری ہے کہ ادب میں دوسرے فنی کمالات کتنے ہی موجود ہوں اگر اس میں خلوص نہیں تو وہ ایسا حسین جسم ہے جو روح سے خالی ہو۔

پریم چند کی مقبولیت کا ایک بڑا راز ان کی سیرت نگاری کی قدرت میں چھپا ہوا ہے۔ ان کے کردار سادگی و پرکاری کے نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ فن کے اعلیٰ معیار پر پورے نہ اترتے ہوں (جیسا کہ بعض نقادانِ فن فرماتے ہیں) لیکن زندگی کی کسوٹی پر ضرور پورے اترتے ہیں۔ زندہ انسانوں کی طرح ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کمزوریاں بھی، ان میں گرنے کی صلاحیت بھی ہے اور ابھرنے اور سنورنے کی بھی۔ (پریم چند کا انسان کی بنیادی نیکی اور شرافت پر ایمان ہے اور اس لئے ان کے کردار اکثر گر کر بھی ابھرتے نظر آتے ہیں) یہ ایسے جیتے جاگتے انسان ہیں جن کے ساتھ ہم ہنس بھی سکتے ہیں اور رو بھی سکتے ہیں جن کی خوشی میں خوش اور دکھ میں دکھی ہوتے ہیں۔ ناول میں کردار نگاری سب سے مشکل کام ہے۔ قصے کے افراد کے اخلاق تہذیبی ماحول، عمر، علم، تجربہ، ذہنی معیار کے مطابق اس کی سیرت کی تشکیل کرنا، اس کے رہن سہن، بول چال سوچنے کا انداز، کام کرنے کے طریقے ایسے ہی دکھانا جو اصلی زندگی میں ایسی صورت میں (کم و بیش) نظر آتے ہیں۔ بڑا کٹھن مرحلہ ہے فن کار کا قلم ذرا سا اس پل صراط سے ڈگا اور اس کا بھرم کھلا۔ پریم چند کی کردار نگاری

ہمیں اسی معیار پر بڑی حد تک پوری اترتی نظر آتی ہے۔ بلکہ اکثر ان کے یہ جیتے جاگتے کردار، زندگی کے بے رنگ اور سپاٹ انسانوں سے زیادہ دلکش اور متاثر کرنے والے ہوتے ہیں کہ فن کار نے ان بے رنگ تصویروں میں اپنے جگر کے لہو سے اکثر بڑے سندر اور شوخ رنگ بھر کر ان میں عجیب حسن پیدا کر دیا ہے۔

پریم چند نے ادب کو بہت سے بھرپور و حسین کردار دیے ہیں جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔
لیکن یہ حقیقت ہے کہ پریم چند نے مردوں سے بھی زیادہ پراثر اور دل کش کردار عورتوں کے پیش کئے ہیں۔

ایک بار میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ادب میں جب تک عورت ادیب نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی اردو ادب میں عورت کی بڑی بھونڈی اور غیر فطری تصویر کشی ہوتی رہی۔ ہاں حالی اور پریم چند دو منفرد فن کار ہیں جنھوں نے عورت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے اور سچائی اور عقیدت کے ساتھ اسے ادب میں جگہ دینے کی کامیاب کوشش کی۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر شاعر و ادیب نے عورت کو بُرا ہی دکھایا ہے۔ نہیں اسے حسن کی مورتی، خوبیوں کی دیوی، جنت کی حور، پرستان کی پری بھی بنایا گیا ہے اور شیطان و بدترین خلائق بھی دکھایا گیا ہے (اگرچہ آخر الذکر کے روپ میں زیادہ پیش کیا گیا ہے) مگر اس کا اصلی روپ دیکھنے، اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے، اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے اور اس کی اصلی کمزوریوں یا خوبیوں کو پرکھنے کی یا تو کوشش نہیں کی گئی یا پھر سمجھ نہ پائے۔

نثری ادب میں صرف پریم چند کو یہ شرف حاصل ہے جس نے عورت کو خلوص سے سمجھنے کی کوشش کی اور محبت و احترام کے جذبات اس کی طرف سے اپنے دل میں محسوس کر کے سچائی سے اپنے فن پاروں میں اس کی سیرت و اخلاق کی نقشہ کشی کی ہے۔

پریم چند کے دل میں عورت کا سچا احترام ہے۔ وہ اُسے سماج میں اس کے شایانِ شان مقام دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت مرد کی نفس پرستی کا آلہ اور کام جوئیوں کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ خود انسانیت کا ایک حسین مظہر ہے۔ بے شک وہ عورت کو گھر کی جان سمجھتے ہیں۔ ماں کا درجہ دنیا کا سب سے بلند درجہ جانتے ہیں اور گھر کی جنت تعمیر کرنا عورت کے اولین فرائض میں گردانتے

ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اسے انسانیت کا خادم، سماج کا ایک مفید فرد بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا کہ پریم چند کی آدرش وہ ستی ساوتری عورت ہے جس کی دنیا صرف گھراور بچوں تک محدود ہو لیکن میرے خیال میں یہ بات درست نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پریم چند دیا، تیاگ، پریم عفت وعصمت کو عورت کی جان سمجھتے ہیں مگر وہ اس میں خودداری، خوداعتمادی، استقلال بھی دیکھنا چاہتے ہیں جو مردوں کے دوش بدوش کارزارِ حیات میں اپنا حصہ ادا کرسکتی ہے اور دیس وقوم کی خاطر قربانیاں کرنے کا حوصلہ رکھتی اور آزادی و سچائی کی جدوجہد میں اپنا پورا حصہ ادا کرتی ہے ـــ مگر اس عورت کا جلوہ آپ میرے لفظوں میں کیوں ...... خود پریم چند کے کرداروں میں دیکھئے نا۔

پریم چند نے متعدد ناول لکھے ہیں۔ کچھ ابتدائی مشق کے زمانے کے ہیں۔ کچھ جذباتی اور رومانی دورِ حیات کی تخلیق ہیں، کچھ ایسے ہیں جن میں فن کا سکا فن پختہ ہو کر پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ ہر بڑے فن کار کی طرح پریم چند کا فن بھی تبدریج ترقی کر کے نقطۂ عروج پر پہنچا ہے۔ ان کے ناولوں کے کرداروں میں ظاہر ہے کہ یہ فرق نظر آتا ہے۔ ہر کردار اس جیتے جاگتے انسان کو نہیں پہنچ سکتا جو ان کے بعد کے ناولوں میں جلوہ گر ہوا ہے لیکن ان کے ناولوں کے جتنے کرداروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے کچھ نہ کچھ اثر ہمارے ذہن پر ہر ایک ہی چھوڑ جاتا ہے۔ ہاں ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کو بھلانا چاہیں بھی تو نہیں بھلا سکتے۔

پریم چند کے نسوانی کرداروں میں ہمیں ہر طبقے اور سماج کی عورت ملتی ہے۔ ان میں رانیاں بھی ہیں اور ٹھکرانیاں و راجپوتنیاں بھی اور کہارنیاں، مہترانیاں، مائیں، کاچھنیں، مزدورنیں بھی شہر کی تتلیاں بھی اور گاؤں کی ناریاں بھی محنت کش کسان عورتیں بھی اور فیشن و نمود پر جان دینے والی مغرب پرست لیڈیاں بھی علم و عقل کی پتلیاں بھی اور ایثار و قربانی کی دیویاں بھی۔ اپنی آبرو پر جان نچھاور کر دینے والی سیتا ساوتریاں بھی اور اپنی لاج بیچنے والی کوٹھے والیاں بھی لیکن ان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مٹی کا مادھو، کاٹھ کی تیلی یا چینی کی گڑیا نہیں۔ ہر چہرے پر آپ زندگی کی کش مکش کی پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں، ہر سینے میں عورت کے دل کی دھڑکن سن سکتے ہیں۔

ہر آنکھ میں عورت کی روح جھانکتی پا سکتے ہیں۔

پریم چند نے بہت سے ناول لکھے ہیں۔ بیوہ، غبن، گوشۂ عافیت، پردۂ مجاز، بازارِ حسن میدانِ عمل، گئودان وغیرہ۔ یہ سب کے سب کسی نہ کسی لحاظ سے مقصدی ناول کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں سماجی خرابیوں کا پردہ چاک کیا گیا، معاشی اور اقتصادی ناانصافیوں کا پول کھولا گیا ہے، سیاسی چھل فریب دکھائے گئے ہیں اور آزادی کی جدوجہد کی کہانیاں سنائی گئی ہیں، مزدور اور مل مالک، کسان اور زمیندار، حاکم اور محکوم کی کش مکش پیش کی گئی ہے۔ غرض زندگی میں جو کچھ بھی پریم چند نے دیکھا اور محسوس کیا سب کو اپنے فن میں قید کر لیا ہے۔

ان میں صرف چار ناولوں کی کچھ نسوانی کرداروں سے میں اس وقت آپ کا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔

چوگانِ ہستی کی ہیروئن صوفیا کا کردار اگرچہ ایک خاص انداز کا ہے اور اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتا ہے مگر اس کی سب سے جاندار اور متاثر کرنے والی ہستی ہیرو کی ماں رانی جھانوی کی ہے جو پرانی راجپوتنیوں کا سا عزم و حوصلہ رکھتی ہے۔ اس کے دل میں قوم کا درد، دیس کی محبت اور آزادی کی تمنا خون بن کر دوڑتی ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے ونے کو وہ سچا دیش پریمی، جنگ آزادی کا سپاہی جفاکش اور قوم پرور انسان بنانے کے لئے، خود عیش و آرام کو تج کر سخت محنت و ریاضت کی زندگی بسر کرتی ہے اور بیٹے کے دل میں وہی لگن پیدا کر دیتی ہے جو خود اس میں ہے۔ اس کے سینے میں بھی ماں کا دل ہے اور بیٹے سے گہری محبت ہے مگر مقصد کی محبت اس سے بھی بڑھ کر ہے کمزوریوں سے بھی وہ مبرا نہیں، دوسری عورتوں کے مقابلے میں وہ تنگ دلی اور رشک کا شکار ہو جاتی ہے مگر یہ وقتی کمزوری ہے جن پر قابو بھی پا سکتی ہے۔ وہ صوفیا کو اپنی بہو بنانے پر کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو آمادہ کر لیتی ہے مگر جب ونے کو اس کی الفت میں وطن کی سیوا سے منہ موڑتے دیکھتی ہے تو بیٹے کی جان کی دشمن بن جاتی ہے لیکن آخر میں جب ونے غیرت کے جوش میں جان دے دیتا ہے تو جھانوی انتہائی صدمے کے باوجود بیٹے کی خودداری اور غیرت کے جذبہ پر فخر و ناز محسوس

کرتی، بڑے حوصلہ سے غم کو جھیلتی اور مردہ بیٹے کا سر اپنے زانو پر رکھ کر قوم کے نوجوانوں سے یہ کہتی نظر آتی ہے: "جاؤ اندر دنے کی طرح قربان ہونا سیکھو"۔ اصل میں رانی جھانوی آزادی کے ان لاکھوں پرانوں کی ماؤں کی نمائندہ کہی جا سکتی ہے جنھوں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑے بڑے حوصلے کے ساتھ دیس کی آزادی پر قربان کر دئے۔

بازارِ حسن میں پریم چند نے ایک ایسی لڑکی کی دردناک کہانی سنائی ہے جو سماج اور رواج کی بھینٹ چڑھ کر اپنی آبرو کا سودا کرنے لگتی ہے۔ سُمن نازو نعم میں پلی حسینہ تھی جس کا ایماندار باپ بیٹی کی شادی اچھی طرح کرنے کی تمنا میں زندگی میں پہلی بار رشوت لیتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ ندپرت لڑکے والے سُمن سے نسبت چھڑا لیتے ہیں اور سُمن کا ماحول اسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیتا ہے جو کسی طرح اس کے قابل نہ تھا۔ سُمن اس ادھیڑ، مفلس، جاہل اور اکھڑ مزاج پتی سے نباہ کی بہت کوشش کرتی ہے۔ شوق اور ارمان کی عمر اور دنیا بھر کی ترغیبوں کے باوجود وہ زندگی کی کٹھنائیوں اور بےکیفیتوں کو جھیلتی ہے۔ شوہر بھی ابتدا میں اس کا بہت چونچلا کرتا ہے مگر کم آمدنی اور بیوی کا بے پناہ حُسن اُسے شکی بنا دیتا ہے اور پھر سُمن کی بےزاری اور سرکشی آپے سے باہر کر دیتی ہے سُمن شوہر کے غیر ہمدردانہ رویہ سے دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔ اور دوسروں کی پرآسائش زندگی، اس کا دامن کھینچتی ہے۔ اور اس زمانے میں اس کی ملاقات پڑوس میں رہنے والی طوائف بھولی بائی سے ہو جاتی ہے جو ہر طرح اس سے ہمدردی اور دلداری کرتی ہے۔ سُمن دیکھتی ہے کہ وہ مسرور اور خوش حال زندگی گزارتی ہے۔ اور شہر بھر کے رئیس اور معزز لوگ اس کے گھر آتے اور اس کی (بظاہر) عزت کرتے ہیں۔ ایک دن اپنی سہیلی کے ہاں سے دیر میں آنے پر اس کا پتی اس کی بےعزتی کرتا اور گھر سے نکال دیتا ہے تو خود دار سُمن کے دل پر سخت چرکا لگتا ہے اور کہیں پناہ نہ پاکر بھولی بائی کے دام میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر وہ کوٹھے پر بیٹھنے کی ذلیل حرکت تو کر بیٹھتی ہے لیکن پھر بھی یہ خود پرست، عیش پسند، مغرور حسینہ جس کے پاؤں پر سارا شہر ناک رگڑنے لگتا ہے اپنی لاج بچانی اور نہ چ گا کر پیسہ کمانی ہے، ذلت و بدنامی کی کٹھالی میں تپ کر اس کی سیرت کا میل کچیل

چھٹ جاتا ہے۔ اس کے اندر سوئی عورت جاگ جاتی ہے اور موقع ملتے ہی وہ اس زندگی پر لعنت کر کے سیوا کی زندگی اختیار کر لیتی ہے۔ فن کار کا کمال یہ ہے کہ اس عورت سے قاری کو ذرا دیر کے لئے نفرت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہتی ہیں ہاں نفرت اور غصہ پیدا ہوتا ہے اس سماج اور ان رواجوں سے جو معصوم لڑکیوں کو اس نرک میں گرنے پر مجبور کرتا ہے۔

میدانِ عمل میں پریم چند نے آزادی کی جدوجہد اور دیس کے جاں باز سپاہیوں کی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان میں سماج سے، رواج سے، حکومت کے پٹھوؤں سے، سرمایہ داروں سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں بڑے پر اثر انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی گھریلو زندگی کی جیسی حقیقی اور دل کش جھلکیاں ہمیں اس ناول میں نظر آتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ عورتوں کے کردار بھی زیادہ واضح، مضبوط اور جاندار ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی ایک منفرد شان رکھتا ہے اس میں ایک نہیں چار چار ایسے نسوانی کردار موجود ہیں جن کے بارے میں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ان میں سے سب سے دل کش شخصیت کونسی ہے۔

امر کانت کی بیوی سکھدا کا حوصلہ، جواں مردی اور نڈرتا دلوں کو مرعوب کر لیتی ہے ابتدا میں وہ ایک آرام طلب، عیش پسند، خود پرست اور سخت دل نازنین کے روپ میں نظر آتی ہے جو اپنے دیس کی مفلسی، غلامی، جہالت اور پست حالی سے بے خبر اور بے نیاز اپنے شیشے کے محل میں بیٹھی ہے۔ شوہر کو کاروبار اور گھرداری کے چکر میں پھنسا کر دیس کی خدمت کے "فضول" کام سے روکنا چاہتی ہے اور ابتدا میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ مگر امر کانت کا دل اور دیس کی محبت کا گہرا جذبہ یہ بندھن توڑنے پر اُسے مجبور کر دیتا ہے اور وہ اُسے چھوڑ کر چل دیتا ہے اور پھر یہی سکھدا زندگی کی ٹھوس اور تلخ حقیقتوں سے دوچار ہو کر امر سے بھی زیادہ معیار پرست بن جاتی ہے۔ اس میں ظلم و ناانصافی سے ٹکرانے کا عزم بیدار ہو جاتا ہے اور غریبوں اور مصیبت ماروں کی سیوا میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتی۔ وہ اپنے زر پرست سخت دل خسر سے ٹکر لیتی ہے مگر اس کی خدمت اور عزت کرنا بھی اپنا فرض جانتی ہے اور بڈھے سمر کانت جو

بیٹے کو گھر سے نکال سکتے ہیں بہو کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سکھدا نئے زمانے کی وہ خوددار اور آزاد خیال عورت ہے جو اپنی ذلت کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی رقیب سکینہ سے فراخدلی سے مل سکتی ہے مگر اپنے بے وفا شوہر کو معاف نہیں کر سکتی جس نے اس کی خودداری کو ٹھوکر ماری اور بے وفائی کی ہے۔ سکھدا کے روپ میں ہمیں نئے ہندوستان کی عورت کا جلوہ نظر آتا ہے جس کا اوپری خول بدل گیا ہے مگر روح ہندوستانی ہی ہے جس کا آدرش سیوا اور قربانی تھا اور ہے۔

اور پھر اس ناول میں امر کی چھوٹی سی کمزور سی بہن نینا ہے۔ بھائی بھاوج پر جان دینے والی باپ کے حکم پر خود کو بھینٹ چڑھا دینے والی، ایثار و تیاگ، صبر و رضا کی دیوی نینا جو پتی کے ظلم و ہوس کا شکار بن کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتی ہے۔ پڑھنے والے کو اس کا دردناک روپ اس سماج اور طبقے سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جہاں نینا جیسی معصوم ہرنیاں منی رام جیسے بھیڑیوں کا شکار بنتی ہیں۔

منی کا کردار بھی نینا کی طرح ضمنی ہے مگر آدھے کے قریب ناول پر چھایا رہتا ہے۔ یہ دیہاتی گنوار عورت دو گوروں کی ہوس کا شکار بننے کے بعد صدمے سے پاگل ہو جاتی ہے اور اسی حالت میں انتقام کے طور پر دو اور گوروں کا خون کر ڈالتی ہے اور ٹریجیڈی یہ ہے کہ اس کے ہوش و حواس واپس آ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اس کارنامے کی بدولت شہر بھر کی ہیروئن بن جاتی ہے، عدالت سے باعزت بری ہونے اور عوام سے خراج عقیدت پانے کے باوجود شرم و درد کا احساس اس کے دل سے نہیں مٹ پاتا۔ وہ اپنے ننھے بچے تک کو پیار نہیں کرتی کہ اس کا باعفت دل اپنے ملوث ہاتھوں سے اس معصوم کو چھونے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اپنے شوہر کو جو دل و جان سے اُسے پھر اپنانے پر تیار ہے ترک کر دیتی ہے مگر جب اس غم میں شوہر اور بچہ دونوں دنیا چھوڑ جاتے ہیں تو وہ غم سے پاگل ہو کر دریا میں کود جاتی ہے اور پھر ایک چمار نوجوان کے ہاتھوں بچ کر، اچھوتوں میں رہ کر اچھوتوں کی سی زندگی اپنا کر زندگی کی ڈور پھر سے پکڑ لیتی ہے، وہ دوسروں کی سیوا میں اپنے دل کا درد ڈبو دیتی ہے۔ اور اس طرح زندگی میں لطف اور معنی پیدا کرتی ہے۔ وہ امر کی طرف مائل ضرور ہوتی ہے مگر اس میں نفسانی خواہشات نہیں ہوتا ہے

اور چاہے جانے کی فطری خواہش ہے۔ معیاری کرداروں کے مقابلے میں منی ہیں زیادہ ٹھوس اور اصلی معلوم ہوتی ہے۔ وہ غم جاناں کو غم دوراں میں ڈبونے اور زندگی کی کٹھنائیوں کو ہنس کھیل کر جھیلنے کے عقیدے پر ایمان رکھتی ہے جو عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ آخر میں وہ بھی جدوجہد آزادی میں حصّہ لیتی ہے اور اس طرح پریم چند اس کا مقام اور اونچا کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ بے جوڑ سی بات لگتی ہے لیکن اگر ہم اس زمانے کے حالات پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ آزادی اور حقوق کی لڑائی میں ہر طبقے، ہر حیثیت، ہر درجے کے لوگوں نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا تھا، یہ وقت کا تقاضا تھا اور کوئی بھی حساس ذہن اس سے بچ نہیں سکتا تھا تو ہمیں یہ بات بالکل قرینِ قیاس لگتی ہے کہ منّی اور سکینہ، اس کی بوڑھی دادی، اور سکھدا کی ماں سب ہی اس لڑائی میں شامل ہو سکتی ہیں۔

میدانِ عمل کا ایک اور اہم نسوانی کردار امر کی محبوبہ سکینہ کا ہے جس کی شخصیت کی شیرینی، نرمی محبت کی گہرائی، سادگی، معصومیت اخلوص کی وجہ سے اس میں ایک عجیب کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ غریب و یتیم لڑکی جو اپنی دادی کا اور اپنا پیٹ سلائی کے سہارے بھرتی ہے ایک بے کیف بنجر کٹھن زندگی بتا رہی ہے کہ یکایک امر اس کی زندگی میں محبت کی جوت بن کر آجاتا ہے۔ اور وہ دل و جان سے اس کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ امر کی محبت کو وہ جس سادگی اور اعتماد سے قبول کر لیتی ہے اس کی سادہ دلی اور معصوم فطرت کی غمّازی کرتا ہے۔ ایک موقع پر وہ سکھدا سے بڑی صفائی سے اعتراف کرتی نظر آتی ہے۔

"مجھے مردوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے کافی موقعے ملے ہیں —— سب ہی نے مجھے تفریح کی جنس سمجھا اور میری غربت سے اپنی ہوس پوری کرنی چاہی۔ ...... اگر کسی نے مجھے عزت اور اعتماد کی نظر سے دیکھا تو وہ بابو جی تھے ...... یہ ان کا خلوص تھا جس نے میرے دل پر اپنا گہرا نقش جمالیا۔ ...... انھوں نے مجھے نکاح کی دعوت دی میں نے اسے منظور کر لیا .... اب جب تک وہ خود اس دعوت کو رَد نہ کریں میں ان کی پابند ہوں ......"

اس عزت اور اعتماد نے اس کے دل میں امر کی پرستش کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا جب تک خود امر نے اپنے طرزِ عمل سے نکاح کی دعوت کو رد نہیں کیا سکینہ امر کا خیال سینے سے

لگائے زندگی کی کش مکش کو جھیلتی رہی لیکن جیسے ہی اس کو یہ اندازہ ہوا کہ اب وہ نہیں سکھدا امر کی محبوب بن چکی ہے اور دونوں میاں بیوی ایک خیال، ایک رائے ایک دل ہو گئے ہیں وہ نہایت خاموشی اور شرافت سے اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے اور اپنے ایک دوسرے چاہنے والے کے نکاح کا پیام قبول کر لیتی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس سے سکینہ کی محبت اور کردار پر حرف آتا ہے۔ لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتی اس سے وہ اور زیادہ فطری بن جاتا ہے۔ ہمیں علم ہندوستانی گھروں میں محبت کی یہ بلند قسم (جس میں ازدواجی زندگی کسی اور کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود محبوب کی پرستش دل کی گہرائیوں میں کی جاتی رہے) اکثر نظر آتی ہے۔

لیکن پریم چند کی کردار نگاری پورے عروج پر ان کے آخری اور بہترین ناول گئودان میں نظر آتی ہے۔ اس کے نسوانی کردار بھی اتنے بھرپور اور زندگی سے قریب ہیں جن پر اصلیت کا دھوکا ہی نہیں یقین سا ہونے لگتا ہے خاص کر دھنیا کا کردار۔ یہ ناول دیہاتی اور شہری زندگی کے گوناگوں مرقعوں کا مجموعہ ہے۔ عورتیں بھی دونوں قسم کی ہیں جن میں مالتی، گوبندی اور دھنیا خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

مالتی مغربی تہذیب کی ساختہ پرداختہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ سوسائٹی کی تتلی، عیش و عشرت کی دلدادہ فیشن و نمائش کی پرستار لیڈی ڈاکٹر ہے جس پر شہر کی اونچی سوسائٹی کے مرد فدا نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر پھول پر بیٹھنے والی یہ تتلی جب سچی محبت کی آنچ میں تپتی ہے تو اس کے چھپے جوہر ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ایثار و خدمت کے سوتے اس کے دل میں پھوٹنے لگتے ہیں۔ ایک بار وہ اپنے مالی کے چیچک میں مبتلا بچے کی اس پیار، اس لگن، اس جانکاہی سے خدمت کرتی ہے جو خود اس کی ماں کے بس کی بات بھی نہ تھی وہ صرف بچے ہی کو موت کے منہ سے نہیں کھینچ لیتی بلکہ اپنے محبوب کا (جو اس سے بدگمان رہتا ہے) دل بھی جیت لیتی ہے۔ مگر اس کی شادی کی درخواست اس خوف سے قبول نہیں کرتی کہ مہتا کی آدرش عورت سیوا اور تیاگ کی مورتی ہے اور مالتی کو اندیشہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو شوہر کی شخصیت میں ضم نہیں کر سکے گی۔ ناول میں مالتی کی شخصیت دھیرے دھیرے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ابتدا میں اس کا روپ سوسائٹی گرلز کا سا ہے جس سے نفرت سی پیدا ہوتی ہے لیکن

یہی مالتی مہتا کی محبت اور اس کی غیر محسوس اصلاحی کوششوں سے اثر قبول کرتی ہے اور جب اپنے دیس کے غریب اور مفلوک الحال لوگوں کو دیکھتی ہے تو روپیہ کمانے کی ہوس چھوڑ کر اپنے مقدس پیشے سے غریبوں کی سیوا کا کام لینے لگتی ہے۔ مہتا کے دل میں گوبندی کی عقیدت دیکھ کر وہ اس سے جلتی ہے کسی اور لڑکی کی طرف ذرا سا اسے مائل دیکھتی ہے تو رشک سے تپنے لگتی ہے (اور پریم چند نے عورت کی اس کمزوری کو خوب سمجھا اور ہر جگہ دکھایا ہے) مگر اس کے آدرشوں سے گھبراتی اور عورت کو ماندی بنا دیکھنے کو برا سمجھتی ہے۔ پھر بھی غیر شعوری طور پر وہ مہتا کے رنگ میں رنگی چلی جاتی ہے۔ ایسا ٹائپ اصل زندگی میں بہت کم یاب ہے مگر ایسا نایاب بھی نہیں۔ ایسی فیشن زدہ مغرب پرست عورتیں جو اوپری چمک دمک سے چوندھیا جائیں سنبھلنے اور اپنے کو پہچاننے کے بعد اپنے اصلی جوہروں کو ابھارتی حقیقی زندگی میں بھی خال خال ہی سہی دیکھی جا سکتی ہیں۔

گوبندی ایک لکھ پتی بزنس مین کی بیوی ہے۔ نازک احساسات، درد مند دل رکھنے والی خوش بیان شاعرہ جو نام و نمود سے گھبراتی، شہرت سے بھاگتی اور گھر اور بچوں کی سیوا اور پتی کی خدمت زندگی کا مقصد سمجھتی ہے۔ وہ اپنے بد زبان، ہتھ چھٹ، آوارہ مزاج شوہر کی جاں نثار اور وفادار بیوی ہے جو اس کا ہر ستم چپ چاپ سہار لیتی ہے لیکن مالتی سے سخت رقابت رکھتی ہے۔ شوہر کو پھسلانے کے فرض کر اس کی گالی اور مار کے باوجود ادا کرتی رہتی ہے۔ ایک بار وہ اپنی تذلیل نہ سہہ کر صدمے اور غصے کی حالت میں گھر سے نکل جاتی ہے مگر راستے میں اسے مہتا ملتا ہے جو گوبندی سے بہت عقیدت رکھتا اور اسے عورت کا سب سے اعلیٰ نمونہ سمجھتا ہے۔ وہ اسے اسی انداز سے سراہتا ہے "وہ ایک لکھ پتی کی بیوی ہے عیش و عشرت کو ہیچ سمجھتی ہے، جو بے رحمی اور بے عزتی سہ کر بھی اپنے فرض سے منہ نہیں موڑتی جو ما دیت کی قربان گاہ پر خود کو چڑھاتی رہتی ہے، جس کے لئے ایثار ہی سب سے بڑا حق ہے۔ جو اس قابل ہے کہ اس کی مورت بنا کر پوجی جائے ....." اور پھر کہتا ہے "بھگوان نے بڑی ناانصافی کی کہ اس جیسی دوسری عورت نہیں بنائی۔" تو گوبندی بڑے درد کے ساتھ کہتی ہے "نہیں مہتا جی یہ آپ کا خیال ہے۔ ایسی عورتیں آپ کو جگہ جگہ ملیں گی۔" اور اس ایک جملے میں وہ ہندی عورت کی بے بسی اور تباہ حالی کی تصویر

کھینچ دیتی ہے۔ اور پھر بظاہر بہتا کی تحریک مگر دراصل اپنے دل کی لگن سے مجبور ہو کر پھر اسی زندگی کو اپنا لیتی ہے جہاں ذلت ہے، غم ہے، دکھ ہے! اور پھر جب بکنا دیوالیہ ہو کر پاگل سا ہو جاتا ہے تو گوبندی ہی کی سچی رفاقت ومحبت اسے تباہی سے بچاتی ہے۔

آج کی دنیا میں ایثار و تیاگ کی ایسی مورتیاں جو ستم اور ظلم سہتی، ذلتیں اٹھاتیں اور کٹھور و بدباطن مردوں کو ناانصافی اور ظلم کے موقع فراہم کرتی ہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھی جائیں گی لیکن گوبندی ہندی عورت کا وہ دردناک روپ ہے جو بقول خود گوبندی کے اب بھی جگہ جگہ مل سکتی ہیں۔

اور دھنیا تو اردو ادب کے ان گنے چنے کرداروں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ کسی عورت میں جتنی ظاہری حسن و خوبی کی صفات ہو سکتی ہیں ان سے دھنیا عاری ہے۔ حسن، جوانی، خوش ادائی، خوش گفتاری کسی کی بھی تو مالک نہیں۔ محنت کی ماری، مفلسی اور دکھوں کی ستائی، حاکموں اور زمینداروں کے ظلم و جور کا شکار، سوکھی ماری، بال بچوں والی ادھیڑ عمر کی دھنیا! ایسی عورت سے ناول میں کیا زندگی میں لوگوں کو دلچسپی شاید ہی ہوتی ہو۔ یہ فن کار کے موقلم کا جادو ہے جس نے اس عورت میں ایسے پرکشش رنگ بھرے ہیں جو حساس دلوں اور سوچنے والے ذہنوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ یہ نہ کسی مہذب سوسائٹی، بناوٹی تہذیب کی تتلی کا نمائشی حسن ہے نہ دیوگھو ہر چیز کو مرد کی آنکھ سے دیکھنے والی مرد کے دماغ سے سوچنے والی ہر ظلم و ستم سر جھکا کر سہنے والی دیوی کا جلوہ۔ دھنیا نہ مالتی ہے نہ گوبندی۔ بلکہ اس ہندوستانی عورت کا پروقار اور پرکشش روپ ہے جس کی آنکھوں میں ہندی عورت کی اصلی روح جھانکتی ہے۔

دھنیا کسان عورت کی طرح اپنے مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر محنت کرتی ہے اور ساتھ ہی گرہستی کے سارے فرائض انجام دیتی اور کنبے کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ وہ ہوری سے محبت بھی کرتی ہے اور لڑتی جھگڑتی بھی ہے مصیبت میں گلے گلے اس کا ساتھ دیتی ہے اور کمزوریوں پر اسے پھٹکارتی ہے۔ وہ ظلم و ستم کے وقت اس کی سپر بن جاتی ہے لیکن جب وہ اس پر زیادتی اور سختی کرے تو شمشیر برہنہ ہو جاتی ہے۔ وہ ہوری کی رفیق حیات اور شریک حیات سچے معنوں میں ہے مگر اس کا سایہ نہیں بلکہ اپنی ایک الگ شخصیت رکھتی ہے۔ ہوری متحمل مزاج، غم خوار، ظلم و حق تلفی پر صابر و شاکر

رہنے والے قسمت کا قائل، صدیوں کا کچلا ہوا کسان ہے جس کو اگر کبھی کبھار غصہ آتا بھی ہے تو صرف اپنی بیوی پر۔ دھنیا اس کے برعکس تیز مزاج، زبان دراز، نڈر، صاف گو عورت ہے جو نہ حاکموں سے ڈرتی ہے نہ کارندوں سے۔ مگر یہی دھنیا ہوری کے ہاتھ سے پٹ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ صدیوں سے اس کے دیس میں سماج نے مرد کو یہ حق دے رکھا ہے لیکن وہ اس سے دبتی نہیں۔ ہوری کے ہاتھوں کے ہتھیار کو وہ اپنی زبان کے دھار دار آلے سے کند کرنے کا گر جانتی ہے پھر بھی دونوں میں وہ گہرا پریم، وہ اٹل وتواتر وہ ہم آہنگی ہے جو صرف ایسی ہی ازدواجی زندگی کی دین ہوا کرتا ہے جہاں میاں بیوی ایک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔

دھنیا میں تنگ دلی بھی ہے وسعتِ قلب بھی، ماما بھی اور غصہ بھی۔ وہ اپنے دیوروں کی احسان ناشناسی پر بگڑتی ہے مگر مصیبت پڑنے میں ان کی مدد کرتی ہے بیٹے پر جان دیتی ہے مگر بہو کے کہنے میں دیکھ کر اسی بیٹے سے جلنے لگتی ہے جس بہو کو غصے میں دروازے سے دھتکارتی ہے پریشانی میں اسے چھاتی سے لگانے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے حالات سے مجبور ہو کر بیٹی کو ایک بڈھے سے بیاہنے پر رضامند ہو جاتی ہے مگر اس کا دل خون رو تا رہتا ہے۔

دھنیا کا کردار دکھلاتے وقت پریم چند عورت کے دل اور جذبات کے نازک ترین مقامات پر پہنچتے نظر آتے ہیں۔ ادھیڑ دھنیا جو وقت سے پہلے بوڑھی ہو چکی ہے جوانوں سے زیادہ گہرا جذبۂ الفت دل میں نہاں رکھتی ہے۔ ہوری کو بے ہوش ہوتا دیکھ کر دھنیا اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتی ہے۔

" دھنیا ایکھ کا گٹھا پٹک کر پاگلوں کی طرح دوڑی ہوئی ہوری کے پاس گئی اور اس کا سر اپنی جانگھ پر رکھ کر زور زور سے چلانے لگی۔ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو — ہائے رام اب میں کس کی ہو کر رہوں گی۔ — کون مجھے دھنیا کہہ کر پکارے گا .....؟ لیکن ہوری کے ہوش آنے پر جب اس کا دوست دھنیا کو چھیڑتا ہے تو دھنیا نوجوان لڑکیوں کی طرح جھینپ جاتی ہے۔"

پریم چند کے ناولوں کے کرداروں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے خود ان کے ناولوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے حقیقت میں پریم چند ہمارے ان ادیبوں میں ہیں جو کل بھی مقبول تھا، آج بھی ہیں اور مستقبل میں بھی پسند کیا جائے گا۔

(اس مضمون کا کچھ حصہ آل انڈیا ریڈیو، اردو مجلس سے نشر ہوا ہے)

کیا جمہوریت کا تجربہ ہندوستان میں کامیاب ہوا؟

ڈاکٹر سید عابد حسین

مشرقی دنیا میں جمہوری حکومت سب سے پہلے جاپان میں قائم ہوئی۔ اس وقت سے آج تک بہت سی جمہوری ریاستیں بنیں اور بگڑیں اور یہ بننے بگڑنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جاپان کے بعد مشرق میں ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں جمہوری حکومت کا نظام سترہ سال سے برابر قائم ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔

آیئے پہلے یہ سوچیں کہ جمہوریت میں کیا کیا باتیں ہونی ضروری ہیں۔ جب اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ یہ باتیں سچ مچ ہمارے ہاں موجود ہیں تب ہی ہم یہ کہہ سکیں گے کہ ہم جمہوریت کے تجربے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد پھر ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جمہوریت کی دیوی ہمارے دیس میں رس بس گئی مگر دوسرے کئی دیسوں میں ابھی تک اکھڑی اکھڑی سی رہتی ہے۔

جمہوریت کی ایک بڑی مشہور تعریف ہے، عوام کی حکومت، عوام کے ہاتھوں، عوام کے فائدے کے لئے۔ پہلے پہل ایسا لگتا ہے کہ آخر ان شرطوں کی کیا ضرورت ہے صرف عوام کی حکومت کہہ دینا کافی ہے۔ بات یہ ہے اس کا دعویٰ تو آج کل قریب قریب سبھی ملک کرتے ہیں کہ ان کے ہاں عوام کی حکومت ہے۔ ان میں وہ دیس شامل ہیں۔ جہاں حکومت کے چناؤ کا حق ہر بالغ مرد اور عورت کو نہیں بلکہ تھوڑے سے اِنے گنے آدمیوں کو ہے، اور وہ بھی جن میں حکومت کے لئے صرف ایک پارٹی کے لوگ چنے جا سکتے ہیں۔ اس لئے یہ شرط لگانی پڑی کہ حکومت فقط نام کے لئے عوام کی نہ ہو بلکہ سچ مچ ان کے ہاتھوں میں ہو۔ یعنی ان میں سے صرف چند آدمی نہیں بلکہ سب بالغ مرد عورت جیسا بھلا برا سمجھتے ہیں جس خیال اور جس پارٹی کے لوگوں کو چاہیں اپنے اوپر حکومت کرنے کے لئے چن سکیں۔ اسی طرح ایسے دیس بھی

ہیں جہاں حکومت تو عوام کی چنی ہوئی ہوتی ہے مگر رئیسوں، جاگیرداروں، دھن والوں کو غریبوں سے کہیں زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں گویا حکومت انھیں پیسے والوں کے فائدے کے لئے چلائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ شرط لگانا بھی ضروری ہو گیا کہ حکومت عوام کے فائدے کے لئے ہو۔ معلوم ہوا تینوں ہی شرطیں ضروری ہیں اور جس نے حکومت کی یہ تعریف کی ہے اس نے باون تولے پاؤ رتی بات کہی ہے۔

اچھا تو اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا ہندوستان جمہوریت کی ان تینوں شرطوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں حکومت عوام کی ہے۔ اس لئے کہ اسے عوام نے چنا ہے، اور وہ بھی تھوڑے سے پیسے والے لوگوں نے نہیں بلکہ دیس کے سارے بالغ مردوں اور عورتوں نے جن میں جھونپڑیوں میں رہنے والے غریب بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گویا حکومت کا کاروبار سچ مچ عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ اب رہی تیسری شرط کہ عوام کے فائدے کے لئے ہو تو آپ ہندوستان کا آئین یا سمودھان اٹھا کر دیکھئے۔ شروع ہی میں موٹے حرفوں میں لکھا نظر آئے گا کہ یہاں سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ سیاسی، سماجی اور معاشی انصاف۔ اور یہ صرف کاغذ پر لکھی ہوئی بات نہیں بلکہ واقعی یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اونچ نیچ، غریبی اور امیری کے فرق کو مٹایا جائے۔ غرض اس میں کسی کو شبہہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں جمہوری راج کا جو نقشہ ۱۵ سال پہلے بنایا گیا تھا وہ کوئی ملمع کی چیز نہ تھی بلکہ سولہ آنے یا سو نئے پیسے کھرا مال تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس نقشے کے مطابق حکومت چلانے کا تجربہ کامیاب بھی ہوا یا نہیں جس شخص نے پچھلے تین جنرل الیکشن دیکھے ہیں کہ کس طرح کشمیر سے کنیا کماری تک بیس پچیس کروڑ مردوں عورتوں نے عام طور پر بغیر کسی جھگڑے ٹنٹے کے کئی پارٹیوں میں سے، جن کے پروگرام ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، آزادی سے اپنی اپنی پسند کی پارٹی کے امیدواروں کے ڈبوں میں ووٹ ڈالے ہو وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ پارلیمنٹ میں اور ریاستوں کی اسمبلیوں میں مخالف پارٹی کے لوگ دل کھول کر حکومت پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور بے دھڑک دیس کی بھلائی کے سجھاؤ

دیتے ہیں۔ حکومت کو ہر بات سننی پڑتی ہے اور جو من لگتی ہو وہ ماننی پڑتی ہے اور پھر اپنے دیس کا ان دیسوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ جہاں آئے دن فوجی انقلاب ہوتے رہتے ہیں۔ آئین بنتے اور منسوخ ہوتے ہیں، حکومت کے نکتہ چینیوں کی زبان بند کر دی جاتی ہے اور اخباروں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، وہ تو پکار پکار کر کہے گا کہ ہندوستان میں جمہوریت کامیابی سے چل رہی ہے

اب سوال یہ کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جمہوریت کے پودے نے ہندوستان کی زمین میں اتنی آسانی سے جڑ پکڑ لی پر بہت سے مشرقی بلکہ بعض مغربی ملکوں میں ابھی تک جمنے نہیں پایا؟ اس کا جواب کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ذرا دھیان سے سنئے تو اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔ یہ چیز جسے ہم جمہوریت کہتے ہیں ایک لحاظ سے تو بہت پرانی ہے۔ ابتدائی شکل میں اُن دنوں میں بھی پائی جاتی تھی جب انسان قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے، مگر جمہوری زندگی کا یہ ڈھانچہ جو آج کل یورپ اور امریکہ کے بہت سے ملکوں میں پایا جاتا ہے، پچھلی چند صدیوں میں دھیرے دھیرے بنا ہے۔ یہ کئی اجزاء سے مرکب ہے جن میں جمہوریت کے علاوہ علمی اندازِ نظر، سیکولرزم اور قومیت بھی شامل ہے اور ان میں سے کوئی جُزو اکیلا نہیں پنپ سکتا۔ سب مل کر ہی ایک جمہوری سماج بنا سکتے ہیں۔ علمی اندازِ نظر سے مُراد ہے زندگی اور کائنات کو سمجھنے کے لئے وہموں اور ڈھکوسلوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے مشاہدے تجزیے اور عقل سے کام لینا۔ سکولرزم کے معنی ہیں سماج کی تنظیم اور حکومت کے نظام کی بنا کسی ایک مذہب کے عقیدے پر رکھنے کے بجائے ان عقلی اور اخلاقی اصولوں پر رکھنا جن کو سبھی مذہبوں کے پیرو مانتے ہیں۔ اور قومیت اس احساس کو کہتے ہیں کہ ایک ملک کے رہنے والے چاہے الگ مذہبوں اور نسلوں کے ہوں اور الگ الگ زبانیں بولتے ہوں، لیکن ہم وطن ہونے کے ناتے سب ایک ہیں اور سب کو ملک کی سلامتی اور ترقی کے لئے ایک دل ایک جان ہو کر کام کرنا چاہیئے۔ جب یہ تینوں چیزیں موجود ہوں تب جا کر کہیں جمہوریت کی [illegible] پیدا ہو سکتی ہے جس کی بدولت ہم انسان کی عقل اور نیکی پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ صحیح

بات سمجھانے سے سمجھ جائے گا۔ زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں اور زندگی کے جتنے مسئلے ہیں سب کا حل آپس میں بحث کرنے سے نکل آتا ہے۔

اُن ملکوں میں، جہاں جمہوریت کا تجربہ ناکام رہا، ان تینوں چیزوں کی کمی تھی، مگر ہندوستان میں ان کی داغ بیل اب سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ کوئی چار سو سال ہوئے اکبر بادشاہ، ہر بات کی چھان بین عقل اور تجربے سے کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس زمانے کے فلسفیوں میں اس بات پر بحث ہوا کرتی تھی کہ بچے میں بولنے کی صلاحیت خلقی ہوتی ہے یا وہ دوسروں کے ساتھ رہ کر اور ان کی بات چیت سُن کر بولنا سیکھتے ہیں۔ اکبر نے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے یہ تجربہ کیا کہ بچوں کو شروع میں اس طرح الگ تھلگ رکھا کہ وہ کسی کو بات چیت کرتے نہ سُن سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیانے ہو کر بھی انھیں بولنا نہ آیا۔ بس جانوروں کی طرح بے معنی آوازیں نکالتے تھے۔ اس طرح اس مسئلے کے بارے میں یقینی معلومات حاصل ہو گئی۔ یہ اور بات ہے کہ ان بیچارے بچوں کو بعد میں بولنا سکھلانے میں بڑی مشکل پیش آئی ہوگی۔ اکبر ہی کے سر اس کا سہرا بھی ہے کہ اس نے سیکولر ریاست کی روایت کو جو دراصل ہندوستان میں مدت سے چلی آرہی تھی، نئے سرے سے زندہ کیا۔ اس کی پالیسی جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے، یہ تھی "ہر مذہب کے لوگوں کو خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے ہمیں ان کے ساتھ محبت کا سلوک لازم ہے، ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا کی رحمت ہر مذہب کے شامل حال ہے اور دل وجان سے کوشش کرنا چاہیئے کہ صُلح کل کے سدا بہار باغ کا لطف اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں سب انسانوں کو بھید بھاؤ کے بغیر بخشتا ہے بادشاہوں کو بھی، جو خدا کا سایہ کہلاتے ہیں، یہ اصول نہ چھوڑنا چاہیئے"۔ اب رہی قومیت، سو یہ مذہبی بنیاد پر ہندوستان میں، مدتوں سے معبود تھی، مگر سکولر بنیاد پر اسے اکبر ہی نے قائم کیا۔

آج کل کی جمہوریت کی لازمی شرطیں، ایک ابتدائی شکل میں اگر ہمیں ہندوستان میں اب سے چار سو سال پہلے دکھائی دیتی ہیں تو خود جمہوریت کا ایک ابتدائی ڈھانچہ تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے ویدوں کے زمانے میں نظر آتا ہے جب ہر بستی میں "سبھا" اور "سمتی" ہوتی تھیں

اور سارے معاملے آپس کے صلاح مشورے سے طے ہو جاتے تھے۔

پھر یہ بھی ہے کہ انگریزوں کی حکومت میں کم سے کم ڈیڑھ سو سال سے ہندوستانیوں کو جمہوریت کی ٹریننگ مل رہی تھی۔ اگرچہ اصل حکومت انگریز سرکار کے ہاتھ میں تھی اور ہمیں صرف پرچھائیں سے کھیلنے کا موقعہ ملتا تھا مگر پھر بھی کھیل ہی کھیل میں ہم نے جمہوریت کے طور طریقے سیکھ لئے تھے۔

غرض جمہوریت ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی کہ وہ اس کے برتنے میں گھبراتا، اُلجھتا، ٹھوکریں کھاتا۔ اس نے جمہوریت کے نئے تجربے کو پوری سوجھ بوجھ کے بل پر ایسی تیاری سے چلایا کہ لوگ دنگ رہ گئے۔

ممکن ہے ہم میں سے کچھ لوگ ان جھگڑوں کو دیکھ کر جو مختلف پارٹیوں میں اور ہر پارٹی کے مختلف دلوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اور اس لعن طعن کو سن کر جو لوگ ایک دوسرے پر زور شور سے کرتے رہتے ہیں، اس وہم میں پڑ گئے ہوں کہ کہیں جمہوریت کا تجربہ ہمارے دیس میں ناکام تو نہیں ہو رہا ہے۔ مگر انھیں اطمینان رکھنا چاہیئے کہ یہ روگ تو جمہوریت کے ساتھ ہر جگہ لگے ہوتے ہیں مگر ان کا علاج خود جمہوریت ہی کے اندر موجود ہے۔ وہی جنتا جو ہر چناؤ کے بعد پانچ سال تک سوتی یا اونگھتی دکھائی دیتی ہے دراصل ہر پارٹی اور ہر نیتا کی حرکتوں کو دیکھتی رہتی ہے اور وقت آنے پر سب کے بَل نکال کر سیدھا کر دیتی ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

دیوانِ حافظ مترجم

از مولانا قاضی سجاد حسین

سائز ۲۶×۲۰/۸، حجم ۴۲۴ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ وجلد بہت عمدہ. قیمت مجلد عللہ/ دس روپے. غیر مجلد آٹھ روپے. ناشر:- سب رنگ کتاب گھر. دہلی ۶

دیوانِ حافظ کو فارسی ادب و شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے وہ تو ہے ہی، لیکن اردو ادب پر بھی اس کا بہت گہرا اور پائدار اثر پڑا ہے. مگر اب جبکہ ہندوستان میں فارسی کی تعلیم کا رواج پہلے کی طرح عام نہیں رہا اور نئی نسل کے ادیب و شاعر فارسی ادب سے بڑی حد تک بے بہرہ اور لاعلم ہوتے ہیں، جناب قاضی سجاد حسین صاحب، صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی نے دیوان حافظ کا ترجمہ کرکے اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے. ترجمہ صاف، سادہ اور بامحاورہ ہے اور حسب ضرورت حاشیہ میں تشریح بھی کردی گئی ہے. مثال کے طور پر دو شعر کا ترجمہ اور تشریح ملاحظہ ہو۔

ببیں ہلالِ محرم بخواہ ساغر راح　　　　کہ ماہِ امن و امانست و سال صلح و صلاح

محرم کا چاند دیکھ، شراب کا ساغر مانگ　　　　اس لئے کہ امن و امان کا مہینہ ہے اور صلح اور نیکی کا سال ہے

تشریح:- ماہ محرم ان چار مہینوں میں سے ہے جن میں قتال حرام ہے۔

دلا تو فارغی از کار خویش و می ترسم　　　　کہ کس درت نکشاید چو گم کنی مفتاح

اے دل تو اپنے کام سے بے فکر ہے اور مجھے ڈر ہے　　　　کہ جب تو کنجی گم کردے گا تو کوئی تیرا دروازہ نہ کھولے گا

تشریح:- جو شخص خود اپنی فکر نہیں کرتا کوئی دوسرا بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔

شروع میں جناب سعید انصاری صاحب، استاد جامعہ ملیہ کے قلم سے مختصر پیش لفظ ہے جس میں خواجہ شیرازی کی تعلیم، شعروشاعری اور ان کے کلام کی خوبی پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ بڑا اچھا ہوتا اگر اس مختصر پیش لفظ کے بجائے مبسوط اور جامع مقدمہ ہوتا ہے، جس میں تفصیل سے دیوان حافظ اور اس کے مصنف کے مقام کو اجاگر کیا جاتا۔

اُردو املا کا آسان طریقہ

از عبدالغفار مدہولی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۴۴ صفحات، تاریخ اشاعت ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء قیمت ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

مدہولی صاحب جامعہ ملیہ میں کوئی چالیس سال سے تعلیم دے رہے ہیں، ایک طویل عرصے تک مدرسہ ابتدائی میں پڑھاتے رہے اور اب کچھ عرصے سے استادوں کے مدرسہ میں ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، اردو لکھنا پڑھنا سکھا رہے ہیں۔ موصوف کو شروع سے اپنے موضوع سے غیر معمولی دلچسپی اور گہرا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے اپنے چالیس سالہ تجربہ کی بنا پر اس مختصر کتاب میں املا کے وہ آسان طریقے بتلائے ہیں، جن کو اختیار کرکے بڑی آسانی سے اردو زبان سکھائی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کے ۲۴ صفحوں میں ان طالب علموں کی تحریروں کے نمونے دیے گئے ہیں، جن کی مادری زبان ہندی تھی اور جنھوں نے مختصر مدت میں اردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

ہمالہ پکارتا ہے

از کشن دت طوفان

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۹۵ صفحات، غیر مجلد، قیمت ڈیڑھ روپے

تاریخ طباعت: جنوری ۱۹۶۳ء ناشر: مکتبہ قصر اردو، اردو بازار۔ دہلی ۶

چین کے حملے کے بعد اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے نظریاتی اختلافات کو پس پشت ڈال کر حملہ آور کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ اس سلسلے میں شعرا کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پیش نظر

کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے کشن دت طوفان ایک نوجوان شاعر ہیں، اس لئے ان کی شاعری میں جوش ہے، ولولہ ہے، غم و غصے میں تیکھاپن ہے اور جذبات میں شدت، اس لئے خیالات و جذبات کے اظہار میں کہیں کہیں آداب شاعری کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے، مگر اس معاملے میں ان کو مجبور سمجھنا چاہیئے، کیونکہ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔

اس مجموعہ کا پیش لفظ جناب گوپی ناتھ امن نے لکھا ہے، جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ "بدقسمتی سے گزشتہ چوتھائی صدی سے اردو شاعری کا رنگ سرخ ہونے لگا تھا اور اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وطن کے راگ بہت کم ہو گئے تھے۔ قومی شاعری ایک طرح پر معرض زوال میں آگئی.... اردو ایک طرح پر قومی زندگی سے کٹ گئی.. لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو اردو جیسی پیاری اور میٹھی زبان کا زوال پسند نہیں اس لئے ایک ایسا موقع آگیا جسے سرخ شاعری اور سرخ افسانہ گوئی کا زوال سمجھنا چاہیئے.. پھر وطن کے نغمے گائے جا رہے ہیں، پھر وطنیت ہماری زبان میں زندہ ہوئی، ایشیا ایک ہے کی جگہ ہندوستان ایک ہے کا نعرہ سنا جانے لگا۔"

اور ہندوستان جاگ اُٹھا — مرتبہ : عبدالقوی دسنوی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۱۰۴ صفحات، قیمت درج نہیں۔ تاریخ طباعت: فروری ۶۳ء

ناشر: شعبۂ اردو، سیفیہ ڈگری کالج۔ بھوپال (ایم پی)۔

اس کتاب میں ان نظموں کا انتخاب دیا گیا ہے، جن میں چین کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل ملک کے جذبات کو ابھارا گیا ہے۔ ان نظموں میں چین کی بے وفائی اور دغا بازی کو بے نقاب کیا گیا ہے :

جس نے ہم سے کبھی پیمانِ وفا باندھا تھا — آج ہم سے وہی آمادۂ پیکار ہوا
جس کو ہم "وجہ سکون راحت جاں" سمجھے تھے — وہ ستم کیش ہوا، درپئے آزار ہوا

(ایم، اے شاد)

اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان نے حق و صداقت کی حمایت اور امن کی حفاظت کے لئے تلوار اٹھائی ہے:

ہم نے شمشیر اٹھائی ہے صداقت کے لئے
امن و تہذیب و شرافت کی حفاظت کے لئے
سرکف آج ہیں ہم ہند کی عظمت کے لئے (روش صدیقی)

اور اس عزم محکم کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ

اپنی سرحد سے اے چین! ہٹا دیں گے تجھے
عزم و ہمت کے یہ طوفان بہا دیں گے تجھے (روش صدیقی)

کتاب کے مرتب جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے شروع میں "جاگو اور جگاؤ" کے عنوان سے حملۂ چین پر ایک تاریخی نظر ڈالی ہے۔

شاد عارفی (انتخاب غزل)

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۳۲ صفحات، تاریخ طباعت، اکتوبر ۱۹۶۲ء ناشر: نیا خواب پرانی تحصیل رامپور (یو پی)

پندرہ روزہ "نیا خواب" نے رام پور کے شاعروں کے تعارف اور انتخاب کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتابچہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں شاد عارفی کی غزلوں کا مختصر انتخاب ہے، جس کے بارے میں عابد رضا بیدار نے، جو غالباً اس کتابچہ کے مرتب ہیں، لکھا ہے کہ "یہ انتخاب شاعر کا پورا نمائندہ انتخاب نہیں ہے، اس میں نظمیں تو شامل ہی نہیں ہیں جو شاد عارفی کی شاعری کی آدھی ضخامت ہے، اس رنگ تغزل کی نمائندگی بھی نہیں ہے جب آتش جوان تھا۔ اس انتخاب میں غزل کے اس رنگ کو پیش کیا گیا ہے جس پر صرف شاد عارفی کا ٹھپہ ہے۔" آخر میں شاعر کے خود نوشت حالات زندگی ہیں اور ان کی شاعری و فن کے متعلق چند ادیبوں اور نقادوں کی رائیں ہیں۔

شادؔ کی غزلوں میں عام طور پر بڑی تلخی، جارحانہ تنقید اور زہرخند طنز ہوتا ہے، کبھی کبھی ان میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ طبیعت پر بار محسوس ہوتا ہے، لیکن جب شاعر کے حالات سامنے آتے ہیں تو ان کی اس تلخی اور جھلاہٹ کے لئے وجہ جواز پیدا ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

یہ نرالی طرز استدلال یہ جمہوریت
تیغِ قاتل سے ٹپکتا ہے کہ یہ قاتل نہیں
آپ طاقت ور ہیں ساری مملکت بھی آپ کی
ہے تو گستاخی، یہ عالی جاہ اس قابل نہیں

ستم گر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں — غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں
مجھے آج کانٹوں کا منہ چومنے دو — بہاروں کا رُخ دیکھ کر کہہ رہا ہوں

جناب شیخ ہی اب رہ گئے ہیں لے دے کر — وہ دن گئے، جو کسی برہمن پہ چوٹ کروں
یہی کہیں گے کہ آنکھیں ہمارے پاس بھی ہیں — جو کم نگاہی اربابِ فن پہ چوٹ کروں
کریں گی یاد مجھے شادؔ کل نئی قدریں — جو آج رسم ورواج کہن پہ چوٹ کروں

کسی کے حسنِ سماعت پہ چوٹ ہے یہ بھی — کہ ہم فسانۂ غم بار بار کہتے ہیں
جو دشمنوں کے اشاروں پہ رقص فرمائیں — انھیں کو اصل میں ذی اختیار کہتے ہیں
وہ انقلاب کا رستہ نہ دیکھتے ہوں کہیں — جو داستانِ شبِ انتظار کہتے ہیں

جناب شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر — بتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں

ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو — گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

آپ کی منصوبہ بندی کی طرح سرکار کو — ہم بھی کا غذ پر دکھا سکتے ہیں تعمیریں بہت

آج کل راتیں بڑی ہیں اس لئے دن گھٹ گیا — تھے کبھی ہم لوگ بھی شایانِ شان کہئے دوست

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

ہز ہائنس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ کا گراں قدر عطیہ

امسال ۲۹ اکتوبر کو جامعہ ملیہ کا ۴۳ واں یوم تاسیس منایا گیا۔ جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملنے کے بعد یہ پہلا یوم تاسیس تھا اس لئے اس مرتبہ نسبتاً زیادہ جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا اور تقریروں کا انداز پہلے سے مختلف تھا۔ اس اہم موقع پر جناب شیخ الجامعہ صاحب نے جموں و کشمیر کے صدر ریاست ہز ہائنس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ صاحب کو جلسے کی صدارت کے لئے مدعو کیا تھا، جسے موصوف نے ازراہ عنایت منظور فرمایا۔

صدر ریاست کی آمد پر این سی سی نے سلامی دی، اس کے بعد پرچم کشائی کی رسم ادا ہوئی اور جامعہ کا ترانا گایا گیا، پھر صدر ریاست جلسے گاہ تشریف لے گئے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا، جس میں جامعہ کے ابتدائی دور کے حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ۳۰ء سے ۴۶ء تک کے حالات بیان فرمائے، آخر میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے موجودہ حالات اور مستقبل کے عزائم سے بحث کی۔ اس کے بعد صدر جلسہ جناب مہاراجہ ڈاکٹر کرن صاحب نے صدارتی تقریر کی۔ تقریر سے قبل موصوف نے ریاست جموں و کشمیر کی طرف سے پچاس ہزار کے گراں قدر عطیے کا اعلان فرمایا، اس کے بعد فرمایا۔

شیخ الجامعہ صاحب، جامعہ میں میرے آنے کا یہ پہلا موقع ہے، مجھے خوشی ہے اور آپ کا ممنون ہوں کہ جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر مجھے یاد کیا اور جامعہ کو دیکھنے اور اس کے حالات سننے کا موقع ملا۔ میں خود جامعہ آنا چاہتا تھا، کیونکہ اس کی شہرت سن چکا ہوں، اس نے تعلیم کے میدان میں جو خدمات انجام دی ہیں ان سے واقف ہوں، جامعہ سیکولرزم کی علامت ہے، ٹھیک اسی طرح ریاست جموں و کشمیر بھی سیکولر نظام کی نمائندہ اور علامت ہے۔

عالی جناب صدر ریاست نے طالب علموں، بالخصوص کالج کے طلبا، سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ کی طرح میں بھی گاندھی جی کے دور کے بعد کا طالب علم ہوں، ہمیں تحریک آزادی میں حصہ لینے اور اس مقدس لڑائی میں شرکت کرنے کی سعادت میسر نہیں آئی، مگر آزاد ہندوستان کے مستقبل کو سنوارنے اور گاندھی جی کے خوابوں کو پورا کرنے کی اہم اور کٹھن ذمہ داری ہمارے اوپر ہے، اس کی تعمیر کا ایک وسیع پروگرام ہمارے سامنے ہے، ہمیں چاہیئے کہ اس میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیں۔ شاید آج سے ایک صدی قبل طالب علموں کی بے نظمی اور بے ضابطگی کا مسئلہ نہیں تھا، مگر آج اس آزادی اور ٹکنالوجی کے دور میں یہ ایک اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ میں خاص طور پر آپ سے کہوں گا کہ آپ اس ادارے کے مقاصد اور اس کے بانیوں کی سیرت کو سامنے رکھیئے۔ ہم چاہے کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں ہمارا فرض ہے کہ اس ملک کی خدمت کریں، اس کی تعمیر میں حصہ لیں اور اس کے سیکولر نظام حکومت کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنائیں۔

صدر ریاست کی تقریر کے بعد خازن جامعہ جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ آپ نے جامعہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اور ہماری عزت بڑھائی۔ اس سے پہلے بھی ریاست کشمیر نے جامعہ کو شکر گذاری کا موقع دیا ہے۔ سابق وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد صاحب نے بھی آپ ہی کی طرح ایک گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا تھا، مگر اس عطیہ سے کہیں گراں قدر آپ کی ذات گرامی ہے، آپ کا خلوص، آپ کی سادگی، آپ کی محبت اور آپ کی شخصیت میں جو کشش اور جاذبیت ہے، اس کی بنا پر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری جامعہ سے آپ جیسے نوجوان نکلیں۔ آج آپ ایک خاص موقع پر جامعہ تشریف لائے ہیں، مگر ہماری خواہش ہے کہ اکثر آتے رہیں تاکہ جامعہ کے کاموں کو زیادہ تفصیل سے دیکھنے اور یہاں کے اساتذہ سے ملنے کا موقع ملے۔

آخر میں قومی ترانہ پیش کیا گیا۔

یوم یکجہتی ۲۰ اکتوبر کو جامعہ میں یکجہتی اور این سی سی کا دن منایا گیا۔ سب سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب نے این سی سی کیڈٹ کی سلامی لی، اس کے بعد موصوف نے جامعہ کے طالب علموں، اساتذہ اور کارکنوں سے قومی یکجہتی اور ملک کی خدمت کا عہد لیا۔

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: یونین پریس دہلی — ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

Regd. No. D - 768 November, 1963

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ		قیمت فی پرچہ
چھ روپے		پچاس نئے پیسے
جلد (۴۹)	بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۳ء	شمارہ (۶)

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جامعہ ملیہ ——— ماضی، حال اور مستقبل

جامعہ کے ۴۳ ویں یوم تاسیس کے موقع پر امسال ۲۹ اکتوبر ۶۳ ۱۹ء کو جموں اور کشمیر کے صدر ریاست جناب ہز ہائینس مہاراجہ ڈاکٹر کرن سنگھ نے جلسے کی صدارت کی۔ موصوف کی صدارتی تقریر کا خلاصہ ہم جامعہ کی پچھلی اشاعت میں دے چکے ہیں۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، ڈاکٹر سید عابد حسین اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جامعہ کے مختلف ادوار پر مضامین پڑھے، جنھیں ہم آئندہ صفحات میں پیش کر رہے ہیں۔ ان مضامین میں جامعہ کی تاریخ اور خاص خاص حالات بڑی حد تک تفصیل سے آگئے ہیں، مگر چند اہم تاریخیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

۱- ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ قائم ہوئی۔

۲- ۷ جولائی ۱۹۲۵ء کو دہلی منتقل ہوئی اور قرول باغ میں کرایہ کی عمارتوں میں کام شروع ہوا۔

۳- ۱۹۳۱ء میں قرولباغ میں جامعہ کی پہلی عمارت، تعلیمی مرکز پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۴- ۱۹۳۶ء میں ابتدائی اسکول اپنی مستقل آبادی جامعہ نگر منتقل ہوا۔

۵- ۱۹۳۸ء میں استادوں کا مدرسہ قائم ہوا۔

۶- ستمبر ۱۹۴۷ء میں تعلیم و ترقی، تعلیمی مرکز (غیر اقامتی بچوں کا ابتدائی اسکول)، کتب خانہ اور مکتبہ جامعہ جامعہ نگر منتقل ہوئے۔

۷- ۱۹۵۲ء میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن قائم ہوا۔

۸- ۱۹۵۵ء میں ریسرچ، ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سنٹر اور نرسری اسکول قائم ہوئے۔

۹- ۱۹۵۶ء میں رورل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔

(لطیف اعظمی)

جامعہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

الہ آباد کے بیرِ ظریف نے ظرافت کے انداز میں کہا تھا۔

شیخ مرحوم کا اب قول مجھے یاد آتا ہے   دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے (اکبر الہ آبادی)

لیکن اس ظرافت میں انگریزی سیاست کی پوری تاریخ کی طرف اشارہ ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اس وسیع ملک کی حکمرانی کبھی ان کے نصیب میں آئے گی لیکن اپنوں کی ناچاقی نے غیروں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا اور بدیسی دوکاندار اس دیس کے مالک بن گئے۔

اس اتفاقی حادثہ کو مستقل حقیقت بنانے کے لیئے ضروری تھا کہ ہندوستانیوں کے ذہن ودماغ کو اس طرح متاثر کیا جائے کہ وہ ایک دوسرے سے بدظن ہو جائیں اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کے بجائے آپس ہی میں دست وگریباں رہنا پسند کریں چنانچہ اس نقطۂ نظر کے مطابق نصاب تعلیم مرتب کیا گیا اور تاریخ کے نام سے ایسے تفرقہ انگیز افسانے سنائے گئے کہ بچوں کے دلوں میں نفرت وعداوت کی بنیادیں پڑ گئیں اور وہ اپنے بھائیوں کو دشمن اور غاصبوں کو دوست سمجھنے لگے۔

انگریز حکمراں یہ سمجھتے تھے کہ ان کی اس تفرقہ انگیز سیاست پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا، لیکن مُحبّانِ وطن نے اس صورت حال کو جلد ہی محسوس کر لیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ سارے باشندگانِ ملک اس رازِ درونِ پردہ کو سمجھ لیں لیکن حکمرانوں کی ہیبت اور معیشت کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک طرف قید وبند اور دار ورسن کا خدشہ تھا تو دوسری طرف فقر وفاقہ کا خطرہ۔ اس دوگونہ خوف نے حوصلوں کو پست کر دیا تھا لیکن اس میں

جان پر کھیل کر ملت کو بیدار کرنے والوں کی تعداد کچھ نہ کچھ بڑھتی ہی رہی۔

آخر کار بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ ایسے حوادث پیش آئے کہ قوم خوابیدہ نے انگڑائی لی۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور مظالم پنجاب نے ہندو مسلمان دونوں کو مشترک دشمن کے مقابلے میں متحد کر دیا۔ اب سرحد سے آسام کے کناروں تک اور کشمیر سے راس کماری تک ہندو مسلمان بھائی بھائی کے نعرے بلند ہو رہے تھے اور بدیسی راج کا جوا گردن سے اتار پھینکنے کی جد وجہد جاری تھی۔

اس سیاسی جوش کے زمانے میں ہوش مند رہنماؤں نے سوچا کہ غلامی کی جڑیں اکھاڑنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم غیروں کے اثر سے آزاد ہو جب تک یہ قلعے سر نہ ہوں گے انگریزی اقتدار برقرار رہے گا۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے سربرآوردہ رہنماؤں نے اپیل کی کہ تمام محکموں کی طرح حکومت کی تعلیم گاہوں کا بھی بائیکاٹ کیا جائے غالباً ۱۹۱۹ء میں تعلیمی ترک موالات کا اعلان کیا گیا اس اعلان پر ملک کے نوجوانوں نے کافی توجہ کی اور تعلیمی مقاطعہ کی مہم شروع ہو گئی۔

اپنی طویل نظر بندی کے بعد جب مولانا محمد علی رہا ہوئے تو وہ اپنی مادر علمی کی زیارت کے لئے علی گڑھ آئے ان کے اعزاز میں طلبہ نے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم نے اپنی وہ مشہور نظم پڑھی جس کا یہ شعر آج تک بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لئے   تمغۂ ایمان نہیں ملتا نمائش کے لئے

مولانا محمد علی کی آمد سے ایم اے۔ او کالج علی گڑھ[لہ] کے نوجوانوں میں آزادی کی لہر دوڑ گئی اور وہ سوچنے لگے کہ کس طرح اپنی درسگاہ کو برطانوی حکومت کے اثرات سے آزاد کریں کچھ عرصہ کے بعد مراد آباد میں خلافت کا ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا، اس موقع پر علی گڑھ کے چند طالب علم وہاں گئے اور مولانا محمد علی سے مل کر درخواست کی کہ وہ مہاتما گاندھی کو لے کر علی گڑھ تشریف لائیں۔ اس

لہ اس وقت تک یونیورسٹی نہیں بنی تھی کالج ہی تھا۔

درخواست پر یہ حضرات علی گڑھ گئے کالج میں جلسہ ہوا اور بڑی پر زور تقریریں کی گئیں مگر ارباب انتظام کی تدبیروں نے جلسہ کو بے نتیجہ بنا دیا لیکن قوم پرور طلبہ نے ہمت نہیں ہاری اور کوشش کرکے پھر اکٹھا ہوئے اب کی علی برادران کی شکستہ دلی نے دلوں کی دنیا بدل دی اور طلبہ نے تعلیمی ترک موالات کا فیصلہ کرلیا۔ آخر کار ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مبارک خطبہ سے نیشنل مسلم یونی ورسٹی[1] (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے قیام کا اعلان ہوگیا۔

شیخ الہند نے اپنے خطبہ میں اعلان کیا کہ :-

"ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا تھا قبل اس کے کہ ہم اس کو اپنا استاد بنلاتے۔ ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم اغیار کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات کے کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔"

امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس وقت کے حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"عجب زمانہ تھا وہ صاحبو! نشۂ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ بھی کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جوانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑ گڑاتے سنائی دیتے تھے خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رکھنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی، سفارشوں کے لئے سرگرداں اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو کسی بڑی چیز میں گم کردیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت

---

[1] اصل نام نیشنل مسلم یونیورسٹی ہی رکھا گیا تھا جامعہ ملیہ اسلامیہ اس کا ترجمہ کیا گیا تھا بعد کو یہی ترجمہ زبانوں پر چڑھ گیا۔

کے لئے وقف کر دیں۔ اس جوش اور اس خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا نہ کسی عمارت کا افتتاح ہو سکا تھا چندوں کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرۃ زیادہ عزیز تھی وہ محنت و مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا۔

یہ بڑی بے سروسامانی کا دور تھا، نہ رہنے کا خاطر خواہ انتظام تھا نہ پڑھنے کی مناسب جگہ خیمے قیام گاہ تھے اور درختوں کے سائے تعلیم گاہ، مگر اس بے مائگی میں فارغ البالی اور اس پریشان حالی میں عجیب دلجمعی تھی۔ جن بزرگوں کو اس عہد پُرمحن میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ آج تک اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہیں اور اس زمانے کے مصائب و مشکلات کی داستانیں اس لطف و مسرت کے ساتھ سناتے ہیں کہ پروردگانِ ناز و نعم بھی حسرت و تنگ دامانی کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم جامعہ کے پہلے امیر اور مولانا محمد علی شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب مولانا محمد علی گرفتار ہو گئے تو جناب عبدالمجید خواجہ مرحوم اُن کے بجائے شیخ الجامعہ منتخب ہوئے۔

جامعہ کی بنیاد ایک شدید سیاسی ہیجان کے زمانہ میں پڑی تھی۔ اس لئے کچھ دنوں یہاں کی تعلیمی فضا پر سیاست کا اثر غالب رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ سیاسی اثر کم ہوتا گیا اور جامعہ ایک خالص تعلیمی ادارہ کا رنگ اختیار کرنے لگی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ تحریک خلافت کا زور ختم ہوا تو آمدنی کے سوتے خشک ہوتے نظر آئے یہ دور اہل جامعہ کے لئے بڑی پریشانی کا تھا سیاست کا زور کم ہوا تو وقتی جوش کے متوالوں کی آنکھیں کھلیں اور آخرۃ کے بجائے عاجلہ کی فکر پھر دامنگیر ہوئی۔ جذبات کی رَو میں جو قدم انھوں نے بڑھائے تھے اب عقل مصلحت اندیش کا تقاضا تھا کہ جلد سے جلد انھیں پیچھے ہٹایا جائے۔ استقامت کے بجائے کامرانیوں کی فکر کی جائے۔ اس مصلحت اندیشی نے بہتوں کو گریز پائی کی صلاح

دی اور دیکھتے دیکھتے چند جانباز وں کے سوا سارا میدان خالی نظر آنے لگا لیکن ان سرفروشوں کی ہمت نے ملت کی آبرو رکھ لی اور اس دانش گاہ عالی کی بساط کو مشکلات و مصائب کے جھونکوں میں الٹنے سے بچالیا۔

فروری ۱۹۲۳ء کا جلسۂ تقسیم اسناد ہمیشہ یادگار رہے گا ملک کے مایۂ ناز سائنس داں سر سی وی رمن نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ سر سی وی رمن کی بین الاقوامی شہرت نے ایک بار پھر کم نظروں کی آنکھیں کھول دیں انھوں نے اس درسگاہ کے مقاصد کی ترجمانی اس بلند آہنگی سے کی کہ گراں گوش بھی چونک پڑے جس وقت انھوں نے کہا۔

"آزادی اول، آزادی آخر اور آزادی ہمیشہ"

تو درودیوار اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے پھر جب انھوں نے بغداد و قاہرہ اور قرطبہ وغرناطہ کی یونیورسٹیوں کے علمی کارناموں کا ذکر کیا تو حاضرین فخر سے جھومنے لگے۔ اس خطبہ میں انھوں نے مسلمانوں کے علمی مذاق کا بہت موثر طور پر ذکر کیا، چند جملے آپ بھی سنئے۔

"علم کی محبت اور صداقت کا احترام اسلام کے خمیر میں داخل ہے۔ نبی عربی (علیہ السلام) نے علم اور سائنس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے وہ انھیں دوسرے معلمین سے علانیہ ممتاز کرتی ہے وہ فرماتے تھے طالب علم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔ جو طلب علم میں سفر کرتا ہے اسے خدا بہشت کی راہ دکھاتا ہے۔ گبن، سیڈی لاٹ، لین پول اور ڈریپر وغیرہ مورخین نے مسلمان علماء کی جرأت خیال، ندرت تحقیق اور تنوع مضامین کے بارہ میں جس طرح لکھا ہے اسے پڑھ کر کوئی شخص تعجب و استحسان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اسلام انسانوں کے درمیان روح فرسا امتیاز سے آشنا نہیں ہے وہ ایک خدا کی بالادستی کا قائل ہے۔ اس کے بعد وہ انسان کو اس کی پوری بلندی تک جانے کی اجازت دیتا ہے۔"

جن لیڈروں نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی ان میں سے بعض ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی تسخیر کا ارادہ رکھتے تھے لیکن حالات کی رفتار نے جلد ہی واضح کر دیا کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا نہیں ہے بلکہ کچھ ہی عرصے میں ایم اے او کالج

کی تعمیر تو در کنار علی گڑھ کی سرزمین میں جامعہ کی زندگی بھی محال نظر آنے لگی ۔ حالات اتنے ناسازگار تھے کہ ٹرسٹیز (امنا) فیصلہ کرنے والے تھے کہ اس درسگاہ کو بند کر دیں لیکن ایسی ہی کی اس فضا میں جامعہ کے بعض طلبہ اور کارکنوں نے ہمت نہیں ہاری ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس زمانے میں جرمنی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے ان لوگوں نے انھیں صورت حال سے مطلع کیا ذاکر صاحب نے لکھا کہ

"میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔"

جامعہ کے طلباء قدیم اور کارکنوں کا ایک وفد حکیم صاحب سے ملا اور درخواست کی کہ وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ حکیم صاحب نے پوچھا میں جامعہ کو دہلی لے آؤں تو تم لوگ اس کے لئے کس قدر قربانی کرنے کے لئے تیار ہو؟ وفد کے ارکان نے یک زباں ہو کر کہا "ہم بے معاوضہ بھی کام کرنے کو تیار ہیں" حکیم صاحب نے انھیں اطمینان دلایا کہ جامعہ کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

مجلس امناء (ٹرسٹیز) کے جلسے میں بڑی پرزور تقریریں ہوئیں۔ لوگوں کا رجحان یہی تھا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے لیکن حکیم صاحب کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا جائے لیکن یہ منتقلی آسان نہ تھی۔ اس کے لئے زر خطیر درکار تھا لیکن مہاتما گاندھی کی توجہ سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ آخر کار ۱۹۲۵ء کی تعطیل گرما میں جامعہ دہلی آگئی اور قرول باغ میں چند کرائے کے مکان لے کر تحریک ترک موالات کی اس تعلیمی یادگار کو نئی زندگی و تابندگی دینے کا بندوبست کیا گیا۔

دہلی آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد خواجہ صاحب مرحوم بھی اپنے حالات کی بنا پر جامعہ میں نہ رہ سکے۔ حسن حیات صاحب رجسٹرار بھی علیحدہ ہو گئے ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے آنے میں چند ماہ کی دیر تھی اس لئے عارضی طور پر کام چلانے کے لئے پروفیسر طاہر الیس محمدی صاحب کو قائم مقام شیخ الجامعہ اور رشید اطہر صاحب کو رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ چند ماہ کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنے دو رفیقوں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کے ساتھ جرمنی سے واپس آگئے ان صاحبوں کے آنے سے جامعہ کے طلباء، اساتذہ اور کارکنوں کی ڈھارس بندھی۔ حکیم صاحب مرحوم کو بھی بڑا سہارا ملا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب بھی مقرر کئے گئے اور یہ [illegible]

جامعہ کے تعلیمی منصوبے خوش اسلوبی کے ساتھ بروئے کار آنے لگے۔ حکیم صاحب مرحوم کی سرپرستی میں جامعہ کا سفینۂ حیات آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک دسمبر ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جامعہ کی تاریخ میں یہ حادثہ اتنا سخت تھا کہ کلیجے منہ کو آنے لگے۔ مجلس امناء بورڈ آف ٹرسٹیز کی پھر رائے ہونے لگی کہ اس درسگاہ کو بند کر دیا جائے مگر امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی سرپرستی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمت افزائی نے کارکنوں کو مایوس نہیں ہونے دیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے یہ نازک وقت بھی گزار دیا۔ امناء یہ قومی امانت چند نوجوانوں کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے۔ ان نوجوانوں نے قلیل مشاہرہ پر بیس سال تک خدمت کا عہد کیا۔ مجلس امناء کی جگہ انجمن تعلیم ملی کے نام سے ایک نئی سوسائٹی بن گئی جن صاحبان کے عزم و ایثار نے اس مہم خدمت کا آغاز کیا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم، خواجہ عبدالحی، حافظ فیاض احمد، ارشاد الحق صاحب، مولانا سعد الدین مرحوم، سعید انصاری، حامد علی خاں، شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم۔

بعد کو اور لوگ بھی اس جماعت میں شامل ہوتے گئے مگر السابقون الاولون کی فہرست میں انہیں کا نام ہے۔ حالات بہت ناسازگار تھے منزل دور اور راہ پرخار تھی قدم قدم پر مشکلات و موانع کا ہجوم تھا مگر اللہ کے ان بندوں نے خدمت قومی کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دی۔ آپ کا اعلان سالانہ جشن سیمیں کے بھرے مجمع میں ان کی تندہی جفاکشی اور ایثار و قربانی کا ان الفاظ میں اعلان کیا "میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی اور ادارے کو نصیب ہوں گے انھوں نے بہت سختیاں اٹھائیں مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہے انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا۔"

آغشتہ اند ہر سر خارے بخون دل　　　قانون باغبانی صحرا نوشتہ اند

اب ہم ۱۹۳۰ء کے حدود تک پہنچ گئے ہیں کہانی کا آغاز میں نے کر دیا ہے۔ اب داستان کے اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لئے مجھ سے بہتر بزرگوں کے لئے گوش بر آواز ہو جایئے میں تو صرف داستان گو تھا لیکن وہ اس داستان کے ہیرو رہے ہیں میں نے تو دوسرے موجوں کے قصے سنے ہیں اب طوفان کی تلاطم خیزی کا حال ان حضرات سے سنیئے جو خود حوادث و آفات کے تھپیڑوں سے دوچار ہو گئے ہیں اور گرداب بلا سے جامعہ کی کشتی کو نکال کر ساحل مراد تک لائے ہیں۔

جامعہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک

ڈاکٹر سید عابد حسین

جناب صدر، شیخ الجامعہ صاحب، بھائیو، بہنو، اور بچو

میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ جامعہ ملیہ کی سولہ سال کی تاریخ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک آپ
ں۔ تاریخ کے معنی بہت سے لوگ سمجھتے ہیں واقعات کا ایک سلسلہ۔ مگر اصل میں محض واقعات
ن بیان کو تاریخ نگاری نہیں بلکہ وقائع نگاری کہتے ہیں تاریخ واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے
، کا بھی ذکر کرتی ہے یعنی ان سماجی، معاشی، اور سیاسی حالات کا، اُن خیالات اور رجحانات کا
ات کو جنم دیتے ہیں۔ میں نے اس مضمون میں اسی کی کوشش کی ہے۔ اس تمہید کا مقصود یہ
رنا نہیں کہ اس سرسری مضمون میں تاریخ نگاری کا حق ادا ہو گیا بلکہ یہ عذر کرنا ہے کہ وقائع نگاری
ا نہیں ہو سکا۔ اس میں اصل بات کم ہے اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہیں۔ مگر شاید یہ اِدھر اُدھر کی
ر نہیں ہیں بلکہ اصل بات پر روشنی ڈال کر اس کو نمایاں کرتی ہیں۔

آپ ابھی جامعہ کے علی گڑھ میں قائم ہونے اور پھر دہلی منتقل ہونے کا ذکر سن چکے ہیں۔ یہ محض مقام کی
میں بلکہ بڑی حد تک نصب العین کی تبدیلی یا یوں کہیے کہ نصب العین کا تعین تھا۔ جب تک جامعہ علی گڑھ
دو مقصد دل کے زیغ میں جھولتی رہی۔ ایک یہ کہ وہ ایک منتقل تعلیم گاہ اور مسلمانوں کی تعلیم اور زندگی
ایسا نقشہ بنائے جس میں دینی اور دنیوی اقدار کے پرانے اور نئے زمانے کے رنگ سموئے ہوئے
س خیال کے نمائندے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ عبد المجید تھے۔ دوسرا یہ کہ
یک عارضی کیمپ ہو جنگ آزادی کے سپاہیوں کا جو قومی تحریک میں حصہ لے کر ہندوستان کو آزاد
اور پھر فاتح کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی پر جہاں سے وہ نکالے گئے تھے، قبضہ کریں اور اس کی اصلاح

کریں یہ نقطۂ نظر مولانا محمد علی کا تھا جن کا یہ قول سننے میں آیا ہے "ہمارا کعبہ علی گڑھ کالج ہے۔ جامعہ کی زندگی تو ہجرت کی زندگی ہے۔ آخر میں ہمیں مکّے کو فتح کرنا ہے۔" جن دنوں نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریکوں کا زور تھا۔ عام طور پر لوگوں کو ایسا لگتا تھا کہ بس اب ملک آزاد ہونے والا ہے اور جامعہ کے مہاجرین کعبۂ مقصود پر قبضہ کرنے والے ہیں اس لئے جامعہ کے بارے میں مسلمانوں کی عام رائے مولانا محمد علی کے ساتھ تھی۔ مگر ۱۹۲۵ء میں واقعات کا رخ بدل چکا تھا۔ نان کوآپریشن کی تحریک تھک کر شل ہو گئی تھی اور خلافت کی تحریک دم توڑ رہی تھی۔ جب ان حالات میں مولانا محمد علی اور ان کے ہم خیالوں نے جامعہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور چند من چلے طالب علموں کی درخواست پر حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کو دہلی منتقل کر کے اس کو چلانے کا ذمّہ لیا تو گویا یہ فیصلہ ہو گیا کہ جامعہ ایک مستقل تعلیم گاہ ہے۔ اس کا اصل مقصد تعلیمی ہے۔ سیاسی مقصد محض ضمنی ہے اور وہ بھی عملی سیاست میں حصّہ لینا نہیں بلکہ صرف اپنے طالب علموں میں آزادی کا جذبہ اور قومیت کی روح پیدا کرنا۔ دہلی آنے پر جامعہ کی ذہنی فضا کی تبدیلی کا اندازہ آپ کو اس سے ہو گا کہ دو سال بعد جب مہاتما گاندھی جامعہ میں تشریف لائے تو اسکول کے بچوں نے خیر مقدم کے ایڈریس میں کہا "آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے ہم خدا کے نیک بندے اپنے دیس کے سچے خادم اور سب انسانوں کے بھلائی چاہنے والے بن جائیں۔ وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں، محنت اور مشقّت سے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لئے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشش کریں۔

"آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانے کی ہوا ہمارے خلاف ہے۔ ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل رہی ہیں جن سے پیار اور محبت کی کھیتی مرجھائی جاتی ہے۔ ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنھیں آپ نے اور دوسرے بزرگوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا، اگر سوکھ بھی جائیں تو ان کے بیج برباد نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمارے دلوں میں محفوظ ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ان

سے پھر نئے پودے نکلیں گے اور نہ ہری بلائیں سے بہہ کر مضبوط اور تناور درخت بن جائیں گے۔"

گاندھی جی نے جو جواب دیا تھا اس کا بھی ایک ٹکڑا سُن لیجیے: "اس زمانے میں جب ہندو مسلمان ایک ہوگئے تھے، ایک دوسرے کے لئے اور اپنے وطن کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار تھے۔ میں نے طلبہ کو سرکاری اسکول اور کالج چھوڑنے کی دعوت دی تھی ...... میں اس قابلِ فخر زمانے کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا مجھے نہایت مسرت ہے کہ آپ آزادی اور اتحاد کے اس جھنڈے کو بلند رکھنے کے لئے پوری جاں فشانی سے کام لے رہے ہیں۔ اگرچہ آپ کی تعداد کم ہے لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی بہت کم ہوئے ہیں۔ میں آپ کو یہی نصیحت کروں گا کہ اس قلتِ تعداد کا کچھ خیال نہ کیجیے بلکہ اس بات کو پیشِ نظر رکھیے کہ ملک کی آزادی کا انحصار آپ کے اوپر ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے..... وہ ہیں خدا کا خوف اور انسانوں سے اور ان کے اس مجموعے سے جسے حکومت یا سلطنت کہتے ہیں بے خوف ہونا۔ ان دو چیزوں کی تعلیم اگر آپ کی اس درسگاہ میں نہیں ہوسکتی ہے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کہاں ہوسکتی ہے۔ میں آپ کے پروفیسروں کو خوب جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان چیزوں کی تعلیم ضرور ہوتی ہے۔"

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک جامعہ بڑے پرآشوب طوفانوں میں اپنا مٹی کا دیا جلاتی رہی اور خدا کی قدرت سے بجھنے کا تو کیا ذکر ہے اس کی لَو اور تیز ہوتی گئی۔ جن مشکلوں سے جامعہ کو نبٹنا تھا ان میں سب بڑی دو تھیں۔ ایک ملک کی فضا کا ناسازگار ہونا۔ دوسرے وسائل کی کمی۔ ملک میں اس وقت سیاست کا زور تھا۔ ایک طرف قومی تحریک بدیسی حکومت سے بے تشدد لڑائی لڑ رہی تھی۔ دوسری طرف ہندو مسلمانوں کی فرقہ پرور تحریکیں آپس میں پرتشدد جنگ کر رہی تھیں۔ جذبات کے بہاؤ میں عقل کا تخریب کے سیلاب میں تعمیر کا ٹھہرنا مشکل ہوگیا تھا۔ ان حالات میں جامعہ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں تھیں۔ عام طور پر سبھی ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمان زندگی کا چٹخارا جلسوں، جلوسوں اور نعروں میں پاتے تھے۔ تعلیم اور دوسرے تعمیری کام انھیں پھیکے سیٹھے لگتے تھے۔ جامعہ کی ہمت افزائی کرنے والے کم اور ہمت شکنی کرنے والے زیادہ تھے۔ بہت لوگ جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی جامعہ اور اس کے کارکنوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ کیسے قوم پرست ہیں جو اپنے کو مسلمان یا کیسے مسلمان ہیں جو اپنے

کو قوم پرور کہتے ہیں۔ کچھ لوگ پوچھتے تھے کہ تم پہلے مسلمان ہو پیچھے ہندوستانی، یا پہلے ہندوستانی پیچھے مسلمان اور جب یہ بجائے جواب دیتے تھے کہ ہم پہلے، پیچھے، بیچ میں ہر وقت اور ہر جگہ مسلمان بھی ہیں، ہندوستانی بھی اور انسان بھی تو سمجھتے تھے کہ یہ مذاق کر رہے ہیں یا دھوکا دے رہے ہیں۔
پھر آزادی کی جنگ میں ایسے نازک موقعے آئے کہ جامعہ والوں کا خود بھی جی چاہتا تھا اور ان سے اصرار بھی کیا جاتا کہ جامعہ وامعہ کا قصہ چھوڑو اور بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑو۔ ایسا ہی ایک موقع ۱۹۳۰ء میں آیا۔ گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ نے ہر محب وطن کے دل کو جوش سے معمور کر دیا تھا۔ جامعہ کے کارکن بھی، جن کی رگوں میں خون ٹھنڈا سہی مگر پانی نہیں تھا، قومی جھنڈے کے سائے میں ستیاگرہ کی لڑائی لڑنے کو بے چین تھے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو یہ جانتے تھے کہ قومی تعلیم بھی قومی جنگ کا ایک اہم محاذ ہے، انھیں سمجھایا: "جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصہ لینے کا تعلق ہے جامعہ خود جنگ آزادی کے لئے سپاہی تیار کر رہی ہے۔ لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ الگ اثر ہوتا ہے یہ ہو سکتا ہے، اور میں جانتا ہوں ایسا ہے، کہ ہمارے بعض ساتھی اس تحریک میں شرکت کے لئے بیتاب ہوں۔ انھیں ضرور اس میں شریک ہونا چاہیے لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت کا فرض پہلے سے عائد ہے اس لئے پہلے انھیں جامعہ سے اجازت لے لینی چاہیے تاکہ جامعہ اپنے کام کا انتظام کر لے۔" چنانچہ جامعہ کی اجازت سے سول نافرمانی میں شرکت کا فرض کفایہ حافظ فیاض احمد صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے ادا کیا اور باقی لوگ اس ہنگامہ دار و گیر میں جو سارے ملک میں برپا تھا، اپنے کنج عزلت میں خاموشی سے کام کرتے رہے۔
دوسری مشکل جس کا جامعہ کو مقابلہ کرنا پڑا مالی تھی۔ آپ سن چکے ہیں کہ ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جامعہ کے کارکنوں نے اس کے چلانے کا بوجھ اپنے کمزور کندھوں پر لے لیا تھا اور خرچ کو کم کرنے کے لئے اتنی تنخواہوں پر کام کرنے کو تیار ہو گئے تھے جو بہ مشکل نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے کو کافی تھیں۔ اتنا روپیہ بھی زیادہ تر گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری کی مسلسل توجہ سے اور ذاکر صاحب اور ان کے بعض رفیقوں کی جان توڑ کوششوں سے بہم پہنچتا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد دو تین سال کا

زمانہ، جب بزرگان قوم قید فرنگ میں تھے، جامعہ کے لئے اور بھی سخت تھا۔ مگر یہ سخت جان اسے بھی کسی نہ کسی طرح جھیل گئی۔ آخر ۱۹۳۰ء میں شفیق الرحمن قدوائی مرحوم نے انجمن ہمدردان جامعہ قائم کی اور چند سال میں کبھی ذاکر صاحب، کبھی مجیب صاحب، کبھی خواجہ عبدالحی صاحب کو ساتھ لے کر سارے ملک کا دورہ کر ڈالا اور چار آنے آٹھ آنے مہینہ دینے والے غریبوں سے لے کر سینکڑوں روپے دینے والے رئیسوں تک ہزارہا ممبر بنا ڈالے۔ چندے کی رقم کئی ہزار ماہوار تک پہنچ گئی۔ یہ "ہمدردان جامعہ" بھی سارے ہندوستان میں بلکہ شاید دنیا میں اپنے طرز کا ایک ہی ادارہ تھا۔ اس میں ایسے ممبر بھی تھے جنھیں جامعہ کے مقاصد سے پورا اتفاق تھا، اس کے کاموں کی دل سے قدر کرتے تھے اور جو کچھ دیتے تھے خلوص و عقیدت سے نذر کے طور پر دیتے تھے اور ایسے بھی تھے جو ہمدردان جامعہ کے سفیر کے پہنچتے ہی جامعہ والوں اور ان کے سرپرست قومی لیڈروں کو دل کھول کر بے نقط سناتے اور جب وہ غریب چپ چاپ سنتے سنتے تنگ آجاتا اور اٹھ کر چل دیتا تو پکار کر کہتے ارے بھئی کہاں چلے آؤ ہمارا نام ممبروں میں لکھ لو اور اپنا چندہ لے لو۔ اور اکثر یہ بگڑے دل ہمدرد گالیوں سے کچھ زیادہ ہی چندہ دے ڈالتے تھے۔

مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ جامعہ کی آمدنی میں جو اضافہ ہوا اسے جامعہ والوں نے اپنی برائے نام تنخواہوں کے بڑھانے میں صرف کیا۔ جی نہیں، تنخواہیں تو وہی رہیں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی پچھتر روپے ماہوار اور دوسروں کی اس سے کچھ کم و بیش اور اُسی طریقے سے کبھی ہر مہینے اور کبھی کئی کئی مہینے بعد اکٹھی ملتی رہیں۔ اس طرح اپنا جی مار کر ان لوگوں نے جو روپیہ بچایا وہ جی کھول کر جامعہ کے کاموں کی توسیع میں خرچ کیا۔ چند سال میں ایک طرف تو جامعہ کے پرائمری اسکول اور سیکنڈری اسکول نے کیف و کم دونوں کے لحاظ سے نمایاں ترقی کی اور جدید تعلیمی طریقوں کے کامیاب تجربوں کی بدولت سارے دیس میں بلکہ ایک حد تک پردیس میں بھی شہرت حاصل کرلی اور دوسری طرف چھوٹے پیمانے پر یونیورسٹی کے ٹھاٹھ نظر آنے لگے ——— اپنا چھوٹا سا کالج، اپنا نصاب اپنا امتحان، اپنا تصنیف و تالیف کا شعبہ اردو اکادمی اور اس کا آرگن رسالہ جامعہ، اپنا

پبلشنگ ہاؤس مکتبہ جامعہ، اور اپنا پریس جس کے منیجر آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک گریجوایٹ تھے۔ جنھوں نے جرمنی میں طباعت کے فن میں مہارت حاصل کی تھی۔ اردو اکادمی کی طرف سے علمی کتابیں شائع ہوتی تھیں اور ممتاز ارباب علم ہر سال لکچر دیتے تھے۔ ایک سلسلہ جامعہ کے ایکسٹینشن لکچرز کا تھا جس کے ماتحت ترکی سے حسین رؤف بےنے اور خالدہ ادیب خانم اور مصر سے ڈاکٹر بہجت وہبی لیکچر دینے کے لئے آئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں بیسک ایجوکیشن کے سلسلے میں، جس کی اسکیم گاندھی جی کی رہنمائی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دوسرے ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر بنائی تھی، ہندوستان میں پہلا ٹریننگ کالج جامعہ ہی نے قائم کیا۔ اسی سال شفیق الرحمن قدوائی مرحوم کی ہمت اور لگن سے بالغوں کی ہمہ گیر تعلیم کا ادارہ "تعلیم و ترقی" کے نام سے قائم ہوا جو اُس وقت اُس میدان میں ہراول کی حیثیت رکھتا تھا۔

اسی کے ساتھ ساتھ جامعہ کے فاقہ مستوں نے عمارتیں بنانے کا سلسلہ بھی چھیڑ دیا اور اس میں ہرگز اُس سادگی سے کام نہیں لیا جو وہ اپنے رہن سہن میں برتتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں قرول باغ میں جہاں جامعہ علی گڑھ سے آکر کرائے کے مکانوں میں بسی تھی، تعلیمی مرکز کی پہلی عمارت بنائی۔ ۱۹۳۵ء میں اوکھلے میں بیسیوں بگھہ زمین خرید ڈالی اور ایک بہت بڑے اجتماع میں جس میں خالدہ ادیب خانم بھی موجود تھیں مدرسۂ ابتدائی کے سب سے چھوٹے بچے کے ہاتھ سے مدرسے کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھوایا۔ اردو کے نامور شاعر مرزا ثاقب لکھنوی نے وقت کے وقت ایک شعر کہا تھا۔ اس میں جامعہ کے ان طائران بے بال و پر کی آشیاں سازی کی سچی تصویر ہے جن میں محض ہمت پروانے طاقت پرواز پیدا کر دی تھی۔

محل منعم کے سونے سے یہ خونِ دل سے بنتے ہیں
خس و خاشاک کے یہ گھر بڑی مشکل سے بنتے ہیں

جامعہ کے اُس دور کا جس کا ذکر میں نے آپ کے سامنے کیا نقطۂ عروج نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی سلور جوبلی کا جشن تھا۔ ایسے زمانے میں جب ملک کے کئی حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات

کا زور تھا اور دلی کی فضا بھی بگڑ چکی تھی جامعہ والوں کو سلور جوبلی منانے کی سوجھی اور وہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر کہ سارے ملک سے ہزارہا مہمانوں کو اور عارضی قومی حکومت کے، جو ابھی قائم ہوئی تھی، نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے ارکان کو دعوت دے ڈالی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے زمانے میں اس جنگل میں اتنی بڑی تقریب کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر ہمت مرداں مدد خدا۔ جامعہ کے بے شمار ہمدردوں خصوصاً نواب صاحب رام پور اور ان کے چیف منسٹر بشیر حسین صاحب زیدی کے سہارے، اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اشارے سے جنگل میں منگل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خیموں اور شامیانوں کا ایک شہر بس گیا، اور بجلی کی روشنی سے، جو ایک عارضی لائن کے ذریعے شہر سے لائی گئی تھی منور ہو گیا۔ جوبلی کے شاندار جلسے تین دن تک ہوتے رہے۔ اور خاص اجلاس میں جو نواب صاحب بھوپال کی صدارت میں ہوا جامعہ کے ہزاروں ہمدردوں کے علاوہ، عارضی حکومت کے کانگریسی اور مسلم لیگی ارکان، کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح صاحب جن کا وائسریگل لاج کے علاوہ کہیں اور یکجا ہونا محال تھا۔ ایک پلیٹ فارم پر موجود تھے اور اپنی اپنی زبان میں جامعہ کو مبارکباد اور دعائیں دے رہے تھے۔ کالج کے طلبہ نے اس موقع پر رسالہ جوہر کا جوبلی نمبر نکالا تھا جس میں کئی قومی رہنماؤں کے مبارکباد کے پیام چھپے تھے۔ ان میں سے میں آپ کو پنڈت جواہر لال نہرو کے پیام کے کچھ ٹکڑے سناتا ہوں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ جامعہ نے اپنی پچیس سال کی زندگی میں جو کام کیا تھا اس کی قدر و قیمت ان کی نظر میں کیا تھی۔

"مجھے وہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ یاد آتا ہے جب نان کوآپریشن کی تحریک شروع ہوئی تھی اور میں خاص طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دیکھنے گیا تھا ...... اس وقت میں نے جامعہ پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اسے عدم تعاون کی تحریک کا تندرست اور چونچال بچہ کہا تھا۔ کچھ سال بعد جامعہ دہلی منتقل ہو گئی۔ یہ اس کے لئے بڑا سخت زمانہ تھا اور اسے قدم قدم پر ناموافق حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے پاس ایک چیز تھی جو اس زمانے میں شاید ہی کسی تعلیمی ادارے کے پاس ہو اور وہ تھی مخلص، ایثار پیشہ اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے کارکنوں کی ایک جماعت

جو ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں کام کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے گرم و سرد حالات کے باوجود وہ نہ صرف قائم رہی بلکہ برابر ترقی کرتی رہی اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اس زمانے میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی گئی جسے آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرنی تھی۔ جامعہ بڑھتی رہی ہر میدان میں ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جنھیں پہلے اس کے بارے میں تامل تھا اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے پیش نظر طالب علموں کو محض ڈگریاں دینا نہ تھا بلکہ ان میں ایسے انسانوں کا کردار پیدا کرنا تھا جو اپنی شخصی اغراض سے اونچے اٹھ کر اپنے آپ کو کسی بڑے مقصد کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس نے نظام تعلیم کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نے سب سے پہلے ہندوستان کے تعلیمی اداروں کو یہ راہ دکھائی...... میں تمام جامعہ والوں اور خاص طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص ساتھیوں کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اللہ دعا کرتا ہوں کہ جامعہ بڑھے پھولے پھلے اور ہمیشہ اپنے اصول و مقاصد پر قائم رہے اور اس میں ایسے لائق نوجوان تربیت پا کر نکلیں جو سچے معنی میں ہندوستان کے سپوت کہلانے کے مستحق ہوں اور عوام کی خدمت کر کے ان کو زندگی کے بلند معیار تک پہنچا سکیں۔"

یہ جامعہ کی زندگی کا ایک یادگار موقع تھا۔ اس کے بہت سے چاہنے والے اور کچھ تھوڑے سے نہ چاہنے والے خلوص اور انکسار کے جادو سے کھنچے چلے آئے تھے اور اس کی ناچیز خدمات کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کر رہے تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ جامعہ مصیبت اور ابتلا کے اس دور میں ہر آزمائش میں پوری اتری۔ آپ ابھی یہ سنیں گے کہ اس سے بھی کڑے امتحان میں جو اگلے چند سال میں ہوا، وہ اسی طرح سرخرو رہی اور اسی طرح جشن چہل سالہ میں جو پندرہ سال بعد ہوا اس کے کاموں کو سراہا گیا۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس کا سفر آج بھی ختم نہیں ہوا، ابھی اسے نئی منزلیں طے کرنی ہیں اور نئی آزمائشوں سے گزرنا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

زندگی بڑی شکی گاہک ہے اپنے مال کو بار بار کسوٹی پر کستی اور کٹھالی میں تپاتی رہتی ہے مگر جب تک سونا کھرا ہے ہر بار آزمائش کی آنچ میں تپ کر اور نکھرتا ہے۔ اگر کچھ میل آگیا ہو تو چھنٹ جاتا ہے خالص کندن رہ جاتا ہے۔

جامعہ ۱۹۶۳ء میں

پروفیسر محمد مجیب

حضرت عیسیٰ نے ایک حکایت بیان کی ہے کہ بونے والے نے بیج بکھیرے، جن میں سے کچھ پتھریلی زمین میں گرے اور انھیں چڑیوں نے چگ لیا، کچھ کانٹوں میں گرے اور جب وہ پھوٹے اور ان میں سے پودے نکلے تو کانٹوں نے انھیں پنپنے نہ دیا، کچھ زرخیز زمین میں گرے اور ان سے تندرست پودے نکلے۔ تعلیمی حوصلوں کے بیج قومی زندگی کی زمین پر بکھیرے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بھی یہی پیش آتا ہے۔ جامعہ کی ابتدا کسی ایک حوصلے سے نہیں ہوئی۔ یہ شروع ہی سے حوصلوں کا ایک مجموعہ تھی اور قومی زندگی کی بڑی زمین کے جس ٹکڑے میں اس کے بیج بکھیرے گئے اس میں بھی پتھر تھے اور کانٹے اور زرخیز حصے۔ اس وقت آپ جامعہ میں جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ انھیں زرخیز حصّوں کی پیداوار ہے۔ ہم اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، مگر سوچتے بھی رہتے ہیں کہ یہ پیداوار کافی ہے یا نہیں اور اپنی قسم کی دوسری کھیتوں کی پیداوار سے لگا کھاتی ہے یا نہیں۔

آزادی کے بعد ہمیں کئی مشکل کام دیے گئے۔ دہلی کے شرنارتھیوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مانوس کرنے کی کوشش میں ہم سے پہل کرنے کو کہا گیا۔ ہم نے بارہ ہندو اور میں شرنارتھی اور مسلمان بچوں کو بلایا، انھیں کھیل کھلائے، ان کے ماں باپ کو ان کی خوشی میں شریک کیا۔ اسی سال مارچ میں پینتالیس مصیبت زدہ شرنارتھی مرد عورتوں کو استادوں کے مدرسے میں ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا۔ ہم نے ان کے دل کے زخموں کی مرہم پٹی کی، انھیں اپنایا، کام کے قابل بنا کر کام پر بھجوایا۔ بالغوں کے لیے لٹریچر کی ضرورت تھی۔ ہم نے ہندی میں تین سو کتابچے تیار کیے، حکومت کی ہدایت کے مطابق انھیں مختلف ریاستوں میں بھیجا۔ دشواریوں کے باوجود ہم نے

اپنے ارادے سے نئے کام شروع کئے۔ ۱۹۵۲ء میں ہم نے ریسرچ کے دو انسٹی ٹیوٹ، اور انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن اور نرسری اسکول قائم کئے، مدرسۂ ثانوی کو مڈل پر ہائیر سکنڈری اسکول بنانے کا سلسلہ شروع کیا، اور استادوں کے مدرسے میں بی ایڈ کی تعلیم جاری کی۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ اکثر محسوس ہوا کہ ملک میں ہماری عزت ہے، مگر ہمارے لئے جگہ نہیں ہے، ہم سے لوگ پوچھتے رہیں گے کہ ہم کو حکومت سے امداد کیوں نہیں ملتی، اور ہم اتنے دنوں تک اس سوال کا خاموشی سے جواب دیتے رہیں گے کہ لوگ ہم سے ہمدردی کرنا چھوڑ دیں گے، اس لئے کہ ہمدردی کو بھی کوئی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ امداد ملنے کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں اس میں اضافہ ہوا، ۱۹۵۴ء میں حکومت نے ہمارے خرچ کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ حکومت سے ہم کو اور حکومت کو ہم سے لگاؤ نہ ہوتا، وزارت تعلیم کا ایک ایک افسر ہمارا ہمدرد اور قدردان نہ ہوتا تو ہم اس امداد کو غنیمت سمجھتے اور یہ سوچتے کہ ہماری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ لیکن جامعہ کی ڈگریوں کی حیثیت نہیں بدلی، اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دو برس غور کرنے کے بعد طے کیا کہ جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کا ادارہ نہیں مانا جا سکتا۔ ہمیں امداد ملی تو اس طرح کہ گویا ایک فرض ادا کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی اسی دوران میں بالغوں کی تعلیم سے متعلق ایک ریسرچ سنٹر اور جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ یہ دو ادارے قائم ہوئے، ہم اپنی ترقی کی راہیں نکالنے میں لگے رہے اور ہمارے حوصلے اور ہمارے صبر نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔

ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ حکومت کی امداد ہمیں جلد ملی ہوتی، ہماری ڈگریوں کی حیثیت اس سے پہلے تسلیم کر لی جاتی تو ہم اب تک بہت زیادہ کام کر چکے ہوتے، ہمارے کالج میں ہزار ڈیڑھ ہزار نہیں تو پانچ سو سے اوپر طالب علم ہوتے، اس کا اسٹاف بڑا ہوتا، ہمارے کتب خانہ کی عمارت ہوتی اور کتابوں کی جو کمی اس وقت ہر طرف محسوس ہوتی ہے وہ تعلیم کے لئے ایک اڑنگا نہ بن جاتی۔ مگر حوصلے کے ساتھ صبر نہ ہونے کے ایسے نتیجے دیکھنے میں آئے ہیں کہ شاید یہی بہتر تھا کہ ہماری آزمائش کی مدت کچھ لمبی ہو جائے۔ مجھے اس وقت ہماری تنخواہوں کا خیال آتا ہے

جو بیشتر اس طرح بڑھی ہیں کہ یہ محسوس نہ ہوا کہ آمدنی میں واقعی اضافہ ہوا ہے یا جامعہ کی ملازمت میں کوئی مالی فائدہ ہے۔ تنخواہوں کے ساتھ تعلیمی وسائل میں اضافہ نہیں ہوا۔ ۱۹۵۴ء سے پہلے ہم اپنی پچاس ساٹھ فی صدی آمدنی تعلیم کی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے، باقی تنخواہوں پر۔ سرکاری گرانٹ ملنے کے بعد یہ نسبت بدل گئی، صرف اس وجہ سے نہیں کہ تنخواہوں کی رقم بڑھ گئی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ بجٹ کی جانچ کرنے والوں نے تعلیمی اخراجات میں کچھ کمی کر دی۔ اس وقت وسائل مل جانے کے باوجود کچھ برا نہ ہوگا اگر چند سال تک ہم پر یہ خیال حاوی رہے کہ تعلیمی خرچ کے لئے روپیہ بہت مشکل سے ملتا ہے، اس لئے بے سوچے سمجھے مانگنا اور بے پروائی سے خرچ کرنا مناسب نہیں ہے، اور اس خیال کی وجہ سے ہماری نظر کاموں پر رہے اور ہم وسائل کے محتاج نہ بن جائیں۔

مجھے اصل خوف اس کا ہے کہ وسائل ملنے کے بعد جو مطالبے ہم سے کئے جائیں گے یا جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوں گی انھیں ہم اس طرح پورا نہ کر سکیں گے کہ ہماری امتیازی حیثیت باقی رہے۔ بیشک ہم نے اب تک شوق اور محنت سے کام کیا ہے، مگر جانچ کرنے والوں نے ہماری مجبوریوں کا بہت لحاظ بھی کیا ہے، ہماری خوبیوں کو سراہا ہے تو ہماری خامیوں سے چشم پوشی بھی کی ہے۔ اس کے بدلے میں اب ہماری جانچ نئے انداز سے کی جائے گی، ہم میں خامیاں نظر آئیں گی تو کوئی کہے گا کہ ہم چھوٹے آدمی تھے، چھوٹا ہی کام کر سکتے تھے، کوئی کہے گا کہ دراصل ہم میں اور ان یونیورسٹیوں اور استادوں میں جن کی نقلیں سارے ملک میں کی جاتی ہیں کوئی فرق نہ تھا، اور اچھی تنخواہیں اور عمارتیں ملنے پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی ہے۔ ہم سے سب سے زیادہ امیدیں ہمارے دوستوں اور ہمدردوں کو ہوں گی، اور یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں تو سب سے زیادہ مایوسی انھیں کو ہوگی۔ مشکل یہ ہے کہ یہ امیدیں کبھی بیان نہ ہوں گی، ہمارے دوستوں اور ہمدردوں کے دلوں ہی میں رہیں گی۔ اب ہمیں مشورہ تو مل سکے گا، مگر یہ طے کرنے کی ذمہ داری ہمارے ہی اوپر رہے گی کہ ہمیں کیا کیا کرنا چاہئے اور کس طرح کرنا چاہئے۔

جامعہ ملیہ کا مقصد صحیح اور سچی قومی تعلیم کا نقشہ اور نمونہ پیش کرنا تھا۔ یہ ایسا مقصد نہیں ہے جو کسی وقت بھی پورا پورا نظروں کے سامنے آسکے، ہم دراصل وہ تعلیمی کام کرتے رہے ہیں۔ جو مفید تھے اور جنھیں انجام دینا ہمارے بس میں تھا۔ ہماری خصوصیت شاید یہ تھی کہ ہم سمجھتے رہے کہ یہ طے کرنا ہمارا فرض ہے کہ کون سے تعلیمی کام مفید ہیں، اور اسی وجہ سے ان کی ذمہ داری لینے میں ہم نے اپنی مشکلوں اور مجبوریوں کا خیال نہیں کیا۔ اب ہمیں نئے سرے سے اس پر غور کرنا چاہیئے کہ صحیح اور سچی تعلیم کیا ہے اسے قومی رنگ کیسے دیا جاسکتا ہے، اور جامعہ کس طرح اس کا نقشہ اور نمونہ پیش کر سکتی ہے۔ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں، میں بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا اصل مقصد صرف اس صورت سے پورا ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ سوچیں اور کریں اس میں ہمارا محرک یہ احساس ہو کہ ہمیں ان تین بنیادی سوالوں کا جواب دینا ہے، ورنہ تعلیم کا مطلب نصاب کے مطابق پڑھانا اور قاعدے کے مطابق امتحان لینا ہوگا، اور یہ ایسا طریقہ ہے جس میں تعلیم کے صحیح اور سچے ہونے کا سوال نہیں اُٹھتا، صرف امتحان کے نتیجے دیکھے جاتے ہیں، قوم کا ذکر دو چار مرتبہ تقریروں میں کر دیا جاتا ہے، اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ تعلیمی ادارہ جیسا بھی ہو، اسے ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

اس سوال کا جواب کہ صحیح اور سچی تعلیم کیا ہے صرف اچھا اور سچا استاد دے سکتا ہے۔ ہم کو بہت سی کتابوں میں ایسے استاد کی شخصیت کے خاکے مل جائیں گے۔ گویا بہت سی خوبصورت مورتیاں بنی ہیں جنھیں دیکھ کر ہم اپنی صورت شکل درست کر سکتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ حسن ہوتا ہے تو اپنا ہی ہوتا ہے، مانگا یا چرایا، یا نقل کر کے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اپنی کسی اچھی عادت کے بارے میں کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے فلاں کو دیکھ کر اور اس سے اثر لے کر اختیار کیا ہے وہ دراصل یہ کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں ایک خوبی تھی جس کا انھیں احساس کسی دوسرے شخص کی وجہ سے ہوا۔ میں ان لوگوں کو جو میری طرح دفتر میں نہیں بیٹھے رہے ہیں، بلکہ اپنے علم کو طالب علموں تک پہنچانے میں مسلسل لگے رہے ہیں اور اس کے ساتھ جو دکھ سکھ وابستہ ہے اسے سہتے رہے ہیں،

نصیحت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، بس ان سے یہ یاد رکھنے کی درخواست کر سکتا ہوں کہ اچھا اور سچا استاد بننا بہت مشکل ہے، کیونکہ ایسے استاد کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ خود اچھا اور سچا آدمی ہو، اسے عالم ہونا چاہیئے، تعلیم کو ایک فن کی طرح برت سکے اور اپنی شخصیت کو تعلیم کی مصلحتوں اور ضرورتوں کے مطابق ڈھال سکنا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں ہزاروں اچھے اور قابل استاد ہوں گے جنھیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ انھیں ایسی نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ ان کا ہر طالب علم سمجھے کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں، لاکھوں ایسے استاد ہوں گے جو طالب علم کی ہمدردی میں کوشش کرتے ہیں کہ علم حاصل کرنا آسان کر دیں۔ کسی استاد کو کتابی علم کی زیادتی طالب علموں سے دور کر دیتی ہے، کوئی اپنا علم ناپ کر بس اتنا ہی رکھتا ہے جتنا کہ کلاس کو اطمینان سے پڑھانے کے لئے درکار ہو۔ دل اور دماغ کو بے چین کرنا، حقیقت کی تلاش میں بے تاب کرنا، رات کے اندھیرے میں صبح کی امید دلانا، دل کی روشنی میں تاریکی کے امکان سے ڈرانا، یہ اب استاد کے کام نہیں سمجھے جاتے، اور شاید کوئی سوچتا بھی نہیں کہ انھیں تعلیم سے نکال دیجئے تو پھر نصاب اور امتحان کی غلامی کے سوا کیا باقی رہتا ہے۔

میں کئی سال سے جامعہ کے استادوں کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تجربے کرنا اور نئے طریقے برتنا کافی نہیں ہے، انھیں ان تجربوں اور طریقوں کو رسالے اور کتابیں لکھ کر محفوظ کر لینا اور علمی دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ اب تک میری نظر میں بیشتر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مسائل تھے، اب کالج، استادوں کے مدرسے اور آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے تعلیمی مسائل بھی ہیں۔ ہمارا ایک فرض سا ہو گیا ہے کہ ہر مضمون پر جو جامعہ میں پڑھایا جاتا ہے اردو ہندی میں ایسی کتابیں لکھیں جن کا مقصد ان زبانوں پر احسان کرنا نہ ہو بلکہ جو دنیا کے علمی معیار پر پوری اترتی ہو۔ ہمارے کام کو سند نہیں مانا جائے گا اگر ہم انگریزی میں لکھنے سے معذور رہے، اس لئے جامعہ سے انگریزی میں بھی معیاری کتابیں شائع ہونی چاہئیں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ لکھنے والا کتاب لکھ کر بیچ جائے، اب اچھی کتاب آسانی سے چھپ سکتی ہے اور بک سکتی ہے۔ اب ہم اپنے اس عقیدے پر پوری طرح عمل کر سکتے ہیں کہ پڑھے لکھے ہندوستانی کو اردو، ہندی، انگریزی تینوں

زبانیں بے تکلفی سے بولنا اور لکھنا چاہیئے، اور اردو ہندی کے جھگڑوں کو اس طرح ختم کر سکتے ہیں کہ بیان کا ایک طرز اختیار کریں جو علم کی شرطوں کو پورا کرے اور قابل قبول بھی ہو۔

گر یہ ہمارے کام کا صرف ایک حصہ ہے۔ اس سے ہماری تعلیم میں خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں، ہم علم کی خدمت کر سکتے ہیں، قومی تعلیم گاہ کہلانے کے مستحق ہم تبھی ہوں گے جب قومی زندگی کا ہر پہلو اور ہر بڑی ضرورت ہماری نظر میں ہو۔ ہمارے ملک میں مذہبی تعصب اب تک موجود ہے، ایک سلگتی آگ کی طرح جس کے شعلے کسی وقت بھی بھڑک سکتے ہیں، زبان اور نسل کے پیدا کئے ہوئے تعصب موجود ہیں، ان کی شدت ہم آسام اور بمبئی میں دیکھ چکے ہیں، ذات پات کا خیال اس طرح حاوی ہے کہ بعض ریاستوں میں وزارت نہیں بن سکتی جب تک کہ اس میں ہر ذات کے لوگوں کی کافی نمائندگی نہ ہو، اور بہت سے حلقوں میں شہریوں کا نمائندہ وہی چنا جا سکتا ہے جس کی ذات کے لوگوں کی اس حلقے میں اکثریت ہو۔ بھلے آدمی ایسی ناگوار باتوں کا ذکر افسوس کے ساتھ کرتے ہیں، اور ان کے دلوں میں یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ ان کا چرچا ہوا تو فساد بڑھے گا، استاد قومی زندگی کے ان عیبوں سے واقف ہیں، مگر ان کی اصلاح کرنا استاد اور تعلیم کا منصب نہیں سمجھتے۔ ہم بھی کچھ زیادہ نہیں کر سکتے، لیکن تعلیم کے سلسلے میں اپنے طالب علموں کو مختلف طریقوں سے ان قومی خطروں کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، اور رفتہ رفتہ جامعہ میں ایسی فضا اور ایسی ذہنیت پیدا کر سکتے ہیں کہ تعصب کی بیماری پھیل نہ سکے۔

لیکن ایسی ذہنیت پیدا کرنے میں ہمیں دشواریاں بھی پیش آئیں گی، اس لئے کہ آج کل ہر طرف رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں اور استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی جیسے ٹوٹ سا گیا ہے۔ دوسروں کا لحاظ کرنا چاہیے وہ اپنے ہوں یا غیر، برابر کے یا بزرگ اس طرح بات کرنا کہ دوسرے پر اچھا اثر پڑے، طبیعت کو قابو میں رکھنا، چاہے کوئی غصہ دلانے والی بات کرے، یہ قاعدے آج کل کی تربیت اور تعلیم میں شامل نہیں سمجھے جاتے، یونی ورسٹیوں میں طالب علموں کا ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر ہنگامے کرنا کوئی عجیب یا انوکھا واقعہ نہیں مانا جاتا۔ جامعہ ایک ایسے دور سے صحیح سلامت گذر چکی ہے جب حکومت اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتی تھی، حکومت سے واسطہ رکھنے والے مسلمان اس سے ڈرتے تھے، ہندو اسے مسلمانوں

کا ادارہ سمجھ کر اس سے الگ رہتے تھے۔ پھر ایک دور آیا جب مسلمان اسے کانگریسی ادارہ سمجھتے تھے اور چند ممتاز لیڈروں کے سوا کانگریسی اس کے رویے سے مطمئن نہ تھے۔ اس دور میں جامعہ کو ہمت اور سچائی نے برقرار رکھا لیکن اب اس نئے دور میں جو جمہوری کہلاتا ہے صرف جامعہ ہی نہیں بلکہ ہر تعلیم گاہ کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ صرف غرض کا رشتہ صحیح اور قائم رکھنے کے قابل مانا جاتا ہے۔ ترقی کی غرض استاد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے، اور جگہ نہیں بدلتی تو بھی استاد اور یونیورسٹی کا رشتہ غرض کا رشتہ ہوتا ہے۔ طالب علم داخلہ لیتا ہے تو ڈگری لینے کی غرض سے، علم حاصل کرنے کے شوق میں نہیں، اور جس بات کا امتحان اور ڈگری سے تعلق نہ ہو اس سے اسے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا۔ تہذیب انھیں غیر ضروری چیزوں میں سے سمجھی جاتی ہے، اس کے خریدار کم ہیں اور اندیشہ ہے کہ کم ہوتے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیم کو تہذیب سے الگ کیا گیا تو وہ ایک کاروبار، ایک دھوکا بن کر رہ جائے گی، لیکن تعلیم کو تہذیب سے وابستہ وہی استاد رکھ سکتے ہیں جو تہذیب کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں جو اپنی محنت کا طالب علم سے معاوضہ نہ مانگیں، جو ایسے طالب علموں سے بھی محبت اور شفقت برتیں جو ان کی عزت نہیں کرتے یا اگر کرتے ہیں تو اس طرح کہ اس کا احساس نہیں ہوتا۔

جامعہ کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہاں استاد اور شاگرد کا رشتہ اب تک قائم ہے یہی نہیں، بلکہ جامعہ چھوڑنے کے بعد یہ رشتہ قائم رہتا ہے، اور رفتہ رفتہ جامعہ کی ایک تعلیمی امت بن رہی ہے۔ اس امت میں ہر طبقے، ہر مذہب، ہر پیشے کے لوگ ہیں۔ ابھی تک جامعہ کی طرف سے ان پرانے طالب علموں سے جامعہ کے اخلاقی اور تہذیبی تصورات کا پرچار کرانے میں مدد لینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے، مگر مجھے پوری امید ہے کہ یہ کوشش سلیقے اور استقلال کے ساتھ کی گئی تو بہت بارآور ہوگی۔ تاسیس کے جلسے میں کئی مرتبہ نئے طالب علموں نے جامعہ کی زندگی کے بارے میں جو خیال ظاہر کئے اس سے یقین ہوتا رہا ہے کہ اخلاق اور تہذیب کا برا بھلا نقشہ جو یہاں نظر آتا ہے وہ بھی تسلی اور ہمت افزائی

کے لئے کافی ہے۔ ہمارے اوپر فضا کا اثر ہوتا ہے کوئی سال اچھا ہوتا ہے کوئی نہیں ہوتا، لیکن جب حساب لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حوصلوں کی شادابی کم نہیں ہوئی ہے۔

اس سال جامعہ کے کئی ہمدرد انجمن، مجلس منتظمہ اور مجلس تعلیمی کے رکن بن کر ہمارے بہت قریب آگئے ہیں بلکہ ایک نے خازن کا صبر آزما کام اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پندرہ برس کے بعد اس سال سے امیر جامعہ کا عہدہ قبول کرکے وہی شخصیت ہماری سرپرست بن گئی ہے جس نے جامعہ میں قومی تعلیم کو منصوبوں اور اداروں کی شکل دی، ہمیں فاقہ مستی کے آداب سکھائے، اور علم، اخلاق اور مروّت کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ جامعہ کی امکانی عظمت کا نقشہ آنکھوں میں پھرتا رہا۔

میں جامعہ کی برادری کو یوم تاسیس کی مبارک باد دیتا ہوں۔

مُغلیہ زمانے میں ہندو مُسلم برتاؤ اور تیوہار

جناب جنگ بہادر سنگھ

(پیش نظر مضمون میں شری جنگ بہادر سنگھ نے جو جامعہ کے قدیم طالب علم ہیں مغلیہ زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں میٹھے اور محبت سے لبریز آپسی تعلقات کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ نئے ہندوستان کی تعمیر میں ہمیں اس طرح کے تعلقات کی بیحد ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اسے قائم کرنے میں ہمارے ادیب بہت ہی اہم حصہ لے سکتے ہیں، اور قومی تعمیر کے کام میں ان کی خدمات بیش قیمت ثابت ہوسکتی ہیں۔ موصوف نے یہ مضمون آزادی سے پہلے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ جناب شیام سروپ شرما استاد جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ نے دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کی ایک ہندی کی کتاب سے کیا ہے۔ ترجمے میں مضمون نگار کے انداز بیان کو زیادہ سے زیادہ باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے)۔

مغلیہ زمانے میں ہندو مذہب اور اسلام کے لپٹ چپٹ کر ملنے سے جو ملی جلی تہذیب بنی، اس کا جلوہ اس ملک کی ہوا، مٹی اور پانی میں ظاہر ہوا۔ اس وقت نہ ریل گاڑیاں تھیں اور نہ ریلوے اسٹیشن ہوتے تھے۔ نہ پیاسے مسافروں کی پیاس بجھانے کے بجائے پانی کے بچھوے گھڑے چھلک چھلک کر کہتے تھے 'ہندو پانی، مسلم پانی'۔ تب پالکیاں چلتی تھیں یا چنڈول چلتے تھے، دونوں ہی آدمیوں کے کندھوں پر چلتے تھے، یا ہاتھی کی جوڑی، ورنہ اونٹ کی کبڑی پیٹھ پر انباریاں چلتی تھیں جن میں سوار ہو کر لوگ منزل پر منزل پار کرتے تھے۔ سپاٹے بھرنے کے لئے تیر سے بھی تیز دیہ گئے، وہ گھوڑے استعمال کئے جاتے تھے۔ عورتیں بھی گھوڑسواری کرتی تھیں۔ ازبک اور تاتاری عورتیں جو سفر میں مغل بادشاہوں کے حرم کی حفاظت کے لئے متعین ہوتی تھیں، پکی گھوڑ سوار ہوتی تھیں۔ راجپوت

عورتیں بھی گھوڑے پر سوار ہو کر ہوا سے باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ سواریوں میں ہی نہیں، کچھ لباسوں میں بھی مغلوں کے زمانے میں، اسی طرح کی ہندو مسلم یکسانیت ہو گئی تھی کہ دو چار کو چھوڑ کر باقی کی پرکھ مشکل تھی کہ کون ہندو پوشاک ہے اور کون مسلم۔ فارس جہاں سے مغل آئے تھے۔ ڈھیلم ڈھال کپڑوں کا گھر تھا۔ ہندوستان میں مغلوں نے بدن سے چپکے ہوئے کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ جسم کی تراش کے ساتھ کپڑے کی کاٹ چلنے لگی۔ راجپوتوں اور مغلوں کے کپڑے اور زیورات وغیرہ دیکھ کر ایک دم یہ بھی کہنا مشکل تھا کہ کون راجپوت رانی ہے اور کون مغل ملکہ۔

میں نے آج کل کے ریل کے مسافروں اور ہندو پانی اور مسلم پانی سے بات شروع کی، پھر مغلیہ زمانے کے گھوڑ سوار مسافروں کے پاس پہنچ کر بھٹک گیا۔ اس زمانے میں مسافروں کو، ایسے مسافروں کو جن کے حلق اور زبان پر پیاس کے کانٹے اُگ آئے ہوں، پیاس بجھانے اور تسکین حاصل کرنے کے لئے پنگھٹ کی پناہ لینی پڑتی تھی۔ وہاں کنوؤں سے ہندو پانی اور مسلم پانی کی گونج نکل کر فضا کو زہریلا نہیں بناتی۔ وہاں پاک دامن خوب صورت دوشیزاؤں کی دلفریب مہمان نوازی میں جو وہ اپنے فراخ کلسوں سے ڈھلکا ڈھلکا دیتی تھیں، سب تفرقات ڈوب جاتے تھے۔ اس مطلب کی ترجمانی کرنے والی، مغلیہ زمانے کی ملی جلی زندگی کی ایک زندہ جاوید تصویر لاہور کے میو سکول آف آرٹس کے پرنسپل خانصاحب میاں محمد حسین کے پاس ہے، جو تقریباً تین سو سال پرانی ہے اور اس وقت اور اس سے کچھ پہلے کے رکھ رکھاؤ کی ایک جھلک ہمیں اس میں دکھائی دیتی ہے۔ دُور ایک پہاڑی کے دامن سے لگی ہوئی مسافروں کی ایک لین دوڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شہزادی پالکی میں مرنے میں بیٹھی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس کے نوکر اور محافظ پیدل اور گھوڑوں پر اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ جو ذرا نزدیک کی پہاڑی ہے اس کے پاس ایک سفید گھوڑے پر ایک رانی سی اور ایک مشکی گھوڑے پر ایک راجا جیسا شخص ہے، بالکل نزدیک ایک پیارا پنگھٹ ہے۔ یہ پنگھٹ کا نظارہ ہی اس تصویر کی جان ہے۔ پنہاریاں یا منہاریاں کنوئیں کے بیچنے پر جمی ہیں اور کچھ کھڑی ہیں۔ ہر ایک ایسی ہے جیسے خوبصورتی کے رس سے بھری ہوئی سونے کے کلس جیسی

کے چہروں سے پاک اور سادہ زندگی کی بے خوبی اور پاکیزگی ٹپکتی ہے۔ سب کی سب ہندو شہری معلوم ہوتی ہیں۔ پاس ہی ایک چنچل گھوڑے پر سوار ایک نوجوان کھڑا ہے۔ وہ کوئی مسلمان شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ عزت دار مسافر کے چہرے سے اس کے کردار کی بلندی صاف ٹپک رہی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مانگ رہا ہے۔ اس تصویر کی پنہاریاں یوں کہتی سی معلوم ہوتی ہیں — "کیوں جناب، کیا پانی چاہیئے؟ ٹھہریئے، ٹھنڈا پانی بھی ملے گا اور میٹھی محبت بھی ملے گی"۔ اس زمانے کی یہ کیسی عمدہ تصویر ہے! موجودہ زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک ضروریات کو جب ہماری آنکھیں تلاش کرتی ہیں تو وہ ہندو پانی اور مسلم پانی کے گھڑوں کا اکھاڑہ دیکھتی ہیں، جہاں وہ کم بخت گھڑے ٹکراتے ہیں اور ٹوٹتے ہیں۔

مغلیہ حکومت کی مشعل ابھی اچھی طرح روشن بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہندو مسلم محبت کی تیز دھار نے راجپوتانے کی ریگ کو تر بتر کر دیا۔ ایک مصیبت زدہ راجپوتنی کی راکھی منظور کر کے ہمایوں نے بہن بھائی کی پریت کی ریت دل و جان سے نبھائی۔ وہ ہندو نشان مسلم شان بن گیا۔ اگر ان دنوں کی ہندو مسلم تہذیب بغیر ٹوٹے پھوٹے، پھلتے پھولتے ہوئے آج تک چلی آتی تو ہندوؤں اور مسلمانوں کا آج بھی وہی راکھی والا پیار کا رشتہ قائم ہوتا۔ انفرادی برتاؤ ہی میں نہیں سماجی تیوہاروں میں بھی مغل بادشاہوں نے ایسی مثالیں سماج کے سامنے پیش کیں جو مستقبل کی راہوں کو پُر نور کرنے والی مشعلیں بن گئیں۔ مغل بادشاہ جس تپاک، خلوص اور ہنسی خوشی سے مسلم تیوہار میں حصہ لیتے تھے۔ اسی جوش و خروش اور پیار و محبت سے ہندو تیوہاروں میں بھی شامل ہوا کرتے تھے۔ اکبر تو بیچارے تعصب کی ایسی دنیا میں جہاں نہ کبھی آزاد خیالی کی ہوا لگتی ہے اور نہ علم کی روشنی پھیلتی ہے، اپنی مذہبی دریا دلی کے لئے بدنام تھے۔ اور بدنام ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں کی ایسی بدنامی ہی انسانیت کو نکھر جبین دینے والے تمدنی رشتے کا سنگِ بنیاد ہوتی ہے۔ لیکن اکبر ہی نہیں اس کے لڑکے جہانگیر بھی — جنہوں نے مختلف مذہبی اصولوں کو ملا کر اپنی مرضی کے مطابق ان کا عرق نکالنے کی کوشش نہیں کی — ہندو

تیوہار بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام سے مناتے تھے۔ انھوں نے تزکِ جہانگیری میں لکھا ہے —— 'سینچر کو دسہرہ پڑا۔ اس روز شاہی گھوڑے خوب سجائے گئے اور ان کا شان سے جلوس نکالا گیا...... ' تیوہار کی دلچسپی کی طرح جہانگیر کا دلچسپ بیان چلتا ہے۔ دسہرے کی کی ہی نہیں دیوالی کی بھی مغل بادشاہوں کی زندگی میں اونچی جگہ تھی۔ شاید ہر سال کی گردش پوری ہونے پر ان کے بلند حوصلوں سے دیپ مالائیں جھم جھم چمک کر ہندو مسلم تمدنی دوستی کی روشنی پھیلاتی تھیں۔ پرانی مغل تصویروں کو ہوشیاری سے محفوظ رکھنے والی دہلی کی انٹرنیشنل شوگر کمپنی کے پاس ایک غیر معمولی تصویر ہے، جس میں نور جہاں بیگم دیوالی مناتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ تصویر پرانی ہے، اورنگ زیب کے وقت کی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی دیوالی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائی جاتی تھی۔ نورجہاں مصوّر کے سامنے چاہے منہ کھول کر نہ آئی ہوں، اُن کا عکس بھلے ہی خیالی ہو، لیکن دیوالی ضرور اس کے سامنے لاتعداد رُوپ بن کر آئی، اس کی مصوری سچی ہے۔ مغل بادشاہ اور ملکہ یہ پُرفریب تیوہار دل کھول کر منایا کرتے تھے۔

لندن کے چیسٹر بی ٹی کے تصاویر کے بیش قیمت مجموعے میں، جو شاہجہاں کے البم سے لی گئی ہے، ایک ایسی دل کو گدگدانے والی تصویر ہے جس میں جہانگیر کو رنگ محل میں ہولی کی رنگ رلیوں میں مست پیش کیا گیا ہے۔ وہ تصویر قابلِ دید ہے۔ اُس میں جہانگیر دیکھتے ہی پہچانے جاتے ہیں، چہرے میں ہندوستانیت زیادہ اور تیموریت کم، کان میں موتی، پگڑی پوشاک دونوں ہندوستانی۔ اغل بغل سامنے ہندو اور مسلمان لڑکیوں کا چھوٹا سا، پر بڑا شرارتی میلا، دو ہی لڑکیوں کے بارے میں پوری طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ کیونکہ ان کے سروں پہ ترکی ٹوپیاں جلوہ دکھا رہی ہیں۔ اور بھی مسلمان لڑکیاں اس چلبلے جھنڈ میں ہوں گی لیکن ان کو پہچانا کیسے جائے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں کی پوشاک اور زیورات میں کوئی فرق رہ گیا ہو تب تو ان کے ذریعے سمجھا جائے کہ کون کون ہے؟ سب نے یا تو کرتیاں پہن رکھی ہیں یا انگیا اور لہنگے

کہتے ہیں کہ انگیا اور لہنگوں کی بہار مغلوں نے راجپوتوں میں دیکھی اور وہ ان کے دلوں پر کچھ ایسی چھا گئی کہ مغل محلوں میں انگیا کسکنے اور لہنگے لہرانے لگے۔ تصویر میں ان کی کسکن اور لہردن کے ساتھ ہولی کے جوبن کا چڑھاؤ دکھایا گیا ہے۔ جہانگیر کے ایک طرف ایک لڑکی ہے اور دوسری طرف دوسری اور آنگن میں طرح طرح کے رنگوں کی پچکاریاں چل رہی ہیں۔ رنگ برنگ ابیر اور گلال کی مٹھیاں کھل رہی ہیں۔ ایک حسینہ لوچ کی کمان بنی پچکاری چلا رہی ہے۔ دوسری ویسی ہی بنی پچکاری بھر رہی ہے۔ تیسری، چوتھی، پانچویں..... شرارت کی پڑیا بنی ہوئی سہیلیوں کے کپڑے رنگوں سے رنگ رہی ہیں۔ سفید چاندوں کو لال، نیلے چاند بنا رہی ہیں۔ پاس ہی ہولی کی ترنگ کے ساتھ ساز و سنگیت چل رہا ہے۔ ایک دوشیزہ دف بجا رہی ہے اور دو تین حسین خواتین چنگ بجانے میں مشغول ہیں۔ جس ملک کی ہولی ہے اس ملک کے یہ دونوں ساز نہیں ہیں۔ لیکن مزا یہ ہے کہ اس کے ساتھ چل خوب رہے ہیں۔ جہانگیر وغیرہ مغل بادشاہوں نے اس طرح تمدنی مرکب سے محبت کا جو امرت پیدا کیا ہے اُسی سے آج کل کے ہندوستانی سماج کی سوکھتی زندگی کو تراوٹ مل رہی ہے۔

تزک جہانگیری میں مغل شہنشاہ نے اپنے والد کی چلائی ہوئی ایک ایسی رسم کا ذکر کیا ہے جس میں مسلمانوں کے جذباتی جوش کی نازکی اور مذہبی خوشی کے ساتھ ہندوؤں کے اہنسا کے اصول کی نہایت خوبصورت آمیزش ہوئی ہے۔ ہر سال ربیع الاول کی ۱۸ویں تاریخ سے جو اس کی تاریخ پیدائش تھی مسلسل کئی دن تک جانوروں کو ذبح نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے جمعرات اور اتوار کو ــــــ دو دن کہیں کوئی قربانی نہیں کر سکتا تھا۔ اس رسم کی سیاسی اور سماجی اہمیت جو تھی، وہ تو تھی ہی، اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی بہت قیمتی تھی۔ جہیں دودھ گھی سونگھنے کو مشکل سے ملتے ہیں۔ ہمارے بزرگ دودھ میں نہلاتے اور گھی کے چراغ جلاتے تھے۔ کتنا روشن اور پرنور تھا یہ ہندو مسلم تمدن، خیرات کا رواج اسلام کے ساتھ اس طرح چپا ہے جس طرح ہندو مذہب کے ساتھ۔ تُلادان کی پرانی ہندو رسم کو مغل بادشاہوں نے دربار کے جشنوں وجلسوں کا ایک خاص حصہ بنا کر اصول کے لحاظ سے کوئی نئی بات نہیں کی۔ لیکن اس سے انھوں نے ہندو مسلم تمدنی دوستی پر غیر فانی شاہی مغل مہر لگا دی۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک ہر ایک مغل بادشاہ تُلادان کا جشن منایا کرتے تھے۔ ریشم کی ڈوریوں والے سونے کے ترازو میں خاص خاص ملک

بیٹھ کر وہ خود کو سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات وغیرہ سے تلواتے تھے اور لاکھوں روپے دولت سادھو سنتوں اور غریب غربا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ وہ لوگ تلادان منانے کے لئے بہانوں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ کوئی دعوت یا ضیافت کا موقعہ آیا نہیں کہ تلادان ہوا نہیں۔ نوروز کے موقعے پر جو تلادان ہوتا تھا وہ پرشین چو کھٹے اور شیشے میں جڑی ہوئی ہندوستانی تصویر سا لگتا تھا۔ یوں تو بہت ہی پرانی پوتھیوں کی کہانیوں کے مطابق ایرانی نئے سال نوروز کی ابتدا میں بھی ہندوستانی اثر پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جمشید جنھوں نے نوروز چلایا اور کوئی نہیں ہندو کہانیوں میں پائے جانے والے وہی یم راج تھے۔ جب ایران میں نوروز منانے کا رواج چلا تب لوگوں کی خوشی رنگین، خوشبودار پانی کے فوارے بن کا رنگ اور چمک کی آتش بازی بن کر چھوٹی۔ نوروز کیا ہوتا تھا، ایرانیوں کی ہولی دیوالی ایک ساتھ ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر رنگدار پانی ڈالتے تھے اور روشنی اور آگ کے تماشے کرتے تھے۔ جب اسلام ایران میں آیا تو اس نے ایران کو عیدالفطر اور عیدالضحیٰ دیا اور ایران کا نوروز اپنا لیا۔ اسلام نے نوروز کے موقعے پر نہ جانے کتنے سال اپنی آنکھوں کے سامنے خوشی سے ہولی دیوالی ہوتے دیکھی۔ لیکن جب خلیفہ معتضد باللہ نے یہ دیکھا کہ رنگ کھیلنے کے بہانے لوگ بیوقوفیاں کرتے ہیں اور گندگی پھیلاتے ہیں اور آتش بازی ایسی خطرناک لاپرواہی سے چھوڑتے ہیں کہ لوگوں کی جان جوکھم میں پڑ جائے تب انھوں نے رنگ کھیلنا اور آتشبازی چھوڑنا مذہب کے خلاف قرار دے دیا۔ ویسے اسلام تنگ نظر نہیں۔ آخر اس نے عیدالضحیٰ کو جسے پہلے سے ہی مکّہ کے حاجی مناتے آئے تھے، فوراً اپنا لیا تھا۔ حضرت محمدؐ نے بغیر ہچکچائے قربانی کے تیوہار کو جائز قرار دے دیا تھا۔ ویسے تو عیدالفطر ہی جو لمبے برت کا تیوہار ہے اصل مسلم تیوہار ہے۔ شب برات منانا چھوٹی موٹی دیوالی منانے کے برابر ہے۔ اُسے منانے میں مسلمان لوگ خلیفہ معتضد باللہ کے نوروز والے حکم کو بھلا کر دنادن پٹاخے داغتے ہیں، چھرچھیا نار چھوڑتے ہیں اور شُوں شُوں چھچھوندریں دوڑاتے ہیں۔ شب برات ہندوستان کی دیپ مالا سے سنوری ہوئی تہذیب میں خوب ہی کھپ گیا۔ اور عید بھی ہندوستان کی برت دھاری زندگی میں آسانی سے سماگئی۔ مغلیہ زمانے میں عید، شب برات، نوروز، بسنت، ہولی، دیوالی، شیوراتری، دسہرہ وغیرہ بادشاہ اور رعایا سب بہت محبت اور مزے سے مناتے تھے۔

خلیفہ معتضد باللہ نے جب کہا کہ رنگ نہ کھیلو تو ان کا یہ مطلب تھا کہ اصولوں کی بلندیوں سے گر کر اپنا منہ کالا نہ کرو۔ اگر سبھی ہندو اور مسلمان بھائی چارے اور بھناپے کے رنگ میں ڈوب کر سرخ رو ہو جائیں تو خلیفہ صاحب کی روح انھیں بخوشی دعائیں دے گی۔ وہ چراغ جس سے ہندوستان میں آگ لگے، نہ سچے مسلمان کو پسند آئے گا اور نہ سچے ہندو کو۔ مغل بادشاہوں نے دیوالی کے موقع پر ہندو و مسلم تمدن کا وہ چراغ روشن کیا کہ جس سے ہمارا راستہ آج تک روشن ہے۔ اُسے بجھا دیں تو یہ ہماری بہت بڑی بیوقوفی ہوگی۔ مغل بادشاہوں نے عید کے موقع پر ایسی سینوئیاں بانٹیں کہ جس سے ہمیں آج بھی طاقت اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ہم من مانا ؤ کے بچھو کے ڈنک اور دشمنی کے سانپ کے پھن ملا دیں تو یہ ہمارا خطرناک پاگل پن ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی
کے باہمی تعلقات اُن کے خطوط کی روشنی میں

عبداللطیف اعظمی

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے خطوط بنام مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ابھی ابھی شائع ہوئے ہیں۔[1] مشاہیر کے خطوط کو، چاہے وہ نجی ہوں یا ادبی اور علمی، آج کل بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ اہمیت پہلے بھی تھی مگر صرف اہم اور مشہور ادیبوں کے خطوط شائع کئے جاتے تھے اور وہ بھی انتخاب کے بعد لیکن آجکل اہم اور غیر اہم کا امتیاز اٹھ گیا ہے اور ہر خط، چاہے وہ کیسا ہی ہو، بلا تامل شائع کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان خطوط کو بھی بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے جنھیں غیر اہم ہونے کی بنا پر یا کسی مصلحت کی وجہ سے خارج کر دیا گیا تھا اور جس طرح آجکل رسائل زندہ ادیبوں اور شاعروں کے نمبر نکالنے لگے ہیں، اسی طرح مکتوب نگاروں کی زندگی ہی میں ان کے خطوط شائع کر دئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مکتوبات سلیمانی کی اشاعت اختلافی مسئلہ بن گئی ــــ جہاں تک مجھے معلوم ہے رفقائے دارالمصنفین ان خطوط کی اشاعت کو مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف سمجھتے تھے، دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض معتقدوں کو یہ خیال گذرا کہ مولانا عبدالماجد ان کو شائع کر کے مولانا آزاد کی بدنامی کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ مولانائے مرحوم کے ایک پاکستانی معتقد جناب شورش کاشمیری کے ہفت روزہ اخبار چٹان (لاہور) میں ابھی حال میں

---

[1] مکتوبات سلیمانی (حصہ اول)، سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۹۸، مجلد قیمت پانچ روپے۔
ناشر: صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ۔

ایک کھلا خط شائع ہوا تھا، جس میں مکتوب نگار نے یہاں تک لکھ دیا تھا:

"فلسفۂ جذبات" کے مصنف کے دل معاند و حاسد کو پل بھر کے لئے چین نصیب نہیں، نیکیوں کو کھانے والی آگ اس کے دل میں شعلہ زن ہے، مکاتیب شائع ہو جائیں تو یہ آگ بجھ جائے گی اور دل برف کی سل بن کر ٹھنڈا پڑ جائے گا۔" چٹان (لاہور) ۲۸ اکتوبر ۶۳ء

تیسری طرف بہت سے لوگوں کو اصرار تھا کہ ان خطوط کو جا ہے ان میں کچھ ہو ایک برگزیدہ عالم دین کے رشحات قلم ہیں، ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ اس تیسری قسم میں یہ راقم الحروف بھی تھا۔ میں نے مکتوب الیہ مولانا عبدالماجد دریابادی سے زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے درخواست کی تھی کہ مولانائے مرحوم کے سبھی اہم خطوط کو شائع ہونا چاہیئے اور کم سے کم سنسر سے کام لیا جائے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب خلاف توقع، اس قدر جلد اس مجموعہ کا پہلا حصہ موصول ہوا۔ میں تمام ضروری کاموں کو چھوڑ کر اس کے مطالعہ میں لگ گیا اور اس وقت تک اس کو الگ نہیں کیا جب تک ایک ایک حرف پڑھ نہیں ڈالا۔ میرا خیال ہے کہ ان کو پڑھنے کے بعد ہر شخص اتفاق کرے گا کہ ان خطوں کی اشاعت سے علمی اور ادبی سرمایہ میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔ بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، جنھیں افسوسناک کہا جا سکتا ہے لیکن اگر دونوں بزرگ عالموں کے حالات و کوائف پر غور کیا جائے تو ان کے اسباب و وجوہ مل جائیں گے۔ فی الحال میں سید صاحب مرحوم کے خیالات کے علل و اسباب سے بحث کرنی نہیں چاہتا، اگر حالات نے اجازت دی تو انشاءاللہ اگلی اشاعت میں اس پر گفتگو کروں گا، اس وقت میں مکتوبات سلیمانی کے ان اقتباسات کو پیش کرتا ہوں، جن میں مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں اچھی یا بری رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح مولانا آزاد کے خطوط کے وہ اقتباسات بھی پیش کروں گا جن میں مرحوم نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ مولانا آزاد کے جس قدر خطوط مجھے مل سکے ان سب کو کھنگال ڈالا مگر کسی میں سید صاحب کا ذکر نہیں ملا، اس لئے یہ اقتباسات صرف ان خطوط سے نقل کر رہا ہوں، جو سید صاحب کے نام لکھے

گئے ہیں اور معارف میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا خط یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کا ہے۔ اس وقت تک سید صاحب الہلال کے ادارہ میں شامل نہیں ہوئے تھے اور الندوہ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ مولانا دریابادی نے الندوہ کے لئے مضمون بھیجا تھا، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ الندوہ بند ہونے والا ہے تو مضمون کی واپسی کا تقاضا کیا۔ اس پر سید صاحب نے ان کو لکھا:

"...چند روز ہوئے کہ آزاد صاحب نے الہلال کے لئے مضمون مانگا کیونکہ وہ آج کل سخت مصائب خانگی میں مبتلا ہیں اس لئے وہ خود کم لکھتے ہیں۔ میں نے مجموعۂ مضامین الندوہ مولانا (یعنی مولانا شبلی) کے سپرد کر دیا، لیکن ان کا قرعۂ انتخاب آپ ہی کے مضمون پر پڑا اور وہ کلکتہ روانہ ہو گیا۔"

دوسرا خط ۲۶ اکتوبر ۱۳ء کا ہے۔ اس وقت مولانا کو الہلال میں کام کرتے ہوئے پانچ چھ ماہ ہو چکے تھے۔ (مئی ۱۳ء میں سید صاحب الہلال کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے تھے) مولانا عبد الماجد صاحب سے "حظ و کرب" کے متعلق تاریخی بحث جاری تھی، مولانا دریابادی نے سید صاحب سے اس کے بارے میں ان کی ذاتی رائے معلوم کی۔ موصوف نے پہلے اس کے متعلق اپنی رائے دی اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں، سونگھنے کے نہیں۔ مولوی آزاد وہی پھول ہیں۔ افسوس کہ میں علم، سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں،... اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا.... میرا بال بال راز ہے اور افسوس ہے کہ اب زیادہ اپنے ضمیر کو مجروح نہیں کر سکتا اور اس لئے پابہ رکاب ہوں اور اس ذخیرۂ اسرار مخفی کو اس وقت تک محفوظ رکھتا ہوں جب تک اس کا وقت نہ آئے۔"

تیسرا خط ۳۱ جنوری ۱۴ء کا ہے۔ اس وقت سید صاحب الہلال سے بوجہ اختلاف الگ ہو کر پونا کالج چلے گئے تھے۔ خاصا طویل خط ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"سنا! آپ کے مولانا ابو الکلام نے مجھ کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا کہ ۱۳۰ ہم دیتے ہیں اور دس روپے ماہوار کی ترقی ۲۰۰-۲۰۰۔ تمام اسٹاف آپ کی زیر نگرانی، نام آپ کا اڈیٹری میں ظاہر رہے گا، فوراً چلے آئیے۔"

سید صاحب نے جس خط کا حوالہ دیا ہے، وہ بجنسہٖ حاشیہ میں درج کر دیا گیا ہے، اس کے کچھ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:۔

"بہرحال میں آج اپنے شورشِ قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں، لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے تو بغیر از صبر چارہ نہیں معلوم نہیں اس خط کا نتیجہ کیا نکلے، ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ بھی بدگمانیوں کی نذر نہ ہو تاہم خدائے علیم و بصیر میرے دل کو دیکھ رہا ہے کہ اس وقت ہر حرف جو لکھ رہا ہوں کس عالم میں لکھ رہا ہوں۔ خدارا یقین کیجئے کہ سچائی اور صداقت، محبت و وداد اور ایک گہرے حزن و ملال کے سوا اور کوئی چیز اس وقت میرے دماغ میں نہیں۔۔۔

آپ آکر الہلال بالکل لے لیجئے، جس طرح جی چاہے اسے ایڈیٹ کیجئے، مجھے سوا اس کے اصول و پالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں، میں بالکل آپ پر چھوڑ دیتا ہوں اور خود اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں، صرف اپنے مضامین دے دیا کروں گا، اور کچھ تعلق نہ ہوگا۔۔۔۔

سردست آپ تشریف لے آئیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں تیس کلکتہ کے مصارف اور انتظام کے لئے ہیں، اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا، یہاں تک کہ دو سو روپیہ ہو جائیں"

سید صاحب کے جس خط کا میں نے اوپر اقتباس دیا ہے، اس میں انھوں نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ مولانا آزاد بار بار مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور رنجش کے موجبات پوچھتے ہیں چنانچہ اس خط میں بھی باصرار پوچھا تھا، میں نے ایک ایک کر کے مختصراً لکھا اور رجسٹرڈ جواب بھیجا۔ لیکن اب تک آواز برنخاست" مولانا آزاد نے سید صاحب کی شکایتوں اور اعتراضوں کا تفصیل سے جواب دیا تھا جسے مولانا دریابادی نے حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔ موصوف کو مکمل خط نہیں مل سکا، مگر جس قدر ملا ہے وہ بھی بہت طویل اور کافی اہم ہے۔ اس کے ضروری حصے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں جو اب خط سے اعتراضات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

صدیقی الجلیل الاعز

میں تو جواب سے مایوس سا ہو گیا تھا، لیکن الحمدللہ کہ آپ نے جواب عنایت فرما کر احسان عظیم کیا جس وقت خط آیا، میرے گھر میں مرض قدیم کا دورہ شروع ہو گیا تھا اور اب تک ہے۔ پھر باوجود اس حالت کے

ایک ضرورت شدیدہ سے دہلی چلا گیا۔ بانکی پور ٹھہرا اور ان اسباب سے جواب میں تاخیر ہوگئی جو استغفار معافی ہوں۔"

برادر جلیل و اعز! سب سے پہلے تو میں آپ کا سچا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ حسب وعدہ اپنے تمام خیالات ظاہر کر دئے اور اس کے بعد احسان مند ہوں، اس احسان عظیم کے لئے کہ آپ کے اس اظہار خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے خط کو میں نے تین بار پڑھا اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا۔ نہ اس لئے کہ آپ نے جو کچھ لکھا وہ سب کچھ سچ تھا بلکہ اس لئے کہ اس میں سچ بھی تھا جس کے لئے میرے دل نے گواہی دی اور جو حالت ہمیشہ رہتی ہے اس کے لئے ایک تحریک قوی و مزید ہوگئی۔

آپ نے کل دس باتیں لکھی ہیں۔ ان میں کچھ تو خاص میری ذات کے متعلق ہیں۔ کچھ الہلال کی تحریر و مضامین کے متعلق اور کچھ مالی امانت و خیانت کے متعلق۔

ان میں پہلی قسم بالکل سچ ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اس احتساب حق کا اجر اور مجھے توفیق عمل دے۔
دوسری قسم کا تعلق جہاں تک ارادہ اور نیت سے ہے پورے یقین کے ساتھ انکار کرتا ہوں۔ علم اللہ کہ آغاز کار سے اس وقت تک کبھی بھی میرا خیال اس شیطنت و ابلیسی ادعا کا نہیں ہوا۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید مگر ممکن ہے کہ میری تحریروں سے ایسا خیال ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں ذمہ دار شرمندہ ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔

البتہ تیسری قسم سے الحمدللہ کہ بکلی منکر ہوں۔ آپ کو اس بارے میں وہی غلط فہمی ہوئی جس کا مجھے خیال تھا اور یہ تذکرہ آپ نے مولوی عبدالرحمٰن گیانوی سے غالباً کیا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجب طرح کی ہے۔ میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی، لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا۔ پھر میں طرح طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔ یہ حالت عرصے تک رہی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس عالم میں بھی کبھی کبھی انفعال و انابت کا قوی دورہ ہو جاتا، لیکن پھر قائم نہ رہتا۔

تقریباً پانچ برس ہوئے ہیں جبکہ بمبئی میں تھا کہ یکایک بعض حالات غم آلود ایسے پیش آئے کہ کہ میری حالت میں انقلاب عظیم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے توبہ و انابت کی توفیق دی۔ میں نے عہد واثق کیا کہ جمیع منہیات سے محترز رہوں گا اور اس کے بعد اوامر پر عمل کروں گا۔

اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ عملاً اعمال فسق و فجور ترک ہو گئے اور پھر ان کی طرف قدم نہیں اٹھا لیکن جس چیز کو دل اور جذبات کا تقویٰ کہتے ہیں وہ حاصل نہیں اور دل میں گناہ کی خواہش پیدا ہوتی رہی۔ اس کے بعد وقت گذرتا گیا اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جس قدر ایک آدمی اندر ہی اندر اپنے تئیں بدل دینے کی کوشش کر سکتا ہے میں نے کی، لیکن سچی خدا پرستی کے حاصل کرنے سے عاجز رہا۔

یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں، لیکن میرے خیال میں ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسر نہیں۔

اب میری موجودہ حالت جو کچھ ہے وہ میں آپ پر ظاہر کرتا ہوں۔ میں عملاً تو منہیات اخلاقی سے بچا ہوا ہوں، لیکن اس پر مطمئن نہیں اور دل اور خیال کا گناہ باقی ہے۔ طبیعت میں استغنا، اور ولولۂ انابت قوی ہے اور جیسا کچھ ہے اسے بیان نہیں کر سکتا اور وہی ایک شئی ہے جس پر جی رہا ہوں، لیکن استقامت حاصل نہیں ہوتی اور کوشش کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔ ...

رہی یہ بات کہ آپ لکھتے ہیں کہ تم کیوں لوگوں کو دینی پابندی کی تعلیم کرتے ہو؟ تو یہ سوال صدہا بار خود اپنے دل سے کر چکا ہوں۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہوں گا۔ اوّل تو دینی پابندی سے قصور، بمقابلہ الحاد و ترک اعمال دینیہ، حتی الامکان اعتقاد و عمل بالاسلام ہے اور اس کا تعلق جہاں تک ارکان و جوارح سے ہے، کرتا ہوں۔ دوسرے حق کا اظہار ہر مسلمان کا ویسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا اور گویا عبادت پھر اگر لوگوں سے کہتا ہوں کہ اچھے کام کریں اور حق کو حق سمجھیں تو اپنا ایک فرض ادا کرتا ہوں۔ باقی فرائض میں اگر مجھ سے قصور ہو تو اس کی وجہ سے اس فرض کو کیوں چھوڑ دوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ ایک شے البتہ مجھ میں ہے اور اس کا ہونا میرے لئے

اس درجہ یقینی ہے کہ میرا تمام غم والم اس کو دیکھ کر دور ہو جاتا ہے یعنی حق کی خدمت کرنے کا غیر متزلزل اور راسخ جذبہ اور اس کی راہ میں فنا ہو جانے کا ناقابل فنا عشق اور آج تین سال سے یہ اس طرح روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے کہ ایک منٹ اور ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی چیز اس پر غالب نہیں آئی ہے اور اس نے مجھے نہیں چھوڑا ہے۔ دنیا کی محبوب سے محبوب شے پر بھی وہ غالب ہے اور پورے وثوق اور اعتقاد کے ساتھ دعویٰ کرتا ہوں کہ کوئی شخص کیسا ہی جاں نثار حق ہو مگر انشاء اللہ میں اس سے زیادہ جاں نثار اور مستقل ثابت ہوں گا۔

نیز یہ کہ مجھے خدا پر جو اعتقاد ہے وہ بہت ہی پختہ اور راسخ ہے اور میں مذہب کی نسبت جو کچھ کہتا ہوں دل کے اصلی اور سچے جوش اور یقین سے کہتا ہوں اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو رسماً کہتے ہیں میں آپ سے کیا کہوں کہ مجھ پر کیسے کیسے وقت گزرتے ہیں اور کیسے کیسے خیالات طاری ہوتے ہیں مجھ کو یہی چیزیں روز بروز یقین دلاتی رہتی ہیں کہ خدا مجھ کو پورا تزکیہ اور کامل عمل ضرور عطا فرمائے گا۔ نیز یہ کہ مجھے ضائع نہ ہونے دے گا اور مجھ سے کام لے گا۔

میں متقی اور کامل الاعمال آدمی نہیں ہوں مگر کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ کیا اس بات کو کہنا چھوڑ دوں جس کو اچھا سمجھتا ہوں؟ اور پھر باوجود اس کے اپنے دلی جوش کو کیسے دباؤں جو خدا جانتا ہے کہ بڑا ہی قوی اور مجھے مبہوت ولا یعقل کر دینے والا ہے۔

میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا اور اپنے یقین کے خلاف یقین دلانا نہیں چاہتا۔ میرا حال ایسا ہی ہو رہا ہے میں کیا عرض کروں، کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔

میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوئی بیان آج تک نہیں کیا ہے، مذہب و راست بازی خدا پرستی و حق و حریت کے متعلق جس کے لئے ایک اصلی جوش اور دل کا ولولہ میرے اندر موجود نہ ہو۔ و لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

ہاں حال میں ایک شخص کا خط آیا ہے جو حجاز کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے۔ میں نے جی میں کہا کہ یہ تو سچ نہیں ہے معلوم نہیں آپ کی نسبت ان کا بیان سچ

ہے یا غلط؟ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے میں نے سبھی طرح کی کاریاں کی ہیں لیکن الحمدللہ نہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔

الہلال کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "دعویٰ الہام و امامت و خود پرستی و تشخص و تحقیر اناس و ادعاء و تبختر وغیرہ وغیرہ"

میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کہاں کہاں کیا ہے۔ اگر دعویٰ الہام سے مقصود وہ مضامین ہیں جن میں ایک مخصوص طرزِ تحریر سے خدا پرستی و خدا رحق کی تعلیم ہے تو تعجب ہے کہ آپ ایسا سمجھیں مگر اس کے معنی ادعاء الہام کے ہیں تو اس طرز کے چند مضامین آپ نے بھی لکھے ہیں جو از سرتا آخر انجیل کی زبان میں ہیں۔ تحقیر اناس سے گر مقصود بعض خاص اشخاص کی تذلیل ہے تو اس سے آپ بھی متفق ہیں یعنی ان لوگوں کو جو قوم کو ضرر پہنچاتے اور آزادی کو روکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کسی کی تحقیر کی ہے تو آپ ذرا کھول کر مجھے یاد دلایئے۔ واللہ باللہ میں سچے دل سے توبہ کروں گا اور اس سے بچوں گا۔

آپ نے لکھا ہے کہ تم "میں" لکھتے ہو اور اس سے استدلال کیا ہے، لیکن میں نے بہت غور کیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو "میں" اور "ہم" دونوں لکھتا ہوں۔ بعض موقعوں پر "ہم" تحریر میں اچھا نہیں معلوم ہوتا، بربنائے انشاء و حسنِ بیان۔ دلیل اس کے لئے نہیں دی جا سکتی تاہم اب چھوڑ دوں گا اور کیا کروں۔۔۔

حزب اللہ کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود صرف اپنی پرستش کرانی ہے تو اس کے جواب میں بھی اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ اگر ایسا چاہتا ہوں اور یہی میرا مقصود ہو تو اللہ اور اس کے ملائکہ کی مجھ پر لعنت۔ تعجب ہے کہ آپ کا ایسا خیال ہے۔ ۔ ۔ خدا کے لئے تھوڑی سی زحمت اور گوارا کیجئے اور مجھے حوالہ دے کر اور مثالوں کے ساتھ بتلایئے کہ بلاوجہ آپ کوئی بات نہیں کہہ سکتے، ضرور اس کے اسباب ہیں۔

ایک دفعہ آپ نے چندہ کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی واقعہ ہے جو میں سمجھا تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سامنے نوٹ پڑتے دیکھا ہے۔ میں اس غلط فہمی پر بہت متاسف ہوا۔ نیز معاف کیجئے کہ سوءِ اتفاق پر مبنا تھی۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ انجمن مسجد کانپور کلکتہ کے جو جلسے ہوتے تھے، اس کے ایک جلسے کا تمام روپیہ جو چار سو کچھ تھا میرے یہاں آگیا اور مسٹر قطب الدین نے انجمن کے پاس رہتا تھا، صندوق یہاں رکھ دیا۔ اسی شام

میں ٹون ہال کا جلسہ ہوا اور روپیہ کی ضرورت ہوئی، اس میں سے کر روپیہ خرچ کیا، پھر ایک دن منشی عبدالجبار نے تنخواہ کے لئے روپیہ مانگا، روپیہ پاس نہ تھا اور بنک کا وقت گزر گیا تھا، نیز دوسرے دن تعطیل تھا۔ انھوں نے کہا کہ روپیہ موجود ہے، اس میں سے لے لیں، پرسوں آپ شامل کر دیجئے گا۔ یہ میں نے ضرور کیا کہ منظور کر لیا اور مسٹر قطب الدین کو بلوا کر یا کنجی لے کر روپیہ لے لیا۔ اس کی تعداد ایک سو اسی تھی، جو تنخواہ میں کم ہوتے تھے۔ چندہ متفرق پیسوں، دونیوں، چونیوں میں تھا، اس کے ایک ہفتہ کے بعد ایک سو روپیہ کی پھر اس طرح ضرورت ہوئی اور تین بج چکے تھے، بنک سے آ نہیں سکتا تھا، تحویل خالی تھا، میں نے کہا کہ جس قدر روپیہ باقی ہے، سب نکال کر گن لو اور لے لو، بیشتر کا بھی روپیہ ہے، میں مسٹر رسول (خزانچی) کو چک مجموعی رقم کا بھیج دوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد حساب کیا گیا، ٹون ہال کے بعض ضروری مصارف کمیٹی نے منظور کئے اور میں نے تین سو لے روپیہ کا چک مسٹر رسول کو بھیج دیا۔ یہی نوٹ ہے جو جناب نے دیکھی اور اس کے بعد مولوی عبدالرحمٰن نے اس کا تذکرہ کیا، میں سمجھتا تھا کہ آپ بھی لکھیں گے کاش آپ نہیں اس کا ذکر فرماتے، لیکن آپ بالکل خاموش رہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بھی شان امانت کے خلاف ہے، اگر میں نے ضرور کیا اور ایک مرتبہ اور بھی کر چکا ہوں، لیکن اس مرتبہ پانچویں روز واپس کر دیا۔ اور اس مرتبہ دوسرے ہی دن الگ کر دیا اور ہفتے کے بعد بھیج دیا۔ پہلی مرتبہ بھی ایک سو اسی روپیہ مجبوراً چندے سے لے کر دئے تھے، جو پانچویں دن واپس کر دئے۔ اسی بنا پر آپ نے لکھا ہے اور شک کیا ہے کہ چندوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ بیشک آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں ایسا حرام خور اور اخبث ہو گیا ہوں، لیکن پھر تسکین ہوئی کہ یہ بھی آپ اپنی ایمانی قوت اور راست بازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دیا ہے اور سوائے چھ سو یا قریب چھ سو کی آخری قسطوں کے جو مہاجرین کے لئے آئی تھیں، اور نہیں گئیں۔ کیونکہ ایک سو پاؤنڈ کے انتظار میں رہا اور الحمدللہ کہ ایک پائی بھی میں نے اپنے علم میں ضائع نہیں کی اور یہ روپیہ بھی اب پرسوں چلا جائے گا، کیونکہ ڈاکٹر انصاری کو ایک شخص نے پچاس پونڈ دئے ہیں اور دونوں شامل چلے جائیں گے.....

آپ کا وقت بہت ضائع ہوا۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے نہیں کی کہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کو اور مجبور کرنا چاہتا ہوں، کہ آپ آیئے، اللہ کی مرضی ہماری خواہشوں سے بہتر ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ

میں آپ سے محبت رکھتا ہوں آپ کو نیک اور مخلص آدمی یقین کرتا ہوں اسی لئے آپ کے خط نے مجھے بہت متاثر کیا اور جتنا حصہ اس کا سمجھ سکا اور مطابق پایا، اس سے مجھے بہت نفع ہوا بیں ان تفصیلات کا لکھ دینا بہتر ہے۔

آپ مجھے نہ بھولئے اور بھلانے کی کوشش نہ کیجئے اور میرے لئے دعا کیجئے، صرف یہی دعا جو میں مانگتا ہوں، یعنی خدا تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے اور میری عاجزیوں اور فتنوں کو قبول کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو میں گمراہ ہو کر گمراہ کرنا چاہتا ہوں تو وہ مجھے دنیا سے اٹھا لے۔ . . .

مولانا آزاد کا مذکورہ بالا خط بہت ہی صاف اور واضح ہے اور ایک ایک حرف سے خلوص اور صداقت نمایاں ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی غلط فہمی اس سے بھی دور نہیں ہوئی، چنانچہ طنز و تعریض کا سلسلہ اگلے خطوط میں بھی جاری ہے، مگر کم اور ہلکا۔ اس خط کے کوئی ایک سال بعد، ۲۶ جنوری ۱۵ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی آزاد کا خط آیا ہے اپنی کیسا ایمان ظاہر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دار المصنفین کی ایک اسکیم تیار کرلی ہے۔ ضرورت ہے کہ دار المصنفین کو علی گڑھ اور الہلال دونوں سے بچایا جائے۔ علی گڑھ میں جو چیز ہوگی آفتاب احمد خان و اشا لہم کے نتیجہ میں ہوگی۔ الہلال کا کام تخیل سے عمل میں کبھی نہ آئیگا (ص ۱۳۷)

یہاں مولانا عبد الماجد صاحب حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ "مولانا ابو الکلام سے تعلقات میں تلخی اب تک باقی ہے"۔ لیکن اس تحریر کے نصف ماہ کے اندر ہی سید صاحب دار المصنفین کے بارے میں چند اکابر سے گفتگو کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان میں مولانا آزاد بھی شامل ہیں۔ ۹ فروری ۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: "دار المصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین، عماد الملک اور مولوی حبیب الرحمن خاں اور مولوی ابو الکلام سے گفتگو کر رہا ہوں۔ مولوی عبد الحق کو بھی خط لکھا ہے"۔ (صفحہ ۳۸)۔

مزید تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہ انیس سال کے بعد سید صاحب۔ الہلال اور البلاغ کے متعلق بڑی شاندار رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں کی قرآن پاک کا ذوق مولانا ابو الکلام کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا اور حسن اسلوب بلاغت، کمال انشاپردازی اور زور تحریک کے ساتھ انھوں نے انگریزی

عوام و خواص کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا، اس سے ان کے لئے بیان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔"

(معارف، اکتوبر ۳۳ء)

بعد کے خطوط میں مولانا آزاد کا اگر کہیں ذکر آیا ہے تو عام طور پر سرسری طور پر تھی اگر کہیں ہے تو بہت خفیف۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"البلاغ دیکھا ہوگا، اب تو پہلے سے بھی رنگ زیادہ شوخ ہوگیا ہے۔ علامہ مرحوم کے بعد مشرقی علوم میں اب وہ کس کا تذکرہ کرتے ہیں۔"

(۱۷ر نومبر ۱۹۱۵ء صفحہ ۴۵)

"لطیفہ سنئے، ایک صاحب "صحائف ابوالکلام" کی ترتیب کی خدمت سپرد کرتے ہیں کہ علاوہ فوائد مالی دارالمصنفین کی شہرت بھی ہے۔"

(۶ر ستمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۹)

مولانا دریا بادی نے اس ٹکڑے پر نوٹ لکھا ہے کہ "سید صاحب کے اس وقت کے تعلقات کی جو نوعیت مولانا ابوالکلام کے ساتھ تھی، اس کے لحاظ سے یہ فرمائش ایک عجیب ستم ظریفی تھی۔"

پھر مولوی ابوالکلام صاحب نے تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے بھی اس طرز کا رسالہ (مراد قرآنی بسوق نبوی) لکھا ہے، شاید عالم مثال میں زیر طبع ہو۔"

(۲۰ر مارچ ۲۰ء صفحہ ۲۱۱)

مولانا عبدالماجد صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "خود سید صاحب بھی اخیر زمانہ میں مولانا کی طرف سے بڑی حد تک صاف ہو گئے تھے، بلکہ درمیان میں تو ایک دور خاص لطف و محبت کا بھی آگیا تھا۔"
(ص ۹)

مگر حصہ اول کے خطوط سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کل خطوط کی تعداد ۳۶۲ ہے اور آخری خط ۱۹۵۳ء کا ہے۔ لیکن پہلے حصے میں صرف ۱۳۰ خط ہیں اور آخری خط ۴ر فروری ۱۹۳۲ء کا ہے، گویا اکیس سال کے ۲۳۲ خطوط ابھی شائع ہونے کو باقی ہیں، غالباً ان خطوط کی اشاعت کے بعد صحیح صورت حال معلوم ہوگی۔

اب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط کے جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو لکھے گئے تھے، ایسے اقتباسات پیش کئے جاتے، جن سے سید صاحب کے متعلق ان کے صحیح خیالات کا اظہار ہوتا ہے ان اقتباسات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے دل میں سید صاحب کی بڑی عزت اور وقعت

ہے اور ان کا خلوص شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

"بہرحال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق و ہم عنان یقین کیجئے اور ہر دم خدمت گذاری کے لئے تیار۔ افسوس ہے کہ ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ کاش اللہ بک جائی کا سامان کرتا۔ تو نیں مجتمع نہیں ہوتیں بلکہ تفرق و عدم توجہ نے ان نتائج سے بھی محروم کر دیا ہے جو بااین ہمہ بے سروسامانی حاصل ہو سکتے تھے۔

دار المصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوہ کا حقیقی بدل بل نعم البدل اصلی کام وہی ہے باقی سب کے سب فروعی ہیں۔ آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ آدمی پیدا ہوں۔"

(معارف، اکتوبر ۱۹۵۳ء)

"دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے، اگر اس میں کوئی جگہ قلی کی ہو جب بھی میں منظور کر لوں، بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص۔"

(معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۳۱۱)

"قلی" کے لفظ پر معارف کی طرف سے حسب ذیل نوٹ ہے :

"یہ خط مولانا کی عظمت اور علم دوستی کی بہت بڑی دلیل ہے، اس لئے اس کو بجنسہ شائع کر دیا گیا۔"

صدیقی العزیز، السلام علیکم

معافی کا خواہاں ہوں جواب میں بہت تاخیر ہوئی لیکن بلا عذر نہ تھی۔ مولوی مسعود علی صاحب نے ازراہ عنایت سیرۃ وغیرہ بھیج دیا جن کے لئے شکر گزار ہوں۔ دار المصنفین سے تحائف تو ہمیشہ پہنچتے ہیں لیکن کبھی کوئی بل نہیں آیا، آخر آپ نے کوئی سالانہ ماہوار فیس تو رکھی ہوگی۔

جلسے کے موقع پر ملاقات کی امید تھی مگر پوری نہ ہوئی۔ الایام دول کہا گیا، آپ کے ہموم و غموم[۵۹] کا حال پڑھ کر بہت افسوس ہوا مجھے یہ تفصیل معلوم نہ تھی، لیکن آپ کی شاعرانہ مایوسیوں سے متفق نہیں ہوں۔ اوائل حوادث میں ایسے ہی احساسات ہوتے ہیں، لیکن خان ما تحذرین قد وقع کے بعد خود بخود طبیعت سکون پذیر ہو جاتی ہے۔ آپ نے لکھا کہ معنوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، مگر بقول آپ کے معنوی زندگی

---

۵۹ غالباً یہ غم دوسری اہلیہ کے انتقال پر تھا۔ مولانا دریابادی کو سید صاحب نے لکھا ہے کہ "مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اپنی بیوی سے اس درجہ محبت ہے۔" (مکتوبات سلیمانی صفحہ ۲۸)

کے لئے مادی سروسامان و محرکات ناگزیر ہیں اور نیز بقول آپ کے چاک دامنی کے لئے ایام گل کا اشارہ تو بیتابیؔ خود ہی، طبیعت اس کا انتظام کرے گی، آپ گھبرائیں نہیں۔ . . .

معارف کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی تو ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو صرف خدمتِ علم و تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہے"۔ (معارف اکتوبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳)

آپ کے دلچسپ خط نے پوری ملاقات کا لطف دیا، آپ کو اس قدر جلد اعظم گڈھ کے گوشۂ عافیت سے برداشتہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے، ساری باتیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ جہاں دلچسپیوں کی شورش ہے، وہاں امن و جمعیت خاطر کہاں . . .

آپ نے دار المصنفین کی موجودہ مالی حیثیت کا ذکر کیا، نہایت درجہ خوشی ہوئی۔ یہ سب آپ کے قیام و سعی کا نتیجہ ہے۔ بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کے آخر حیات کی امیدیں بار آور ہوئیں لیکن یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ وہاں کے قیام سے اکتا گئے ہیں۔ اگر آپ نے وہاں رہنا چھوڑ دیا تو پھر سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا ایسا انتظام کیجئے کہ "سہ ماہ می خور و نہ ماہ پارسا می باش" کی اسکیم پر عمل درآمد ہو سکے، مستقل قیام وہاں رکھئے۔ عارضی ہر جگہ۔ (معارف اکتوبر ۵۳ء، صفحہ ۳۱۴، ۳۱۵)۔

مدت ہوئی جب آپ کلکتہ میں تھے اور ایسے ہی ایک اطلاع ملی تھی، شب کو میں نے اپنے کمرے میں آپ کو بلایا تھا اور آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا، خدارا اس کو سامنے لائیے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اسے وقعت دیجئے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اسی وقت اپنے کاموں میں کوئی تبدیلی کیجئے، البتہ اگر اس کا آپ بذریعہ تحریر مجھ سے وعدہ کریں کہ جب وقت آئے گا تو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک کام کے ہو رہیں گے تو میں بڑی ہی تسکین پاؤں اور اطمینان کے ساتھ آنے والی حالت کو قبول کر لوں، وہ تسکین جو بد بختی سے اور کسی کے پاس نہیں۔

آپ مجھ سے بلا تاخیر بذریعہ تحریر وعدہ کریں کہ اگر میری نسبت آپ کو کوئی نئی خبر ملے تو آپ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ آپ فوراً کلکتہ آئیں اور البلاغ کو جو نکل چکا ہے (اور انشاء اللہ محفوظ ہے) اپنے ہاتھ میں

میں نے ہیں اور ایک خالص دینی و اصلاحی رسالے کی شکل میں مع اس کے خصائص کے اس کو جاری رکھیں۔ کسی پرخطر راہ کے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، نہ جنگ پیرائے زنی کی ضرورت ہے، صرف قرآن و سنت کے معارف و دعوت کو بانداز اصول البلاغ مخصوص جاری رکھنا چاہیے اور جب تک اس طرح کیا جائے گا اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

یہاں تمام لوگ آپ کے استقبال کے لئے منتظر ملیں گے اور وہ آپ کا اسی طرح ساتھ دیں گے جس طرح میرا دیتے ہیں اور اسی طرح حکم مانیں گے اور ماتحت رہیں گے جیسے میرے رہتے ہیں۔ ...

البلاغ کے علاوہ بالکل علیحدہ ایک معتدل مسلک کا روزنامہ اخبار اقدام بھی جاری ہوا ہے، وہ بھی آپ کے ماتحت ہو جائے گا اور ایک بڑا اسٹاف اپنے ماتحت آپ پائیں گے۔

امید ہے کہ دار المصنفین وغیرہ اس میں مانع نہ ہوں گے، کیونکہ اس کو تو ہر حال میں قائم رکھ سکتے ہیں۔ (معارف نومبر ۵۳ء صفحات ۳۸۲ تا ۳۸۴)

صدیقی العزیز
آپ کا خط ینزل الغیث من بعد ما قنطوا[1] کا مصداق تھا۔

کلکتہ۔ ۲۵ راگست

اخ الاعز ۱۰ الا جل،   انعم اللہ علی بلقائکم والسلام علیکم

والا نامہ پہنچا، مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آپ پونہ سے چلے نہ گئے ہوں۔ یہ آپ نے کیونکر کہا کہ میں آپ کو بھول جاتا ہوں۔ غالباً تواتر و تسلسل مراسلات علائق قلبیہ کے لئے شرط نہیں ہیں۔ آپ یقین کریں کہ موجودہ عہد کے جہل عام اور فساد محیط میں اتحاد مشرب و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا ...

بہرحال کسی طرح کام کو جاری رکھا۔ یہ کام دراصل یوں تھے کہ باہم یکجائی ہوتی اور دیر دیر تک صحبتیں اس بارے میں کی جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تو جس حال میں جو کچھ ہو جائے اور توفیق مساعد ہو اسی پر شکر کرنا چاہیئے۔ ...

---

[1] ناامیدی کے بعد باران رحمت کا نزول۔

اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے، گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں۔

(معارف نومبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱)

اخ الجلیل الاعز، انعم اللہ علیٰ ملقاتک

خط پہنچا، ایسی حالت میں کہ آپ کے عدم تعین مکان و عالم اطلاق مقام سے سخت پریشان تھا اور حیران تھا کہ کیونکر خط و کتابت کروں۔

...[۱] ایسی حالت میں بہت سوچتا ہوں لیکن آپ کے سوا کسی کو نہیں پاتا جس سے امید رکھوں۔

ابوالحسنات کو لکھا، معلوم ہوا وطن میں ہیں۔ .. اگر آپ کو قیام رانچی میں میری کوتاہیاں محسوس نہ ہوئیں تو اس سے ان کا عدم نہیں، بلکہ آپ کی محبت کا استغراق ثابت ہوتا ہے اس نے دل کی ندامت و اعتراف کو اور زیادہ کر دیا۔

(معارف نومبر ۵۳ء ص ۳۸۸)

آپ نے ترجمان القرآن جلد دوم کی اشاعت کے لئے جو امداد کی ظاہر کی ہے، یقین کیجئے اس سے میرا دل نہایت درجہ متاثر ہوا۔ یہ محبت و اخلاص کا بڑا سے بڑا ثبوت ہے، جس کا میں آپ سے متوقع ہو سکتا تھا۔ فعلاً یہ بات ظہور میں آسکے یا نہ آسکے لیکن میرے دل پر آپ کی محبت کا نقش ثبت ہو گیا۔

جی چاہتا تھا آپ سے ملاقات ہو، دیکھئے اب کب ہوتی ہے

"جناب کی نئی غزلیں شائع ہوئیں صرف خبر سنی، آج کل کوئی پرچہ نہیں منگواتا" (معارف دسمبر ۵۳ء ص ۴۵۹)

صدیقی العزیز،

ترجمان القرآن کی پہلی جلد کسی نہ کسی طرح چھپ کر نکل گئی، آپ کو اس لئے نہیں بھیجی گئی کہ خیال تھا

---

[۱] اس سے پہلے کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میری فرصت موجودہ اب قریب الاختتام ہے اور مشیت الٰہی جس طرح مہلت دے کر کام کرانا چاہتی تھی، اسی طرح آخری ابتلا کو بھیج کر کوئی عظیم الشان مقصد پورا کرانا چاہتی ہے۔ آثار گو یہ ہیں اور علائم قطعی اخبار مؤلف اور اطلاعات معتمد تاہم سب کچھ اس کے ہاتھوں میں ہے اور میں نے اس دو درجات میں بڑے بڑے کر کے دیکھے ہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل ٹھیک کیا ہوگا اور وہی ہو جو اس کی مرضی ہے۔

کلکتہ سے مجلد نسخے آجائیں تو بھجواؤں، لیکن آج ایک تار سے معلوم ہوا کہ دو ہفتہ کی مزید دیر ہوگی ادھر پولیٹیکل حالات نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ نہیں کہا جاسکتا کتنے دنوں بلکہ گھنٹوں تک جیل سے باہر رہ سکوں گا اس لئے طبیعت نے تقاضا کیا کہ غیر مجلد ہی بھجوا دوں۔

(دہلی دریا گنج مورخہ ۷ $\frac{۱}{۳۲}$ ۶ء معارف جنوری ۱۹۶۵ء ص ۷۱)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے ۳۸ خطوط معارف میں شائع ہوئے ہیں۔ فاضل مدیر معارف نے لکھا ہے۔ "بعض اور خطوط بھی علمی و ادبی حیثیت سے اہم اور قابل اشاعت تھے مگر وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئے ہیں کہ پڑھے نہیں جا سکتے۔" مولانا دریا بادی نے زیر نظر کتاب مکتوبات سلیمانی میں مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ خط شائع کیا ہے ممکن ہے کہ ایسے اہم خط کچھ اور ہوں جو مصلحتاً شائع نہ کئے گئے ہوں۔

بہرحال اوپر میں نے جو اقتباسات پیش کئے ہیں وہ معارف کے انہی ۳۸ خطوط سے ہیں ان سے نہ صرف مولانا آزاد کے خلوص، محبت اور تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے، جو سید صاحب سے ان کو تھا۔ بلکہ ان کی غیر معمولی شرافت، طبیعت کی بلندی اور شخصیت کی عظمت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کی ریڈیو کی تقریر ۳۰ نومبر کے صدق جدید میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مولانا نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "نظریاتی اختلاف کیا دینی اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا، وہ ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخالفت میں تبدیل ہونے دیا۔" یہ اس شخص کا حال تھا جو مولانا دریا بادی کے الفاظ میں "اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حسِ دینی پر پڑی تو چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر اب سماں ہی دوسرا ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، دلائل کی خطابت کی آگ برس رہی ہے اور زبان ہے کہ اب پھر صدا لگائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

ایک مختصر بزمِ مشاعرہ

جامعہ کے تعلیمی میلے کے موقع پر امسال دہلی میں ایک وسیع پیمانہ پر یوم ظفر منایا جارہا تھا جس کے پروگرام میں ایک کل ہند مشاعرہ بھی شامل تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میلے کے پروگرام میں اس مرتبہ مشاعرہ کا بھی اضافہ کرلیا گیا تھا۔ چنانچہ حسب پروگرام ۸ر نومبر کو سہ پہر میں بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیے اور جناب غلام ربانی تاباںؔ صاحب نے اسٹیج سکریٹری کے، جناب تاباںؔ نے سب سے پہلے اپنی غزل پیش کی، جو حسب ذیل ہے:

پریشاں ہو گئے ہم صورت گرد سفر آخر
کہاں تک ساتھ دیوانوں کا دیتی رہ گزر آخر
تپش نشو و نما کی اہل دل کو سازگار آئی
کہ ہر موج چمن بنتی گئی موج شرر آخر
تری محفل کی خاطر ربط ہر محفل سے توڑا تھا
یہاں سے اٹھکے اب جائیں تو ہم جائیں کدھر آخر
ہجوم درد اتنا ہے کہ تمکین وفا گم ہے
کہاں تک دل کو بہلائے گی امید اثر آخر
تمہارے نام دل ہر آرزو منسوب کرتا ہے
کہانی بن گئی بس اک نگاہ مختصر آخر
ابھی چشم تمنا محو نظارہ ہی لیکن
تماشا خود سکھا لیتا ہے آداب نظر آخر

جفائے دوست آئی اور سرگرم تپاک آئی
غم پنہاں اگر ہونے لگا صرف اثر آخر
وہی دل ہے، وہی ہیں آرزوئے دل کے ہنگامے کہاں سے لائیں تاباںؔ فرصت عرض ہنر آخر

اس کے بعد حسب ذیل شعراء نے اپنا کلام پیش کیا :-

حضرت جمیل مظہری

گر شمے راہ میں ہیں اپنی منزل تک نہیں آئے — میری آنکھوں تک آئے ہیں میرے دل تک نہیں آئے
جمیلؔ ایک عمر سے دریا کی لہریں گن رہے ہو تم — گنا ہے ان سفینوں کو جو ساحل تک نہیں آئے

حضرت رَوش صدیقی

حضرت رَوش نے میر تقی میر پر نظم پیش کی :

آپ اپنا نقاب اٹھائے ہوئے — خلوت دل کو جگمگائے ہوئے
مرگ ہستی کے وہم سے آزاد — پیرہن کو کفن بنائے ہوئے
غیریت کے خیال سے بیزار — نقش دیر و حرم مٹائے ہوئے
اپنی مجبوریوں کے پردے میں — اختیار بشر چھپائے ہوئے
ماہ و انجم تراشنے کے لئے — اک بجھا سا دیا جلائے ہوئے
محو نظارۂ جمال ازل — عشق کو آئینہ بنائے ہوئے
قشقہ آلودہ، لوح پیشانی — صبح ایماں کو جگمگائے ہوئے
وحدت حسن و عشق پر نازاں — اک صنم کو خدا بنائے ہوئے
وحشت دل، ادب شناس وفا — اپنے دامن میں منہ چھپائے ہوئے
اک غزال رمیدہ خو کے لئے — زندگی کو غزل بنائے ہوئے
خاکساری غرور آمادہ — سربلندی نظر جھکائے ہوئے
بازدادِ نگاہ حسن طلب — درد ہی کو سکوں بنائے ہوئے

ہمتِ دوشِ ناتواں لے کر — بارِ انسانیت اُٹھائے ہوئے
وادیٔ دل سے اک کلیم اٹھا — میرؔ سا شاعرِ عظیم اٹھا

حضرت پرویز شاہدی

جوشِ تصور سے کیا ہوگا چشمِ تماشا ساتھ چلے
وقت کے جلوے گرمِ سفر ہیں دیکھنے والا ساتھ چلے
راست روی کے معنی سمجھے اتنا ہی یارانِ سفر
اس کو رہبر مان لیا جو آڑا ترچھا ساتھ چلے

حضرت سکندر علی وجدؔ

خوشی یاد آئی نہ غم یاد آئے — محبت کے نازو نعم یاد آئے
یہ کیوں دم بہ دم ہچکیاں آ رہی ہیں — بھلایا کسی نے کہ ہم یاد آئے
گلوں کی روش دیکھ کر گلستاں میں — شہیدوں کے نقشِ قدم یاد آئے
سرِ شام رہبر کی تقریر سن کر — تری زلف کے پیچ و خم یاد آئے
بڑوں کا بہت نام جپتی ہے دنیا — جو اچھے زیادہ تھے کم یاد آئے
دمِ نزع جونہی اجل مسکرائی — اچانک تمہارے کرم یاد آئے
مصیبت میں بھی بار ہا وجدؔ مجھ کو — خدا جانتا ہے صنم یاد آئے

حضرت نشورؔ واحدی

وقت کا قافلہ آتا ہے گزر جاتا ہے — آدمی اپنی ہی منزل میں ٹھہر جاتا ہے
ایک بگڑی ہوئی قسمت پہ نہ ہنسنا اے دوست — جانے کس وقت یہ انسان سنور جاتا ہے
اُس طرف عیش کی شمعیں تو اِدھر دل کے چراغ — دیکھنا یہ ہے کہ پروانہ کدھر جاتا ہے
جام و صہبا کی مجھے فکر نہیں اے غمِ دل — میرا پیمانہ تو اشکوں ہی سے بھر جاتا ہے
ایک رشتہ بھی محبت کا اگر ٹوٹ گیا — دیکھتے دیکھتے شیرازہ بکھر جاتا ہے

[illegible] وقت عشق میں تبدیل ہوا ہے اکثر — شعلۂ جام بھی سینے میں اتر جاتا ہے
حال میرے لیے ہے لمحۂ آئندہ نشور — وقت شاعر کے لیے پہلے گزر جاتا ہے

نعیم

[illegible] موج ہوا چلتی تھی — قریۂ جاں میں یا محبت کی ہوا چلتی تھی
[illegible] — جذبۂ عشق کے ہمراہ انا چلتی تھی
دل [illegible] یاد رہا کرتی [illegible] — کل وہی یاد بہ انداز [illegible] چلتی تھی
میں ہی تنہا نہ خرابوں سے گزرتا تھا نعیم — شام تا صبح ستاروں [illegible]

جناب شہاب جعفری

درد بن بن کے رہیں ہم بھی تمہارے دل میں — ہائے کیا کیا ہیں ابھی ارمان ہمارے دل میں
کوئی ایسا بھی نہیں جس پہ گماں ہو تیرا — تیری صورت کے کئی عکس اتارے دل میں
گھر کی رونق ہے یہی کشمکشِ یاس و امید — ایک ہنگامہ سا رہتا ہے ہمارے دل میں
کس غضب کا ہے اندھیرا شبِ تنہائی کا — ٹوٹتے ہیں مری یادوں کے ستارے دل میں
مدتوں سے نہیں دیکھی شبِ مہ کی صورت — دن کے ہنگامے ابھی تک ہیں ہمارے دل میں
یونہی آنکھوں میں کٹیں ہجر کی لمبی راتیں — تجھ سے روٹھے ترے گیسو بھی سنوارے دل میں
رات بیتی تری یادیں بھی دیے یا نہ جلیں — ایک اک کر کے اتر آئے ستارے دل میں
بڑی مشکل سے ابھی آنکھ لگی ہے غم کی — شوقِ رسوا سے کہو اب نہ پکارے دل میں

جلنے کیا بات ہے روشن ہے شبِ ہجر شہاب
اتنی رونق تو نہ ہوتی تھی ہمارے دل میں

کوائف جامعہ

جلسۂ میلاد النبیؐ

۱۰ / مئی
جامعہ میں ہر سال میلاد النبیؐ کا جلسہ بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ ... شائع کی جا رہی ہے،
کی سیرت یا ان کی تعلیمات کے کسی پہلو پر مضامین لیا تھا اور غزل پر مکتبہ جامعہ نے غزل کے سمپوزیم
... کی اشاعت میں شائع کی جا رہی ہیں۔

... کی مسند نشینی

۲۱ / نومبر کو انجمن اتحاد کی مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ ملک جاوید ... صاحب مجیب الرحمٰن ناظم ...
صغیر احمد انصاری ایڈیٹر نے اپنے عہدے سنبھالے۔ امیر جامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بھی شرکت فرمائی، ...
پروفیسر محمد مجیب صاحب نے طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے جامعہ کی امتیازی خصوصیات کو یاد دلایا اور امیر جامعہ کی
تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔
